قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2015، قیمت -/15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

69 واں یوم آزادی

عصمت چغتائی: فکروفن

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ◆ کامکس کہانی ◆ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ◆ اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

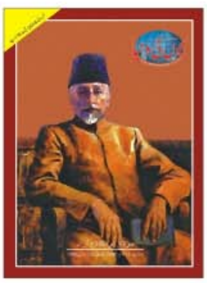

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ: 08 اگست 2015

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر و طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے
Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

تعارف
کونسل کے نئے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم — ادارہ 8

انٹرویو
لکھنا سب سے بڑا روحانی اعزاز ہے: انل ٹھکر — غضنفر اقبال 9

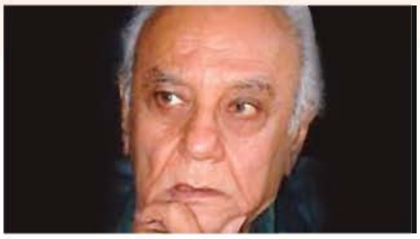

یوم آزادی
ہندوستان کی آزادی اور اردو نظم — بلال احمد میر 13

گوشہ عصمت چغتائی
زندگی نامہ: عصمت چغتائی — جمیل اختر 18
عصمت چغتائی کی 'دل کی دنیا' — ذکیہ مشہدی 24
عصمت آپا کا سفر بہرائچ: ایک بازیافت — صبیحہ انور 27
عصمت چغتائی کا پہلا رومانی ناول: ضدّی — صالحہ زرین 31
عصمت کی تحریروں میں مسائل نسواں — حامد رضا صدیقی 33
عصمت چغتائی کے موضوعات — محمد شمس الدین 36
عصمت کے نسوانی کردار — رضوان بن علاء الدین 38
عصمت چغتائی کی انفرادیت — نوشین عثمانی 40
یا اللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے؟ — عصمت چغتائی 42
زہر کا پیالہ — عصمت چغتائی 44

زبان و تعلیم
اصناف سخن: سرسری مطالعہ — رؤف صادق 48

ادبی مباحث
اردو نظم میں مغربی اصناف سخن اور شعری ہیئتیں — حنیف کیفی 50
پریم چند کی مکتوب نگاری — صغیر افراہیم 53
مزاحمت کی تعبیر و تفہیم — رضوانہ ارم 57

اردو ادب کوئز
اردو زبان و ادب (ناولوں کے کردار) — فیاض عالم 60

تہذیب و ثقافت
ہفت تماشا اور انیسویں صدی کا ہندوستان — مہتاب جہاں 62

فلم
آزادی کی تحریک اور ہندوستانی سنیما — انیس امروہوی 65

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 69

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 82

ہماری بات

مختلف زبانوں کی ادبی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ادبی رجحانات اور ادبی تحریکیں، سمندر میں اٹھنے والے مدوجزر کی طرح ہوتی ہیں۔ ہر مدوجزر اپنے پیچھے بہت سی کام کی چیزیں ساحل پر چھوڑ جاتا ہے اور ساحل پر پڑی ہوئی بے کار چیزوں کو اپنے ساتھ بہا کر گہرائیوں میں دفن کر دیتا ہے۔ اسی طرح ادب کا معاملہ ہے۔ ہر فکری و تخلیقی تحریک ادب پر اپنا اثر ڈالتی ہے جس کا مثبت و کارآمد حصہ ادب میں جذب ہو کر انسانی شعور کا حصہ بن جاتا ہے اور منفی و بے مصرف حصہ تاریخ اور وقت کے کوڑے دان میں پڑا رہ جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا دور اردو ادب کے لیے ایک عظیم الشان دور تھا جو اپنے پیچھے تخلیقی سطح پر بہت سے گوہرِ آب دار چھوڑ گیا۔ یہ چمک دار ہیرے موتی، آج ایک طویل وقفہ گزر جانے کے بعد بھی اردو کے ادبی آفاق پر چاند ستاروں کی صورت روشن ہیں۔ عصمت چغتائی بھی ایک ایسا ہی چاند ہیں، جو آج بھی اردو فکشن کے گلیاروں اور دریچوں میں اپنی روشنی بکھیر رہا ہے۔

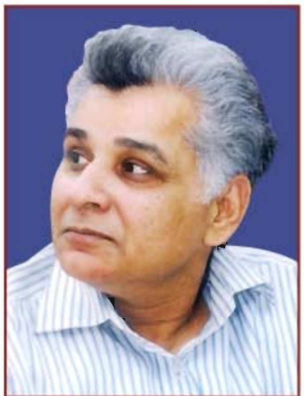

عصمت چغتائی جسمانی طور پر زندہ ہوتیں تو آج ایک سو برس کی ہوتیں لیکن اپنے پیچھے تخلیقی ادب کا جو بیش بہا سرمایہ وہ چھوڑ گئی ہیں وہ سیکڑوں برس زندہ رہے گا۔ زیر نظر شمارے میں 'اردو دنیا' نے ان کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کی ایک عاجزانہ کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف ادبی اور تخلیقی رویوں کے تحت خواتین اردو کے نثری ادب میں اپنی حصہ داری کا عمل پہلے ہی شروع کر چکی تھیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اردو افسانے کو سماجی شعور، نفسیاتی بصیرت اور عصری آگہی سے آشنا کرنے والی پہلی خاتون عصمت چغتائی ہی تھیں۔ یہی نہیں اردو ادب میں تانیثیت کی بنیاد گزار خاتون کے طور پر بھی ان کا نام لیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کا تخلیق کردہ تمام تر ادب اس کائنات میں عورت کی انفرادیت، اہمیت اور علاحدہ شناخت کو ثابت کرنے کی مسلسل کوشش کے نام منسوب ہے۔

اس شمارے کی ترتیب وتزئین آخری مرحلوں میں تھی کہ یکے بعد دیگرے اردو کے کئی مایہ ناز شخصیتوں بشرنواز اور عبداللہ حسین، سرور عثمانی (مدیر 'مفاہیم') اور ایس ایم فرید (مدیر 'قومی تنظیم' پٹنہ) کے انتقال کی خبر نے تمام اردو والوں کی طرح ہمیں بھی اداس کر دیا۔ بشرنواز اپنی عمر کے 80ویں سال میں تھے۔ زندگی کے پچاس برس انھوں نے شاعری اور دیگر اصناف ادب میں اپنی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو ادب کے گیسو سنوارنے میں صرف کیے۔ شعوری طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے ہندوستانی فلموں کے لیے نغمہ نگاری، ریڈیو کے لیے ڈرامہ نگاری اور ٹیلی ویژن کے مشہور سیریل امیر خسرو کے لیے اسکرپٹ رائٹنگ بھی کی۔ تنقید کے شعبے میں بھی انھوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ان سبھی ادبی خدمات کے لیے انھیں اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا گیا۔

ابھی چند روز قبل جناب ڈاکٹر مہتاب عالم صاحب نے ہماری بات بشرنواز صاحب سے کرائی تھی، بہت صاف لہجے میں انھوں نے نہ صرف مجھے مبارکباد دی بلکہ کئی مشوروں سے بھی نوازا اور اب اچانک یہ خبر آئی کہ اب وہ ہم میں نہیں رہے۔ دنیا میں آنے اور جانے کا یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گابی مگر کچھ لوگ اس طرح جیتے ہیں کہ اپنی خدمات اور اپنے تخلیقی عمل سے لوحِ جہاں پر حرفِ مکرر اور مقرر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ جناب بشرنواز نے اپنی شاعری سے اور اردو فکشن کی مشہور شخصیت عبداللہ حسین نے اپنے تخلیقی کارناموں سے اپنا نام تا دورِ آفتاب 'جہان ادب' میں محفوظ کر لیا ہے۔ عبداللہ حسین کو ان کے مقبول ترین ناول 'اداس نسلیں' کے لیے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جس میں انھوں نے پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کے زیرنگیں ہندوستان میں سماجی وسیاسی سطحوں پر آنے والی تبدیلیوں اور قدروں کے زوال کی ایک بھرپور داستان خاص اسلوب میں رقم کی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے چار دیگر ناول اور افسانوں کے تین مجموعے بھی تحریر کیے۔ 'اردو دنیا' کے آئندہ شمارے میں عبداللہ حسین اور بشرنواز پر بطورِ خراجِ عقیدت مضامین شائع کیے جائیں گے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

'اردو دنیا' جون 2015 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ پچھلے شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی متعدد گراں قدر، حددرجہ معلوماتی اور محققانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کی جتنی بھی ستائش کی جائے یا داد دی جائے کم ہے۔ یہ مضامین ہیں:

سائنسی ادب کی اشاعت میں اردو کا بے نظیر کردار، ہل-زرعی سائنس کا ایک اہم رسالہ، ادبی مباحث کے تحت: مولانا عبدالماجد دریابادی کی شاعری اور امرتا پریتم کے ناولوں میں نسائی کردار، مشاہیر ادب کے تحت: رشید احمد صدیقی-فن وشخصیت، خراج عقیدت کے تحت: خواجہ حسن ثانی نظامی، صحت کے تحت: لہسن دل کے مریضوں کا مسیحا اور کتابوں کی دنیا کے تحت تبصرے وتعارف

آصف جیلانی
سابق تجزیہ کار، بی بی سی لندن

موقر جریدہ اردو دنیا، جون 2015 کے شمارے میں ڈاکٹر مقصود الٰہی شیخ صاحب کا خاصا طویل انٹرویو شائع ہوا ہے جو کئی پہلوؤں سے بے حد دلچسپ ہے۔ ایک تو شیخ صاحب کی زبان کی چاشنی، ایک طویل عرصے پر محیط ان کے تجربات اور پھر ان کے اظہار رائے کے اچھوتے انداز کی وجہ سے سحر آمیز ہے۔ یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ شیخ صاحب نے غیر معمولی دلیری اور جرأت سے کام لیا ہے اور اپنے بچپن اور جوانی کے دور کے حالات بے دھڑک بیان کیے ہیں۔ عام طور پر لوگ اس بے لاگ انداز سے اپنی شخصیت کے دروں خانے میں دوسروں کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے یا گھبراتے ہیں خاص طور پر شب عروسی کے بارے میں بات کرتے ہوئے۔ شیخ صاحب کا آج کل شہرہ ان کی پوپ یا پاپ (Pop) کہانیوں کی بدولت ہے۔ پوپ کہانیوں کے بارے میں انھوں نے نکتہ چینی کا کچھ زیادہ ہی عذر خواہانہ انداز سے جواب دیا ہے اور

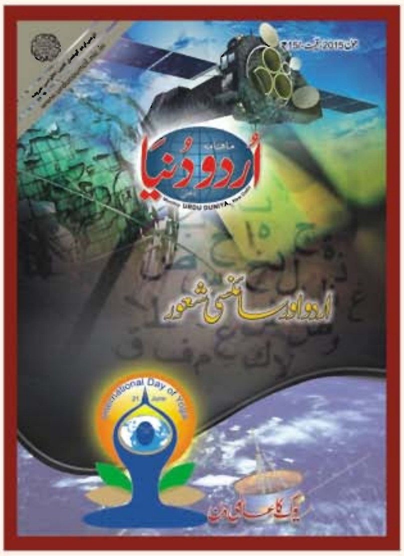

اسی کے ساتھ اس بات پر ناراضگی عیاں ہے کہ انھیں اس نئی اختراع کا موجد ہونے کا اعتراف کیوں نہیں کیا جاتا۔ شیخ صاحب نے پوپ کہانیوں کو لوک گیت اور فوک موسیقی کی طرح پوپ سانگ سے تشبیہ دی ہے، میرا خیال ہے کہ پوپ سانگ پوپ کہانیوں کی طرح مختصر نہیں بلکہ ان گانوں کو ان کی مقبولیت کی بنا پر Popular یا پوپ سانگ کہا جاتا ہے۔ برطانیہ میں اردو کے مستقبل کے بارے میں شیخ صاحب کا یہ کہنا کہ ہمارے بعد اجالا نہیں ہے اندھیرا ہے یاسیت سے عبارت ہے لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ کہہ کر اس یاسیت کو رجائیت سے کاٹ دیا ہے کہ اردو بڑی سخت جان ہے جس طرح شتر مرغ اپنی راکھ سے دوبارہ سر اٹھاتا ہے یہ بھی شکست و ریخت کے ریگزاروں سے بچ بچا کر ادھر ڈوبے اور ادھر ابھرے گی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ انٹرویو روبرو نہیں ہوا بلکہ تحریری سوال و جواب پر مبنی ہے یہی وجہ ہے کہ بعض جواب تشنہ رہ گئے ہیں کیونکہ ان کے جواب پر کئی سوال اٹھتے تھے جو نہیں کیے جاسکے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ شیخ صاحب نے کہا کہ زبان اور زبان کے الفاظ کے معنی وتراکیب بدلتی رہتی ہیں اور تلفظ بدلتا ہے۔ روبرو انٹرویو ہوتا تو ان کو اس پر للکارہ جاسکتا تھا کہ زبان کے الفاظ اور معنی تو بدلتے ہیں لیکن تلفظ نہیں بدلتا ہے ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ مختلف علاقوں کی زبانوں کی وجہ سے تلفظ پر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں اردو صحافت کے بارے میں ان کی رائے اس لحاظ سے ٹھوس اور صائب ہے کہ ان کا خود اس میدان میں بڑا طویل اور گہرا تجربہ ہے۔ شیخ صاحب نے نہایت کامیاب جریدہ راوی نکالا اور اس کو اپنے عروج پر پہنچایا اور پھر یہ مشعل دوسروں کے سپرد کردی۔

نسیم سحر
راولپنڈی، پاکستان

اردو دنیا کے شمارہ جون میں مقصود الٰہی شیخ کے انٹرویو کی ایک ایک سطر بغور اور بصد شوق پڑھی اور بہت اچھا لگا کہ شیخ صاحب نے بڑی سادگی اور خلوص کے ساتھ بڑی کھری کھری باتیں کی ہیں۔ نجیبہ عارف صاحبہ نے جتنا کچھ کہا ہے اہم باتوں کے بارے میں، وہ مجھے کچھ کم لگا ہے، ایسا انٹرویو جس میں آپ کی ذاتی زندگی، انا، غیرت، کچھ بننے کی تمنا، مسلسل محنت، قلم کی مزدوری اور اس راہ میں حائل ہمارے بہت سے نام نہاد مدیرانِ کرام اور لکھنے والے، یہ تمام باتیں بہت ہی دلچسپ اور دل کو گداز کرنے والی ہیں۔ لکھنے کو بہت کچھ ہے، مگر حاصلِ کلام یہ ہے کہ بہت، بہت ہی عمدہ، سچا اور سُچا انٹرویو ہے۔

رشید افروز
احمد آباد، گجرات

'اردو دنیا' کے شمارہ جون میں جناب مقصود الٰہی شیخ کا انٹرویو دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اس انٹرویو کے توسط سے برصغیر کے عمر رسیدہ، جہاں دیدہ اور بے حد فعال، متحرک ادیب، افسانہ نگار اور صحافی کی طویل کارکردگی اور کامیاب زندگی کے مختلف گوشے اجاگر ہوتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ سوال پوچھنے والے اور جواب دینے والے کسی شخص نے علمیت بگھارنے یا رعب قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بات نجی زندگی کی ہو، زبان و بیان کی، منٹو کے سیاہ حاشیے کی

یا ان کی ایجاد کردہ پوپ کہانی کی، رسائل کے مدیران اور قلمکاروں کی، شیخ صاحب کی صاف گوئی، بیباکی اور خلوص کے ساتھ ان کا اعتماد بھی ہر مقام پر نمایاں نظر آیا۔ شیخ صاحب نے جو کچھ بیان کیا ہے، اسے پڑھ کر دکھ بھی ہوا اور افسوس بھی۔ اللہ کا شکر ہے مایوس ہونے کے باوجود ان کا یقین سلامت ہے۔ ان کے اس قول نے دل ڈوبنے سے بچالیا:

''مجھے سرنگ کے آخری سرے پر روشنی نظر آرہی ہے۔ اردو بڑی سخت جان ہے، جس طرح شترمرغ اپنی راکھ سے دوبارہ سر اٹھاتا ہے یہ بھی شکست و ریخت کے ریگزاروں سے بچ بچا کر ادھر ڈوبے اُدھر ابھرے گی۔ برطانیہ پر کیا موقوف دنیا بڑی وسیع ہے۔ مشرق سے نکالو، مغرب میں بساط بچھالیتی ہے۔''

مقصود صاحب زندگی کی 82 ویں پائدان پر ہیں۔ نوجوانوں سے زیادہ چاق و چوبند، وہ تفاوتِ عمر سے قطع نظر آج کل کے سبھی لکھنے والوں کو ہم عصر سمجھتے ہیں اور ان سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ صرف انسان ہی نہیں، کمپیوٹر کو بھی اپنا دوست جانتے ہیں۔ انٹرویو کے اختتام پر قارئین کے لیے ان کا پیغام لاجواب ہے۔ آزما کر دیکھیں۔

جلیل مرزا

بریڈفورڈ، برطانیہ

جون کے شمارے میں مقصود الٰہی شیخ صاحب کا انٹرویو نظر سے گزرا۔ برطانیہ کی ایک معروف شخصیت کی پزیرائی ہم سب اہل برطانیہ اور خاص طور پر اہل بریڈفورڈ کے لیے باعث فخر ہے۔ موصوف کی شخصیت یوں تو یہاں کے ادبی حلقوں اور اردو اخبارات پڑھنے والوں کے لیے کسی تعارف کی محتاج نہیں مگر آپ کے مناسب سوالات اور موصوف کے برجستہ جوابات نے ہمیں ان کی زندگی کے کئی ایسے گوشوں اور خیالات و نظریات سے آگاہی دی ہے جن سے پہلے واقفیت نہ تھی۔ نوجوان نسل میں اردو کے رجحان ترویج اور بالخصوص برطانیہ میں اردو کے مستقبل پر آپ کے سوالات یقینی طور پر بجا اور برمحل تھے اور جواب میں شیخ صاحب کے خیالات اور تجاویز اس ضمن میں ان کی زندگی بھر کی کاوشوں اور تجربات کا نچوڑ لگتے ہیں۔

سلطان اختر

S-5، ہیون پرائڈ، دوسری منزل، شنیوار پیٹھ، سولاپور

'اردو دنیا' جون کے شمارے کا gate up بہت پسند آیا۔ مرحوم شعراء، ادبا پر گوشے کا سلسلہ بہت خوب ہے۔ میں قومی کونسل سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ معروف و بیباک نقاد مرحوم سکندر احمد پر بھی گوشہ شائع کرے۔ سکندر احمد غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ آپ نے کئی تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھ کر کم وقت میں بحیثیت نقاد اپنا مقام بنایا۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری

زرینہ منزل، ورنداون کالونی، قدیم جالنہ، ضلع جالنہ، مہاراشٹر

'اردو دنیا' جون 2015 میں سائنسی شعور کو بطور کور اسٹوری پیش کرکے آپ نے اردو دنیا کو اک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ یہ پیش کش انوکھی اور ندرت کی غماز ہے۔ اس سے اردو والوں کو مزید غور وفکر کی استطاعت اور نئی روشنی حاصل ہوگی۔ اس کے ذیل میں کوئی آٹھ مضامین (ص 14 تا ص 32) دیے گئے ہیں جو نہایت گراں قدر اور مفید معلومات سے معمور نہیں۔ اسی شمارے میں ڈاکٹر عبدالحی نے محترم مقصود الٰہی شیخ سے لیا گیا بے نظیر انٹرویو درج کیا ہے۔ اس کے سوالنامے پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اِس میں صحافت، ادب (اور مذہب بھی) کو اعتدال سے سمو دیا گیا ہے۔ نیز اختتامی سافٹ ویئر کی آمیزش نے عجب نکھار پیدا کردیا ہے۔ پھر زیریں حاشیہ کی عبارتیں تو بڑی ہی معاون اور معنی خیز ہیں۔ باقی مشمولات قابلِ قدر ہیں۔

پرویز اشرفی

D-321، دعوت نگر، اے ایف انکلیو، نئی دہلی

ماہ جون کا شمارہ موصول ہوا۔ سائنسی ادب سے متعلق اداریہ خوب ہے۔ نشاں زیدی نے 'امرتا پریتم کے ناولوں میں نسائی کردار' پر مبنی جامع مضمون پیش کیا ہے۔ محترمہ نشاں زیدی نے بجا فرمایا کہ امرتا پریتم نے اپنے ناولوں میں عورت کے ہر پہلو کو اجاگر کرنے کی نہ صرف کوشش کی ہے بلکہ اس میں کامیاب بھی ہیں۔ نسیم احمد نسیم نے نیپال کی سرزمین پر اردو کی آبیاری کس طرح کی گئی اس کا احاطہ بخوبی کیا ہے۔ برادر محمد عثمان کی تحقیق 'ہل: زرعی سائنس کا ایک اہم رسالہ' معلوماتی مضمون ہے۔ جہاں تک راقم کی معلومات کا سوال ہے، پہلی بار پتہ چلا کہ زرعی اور دیہی موضوع پر ایک اردو ماہنامہ 'ہل' بھی شائع ہوتا تھا۔

'سائنس اور یوگ' سے متعلق یوگ کی افادیت پر زور دیا گیا ہے۔ مختلف قسم کے 'آسن' (Exersice) کا ذکر ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں کے رِشی مُنی نفس کو قابو میں کرنے کے لیے یوگ کرتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ منتر پڑھتے بھی تھے۔ ان باتوں سے دور اگر جسم کو صحت یاب رکھنے کے لیے ایسی ورزش یا آسن کیا جائے جس میں کسی منتر کی ضرورت نہ ہو تو قابل قبول ہے۔

'سائنسی ادب کی اشاعت میں اردو کا بے نظیر کردار' میرا خیال ہے کہ یہ مضمون اردو جاننے والوں کو ضرور پڑھنا چاہیے۔ محمد خلیل صاحب نے لہسن پر نہایت اہم مضمون پیش کیا ہے۔ میڈیا کالم کے تحت 'معاشرے میں ٹیلی ویژن' ایک نہایت جامع مضمون قرار دیا جاسکتا ہے۔

کور اسٹوری کالم کے تحت اردو کی سائنسی استعداد، اردو میں سائنسی ادب، ادب اور سائنس، حالی کا سائنسی شعور، سائنسی ادب کی اشاعت میں اردو کا بے نظیر کردار، سائنس، ٹکنالوجی اور ادب کی تثلیث حاصل شمارہ ہیں۔ مقصود الٰہی سے لیا گیا انٹرویو بہت پسند آیا۔ مقصود الٰہی کے آخری دوسرے پیغام پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا، کیونکہ میں بھی اس نئی ایجاد سے اچھی طرح نہیں کھیل سکتا۔ جناب فاروق ارگلی اور عقیل احمد کے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔ ان کے علاوہ تمام مشمولات، تبصرہ و تعارف، عالمی اردو نامہ، خبرنامہ و دیگر علاقائی خبروں کا کالم بھی معلوماتی ہے۔

عبدالشاھد

لیکچرار، اردو جونیئر کالج، پوسد ضلع ایوت محل (مہاراشٹر)

ماہِ جون 2015 کا شمارہ نظرنواز ہوا۔ مضامین کی ترتیب خوش نما کتابت، دیدہ زیب تصاویر اور بے باک آرا سے شمارے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ یقیناً اردو کی ترقی کے لیے آپ کی جانب سے کیے گئے اقدام قابلِ صد تحسین ہیں۔

شمارے میں تمام مضامین Readability کی خوبی رکھتے ہیں اس لیے ایک ہی نشست میں پورے شمارے کو چاٹ گیا۔ 'اردو کی سائنسی استعداد' ایک نادر مضمون ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ حالی کا سائنسی شعور، ادب اور سائنس، اردو میں سائنسی ادب بھی کافی پسند آئے۔ رشید احمد صدیقی پر لکھا گیا مضمون انتہائی معلوماتی ہے۔

شکیل سہسرامی

بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ بہار

اردو دنیا جون، 2015 کا سائنسی سرورق انتہائی دیدہ زیب ہے۔ ڈیزائنر کا ڈیزائن کمال کا ہے۔ یوں تو اردو دنیا کا تمام سرورق دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دیر کے بعد ہی شمارے کا اگلا صفحہ پلٹنے کا جی کرتا ہے۔ اردو دنیا بہت خوش نصیب ہے کہ اس دنیا پر مسلسل کرم کی بارش جاری و ساری ہے اس کے تعلق سے ماضی و حال دونوں کا انتخاب قابل تعریف ہے۔ اکرام و کریم دونوں خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ سائنسی شعور کی بیداری اور جدید ٹکنالوجی کی خاطر خواہ آبیاری کے لیے جتنا کچھ اشاعتی طور پر این سی پی یو ایل نے کردیا ہے وہ

ناکافی نہیں بلکہ کافی ہے۔ ضرورت ہے اب عرصہ دراز تک تھیوری اینڈ پریکٹیکل کی۔ اس سے متعلق چند تجربات تو تحرکات کی اشارتی و متحرک سی ڈی بازار میں اتارنے کی۔ امید کہ یہ کاوش مزید فعال ثابت ہوجائے۔ ویسے موجودہ نصابی کتابوں کی سی ڈی کتاب کے ساتھ ہی ملتی ہے۔

شیخ مقصود الٰہی کا انٹرویو قرأت کی جاذبیت رکھتا ہے۔ گرچہ انٹرویو کا آغاز آمرانہ ہے جو انتہائی نامناسب ہے۔ عبدالحی کا پہلا جملہ پڑھتے ہی مجھے عدالت کی پکار یاد آگئی، ''گھیسو میاں عدالت میں حاضر ہوں!.....'' میرے خیال سے عبدالحی کو کچھ اس طرح مخاطب ہونا چاہیے، موصوف سے میری گزارش ہوگی کہ آپ سب سے پہلے اپنی پرورش و پرداخت اور اپنی تعلیم سے متعلق اپنی گفتگو کا آغاز فرمائیں۔ عبدالحی صاحب ذی علم آدمی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اردو دنیا کی ٹیم کے رکن ہیں۔ اگر غصہ ہوجائیں گے تو میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر ہوجائے گا۔

ادب اور سائنس کا رشتہ دور جدید میں چولی دامن کا رشتہ ہوگیا ہے۔ واٹس ایپ، ای میل، انٹرنیٹ، فیس بک، اسکیننگ اور کئی دیگر ذرائع سب کے سب فروغ ادب کا ذریعہ ہیں جو سائنس کے مرہون منت ہیں۔ ان دنوں سائنس اور یوگا کی ترقی تو دیکھتے بن رہی ہے۔ اب تو شہر در شہر فٹنیس انسٹی ٹیوٹ کھل چکے ہیں۔ جہاں یوگا کے جدید ترین آلات کسی میوزیم کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مشمولات سے متعلق نسیم احمد نسیم اردو ادب کے ایک معتبر محقق اور ناقد ہیں ان کا مضمون معیاری بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ عبدالماجد دریابادی صاحب کی شاعری پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ تمام تبصرے و تعارف عمدہ ہیں۔ عالمی اردو نامہ پڑھنے کے قابل ہے۔ قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں واقعی استحقاق ستائش رکھتی ہیں۔

میر رحمت
ریسرچ اسکالر، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

اردو دنیا جون 2015 کے شمارے کی کور اسٹوری 'اردو اور سائنسی شعور' پر نظر پڑتے ہی ایک طرف مسرت اور دوسری طرف کمتری کا احساس ہوا۔ مسرت اس لیے کہ واقعی اس موضوع پر توجہ کرنے کی ضرورت تھی اور کمتری کا احساس اس لیے کہ اردو سائنس کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئی۔ وجوہات مقالہ نگار حضرات نے بہت ہی احسن طریقے سے گنائی ہیں۔ خاص کر شمس الاسلام فاروقی اور اقرا سبحان کے مقالے اس ضمن میں کافی اہم ہیں۔ وقت کی ضرورت ہے کہ ہم اردو کو سائنسی علوم سے جوڑنے کے عملی اقدام کریں۔ خاص کر اردو ریسرچ اسکالروں کو ایسے موضوعات کی طرف توجہ کرنی چاہیے جن سے اردو اور سائنس کے درمیان خلیج کم ہو جائے۔ میر، غالب، اقبال، فیض وغیرہ پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم بین العلومی طریقہ کار اپنا کر سائنسی کارناموں کو اپنی زبان میں منتقل کریں اور ایسی صورت میں اساتذہ صاحبان کو بھی اپنے مخصوص دائرے سے باہر آنا ہوگا اور ایسے طلبا کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی جو ایسا کوئی کام کرنا چاہیں۔

شمارے میں شامل باقی مقالے بھی خاصی محنت اور لگن سے لکھے گئے ہیں۔ نشاں زیدی نے امریتا پریتم پر مقالہ لکھ کر ریسرچ سکالروں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کالی داس گپتا رضا کی کتاب دوستی بھی عمدہ عنوان ہے۔ مقالہ نگار نذیر فتح پوری نے اس نکتے کو ابھارا ہے کہ ان کی یہ کتب کہاں ہیں کسی کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے اس نایاب خزانے کا پتا لگایا جائے۔ فاروق ارگلی کا ادا جعفری پر مقالہ بھی بہترین ہے لیکن مقالہ نگار نے ادا کی تحقیقی وتنقیدی تصنیف 'غزل نما' کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ ادا جعفری کی اس تصنیف میں شعرا کے حالات زندگی اور نمونہ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب سے ادا کے تحقیقی وتنقیدی شعور کا اندازہ اچھی طرح ہوجاتا ہے۔

سید اعجاز الحق بخاری
متعلم دارالعلوم رضوتہ سلطانیہ سرنکوٹ، ضلع پونچھ، جموں وکشمیر

'اردو دنیا' شمارہ جون میں محمد انیس الرحمٰن خان صاحب ایڈیٹر دیہی آواز چرخہ کے قلم سے لکھا گیا مضمون پڑھنے کا موقع ملا۔ مضمون سے بہت ساری معلومات فراہم ہوئی۔ محمد انیس الرحمٰن خان صاحب نے سانس اور یوگ منزل ایک راستے دو میں یوگ کے حوالے سے تحقیقی جانکاریاں دے کر اردو والوں پر احسان کیا ہے۔ ایسی تحریریں رسالے میں آگے بھی شائع کریں۔

فوزیہ حسن بنت مولانا عین الحسن
حیدرگنج کڑاہ، سیلاؤ، نالندہ، بہار

ماہ جون 2015 کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں اور جاذبیت وکشش کے ساتھ 'اردو اور سائنسی شعور' کے علاوہ 'یوگ کا عالمی دن' زیر معالعہ ہے یوں تو اس کے تمام مشمولات قابل تعریف وتحسین ہیں مگر جناب محمد انیس الرحمٰن خان کی تحریر 'سائنس اور یوگ منزل ایک راستے دو' نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ پوری دنیا میں پہلی مرتبہ یوگ کو عالمی طور پر 21 جون کو منانے کی مناسبت سے اہمیت کا حامل ہے۔ میں محترم کو روزنامہ اخبارات میں مختلف سیاسی، مذہبی اور ترقیاتی موضوعات پر پڑھتی آئی ہوں بگران کے قلم سے اس طرح کی تحریر پہلی مرتبہ میری نظروں سے گزری ہے۔

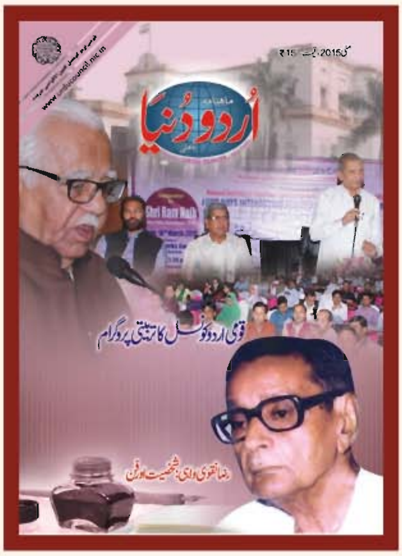

شمیم اعظمی
الٰہی باغ، گورکھپور

'اردو دنیا' ماہ مئی کا شمارہ پیش نظر ہے۔ اس رسالے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے مضامین کے انتخاب میں ہر طرح کے قارئین کے ذوق کا خیال رکھا جاتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں یوں تو سب ہی مضامین اہمیت کے حامل ہیں لیکن مجھے گوشہ رضا نقوی واہی خصوصیت کے ساتھ پسند آیا۔ ان کا مزاحیہ کلام کبھی 'قومی آواز' اخبار میں پڑھنے کو مل جایا کرتا تھا لیکن پھر یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ آج یک مدت کے بعد ان کی ذات اور ان کے کلام پہ اچھا خاصا مواد پڑھنے کو ملا تو طبیعت خوش ہوگئی۔

گزارش

قلمکار خواتین و حضرات سے گزارش ھے که اپنے مضامین کے ساتھ اپنا ایك مختصر تعارف، بایوڈاٹا (Biodata)، مضمون کے غیرمطبوعه ھونے کا تصدیق نامه اور پاسپورٹ سائز کی ایك تصویر ضرور ارسال کریں۔ (اداره)

تعارف

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

پروفیسر سید علی کریم اردو دنیا میں ارتضیٰ کریم کے قلمی نام سے جانے جاتے ہیں۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اردو تنقید و تحقیق کے میدان میں ان کی سرگرم شرکت کی گواہ ہیں، ان کی 20 سے زائد کتابیں، جو منظر عام پر آ کر سنجیدہ قارئین سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کی صدارت کے دوران ایک طرف انھوں نے شعبے میں موجود نادر مخطوطات اور نایاب وکمیاب کتابوں کو جہاں از سرِ نو شائع کر کے کلاسیکی ادب سے اپنی دلچسپی کا ثبوت پیش کیا وہیں شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی پچاسویں سالگرہ کو اس تزک و احتشام سے برپا کیا کہ کم وبیش ساری اردو دنیا سے اپنی انتظامی صلاحیت کا لوہا منوالیا۔

دہلی یونیورسٹی کی تاریخ میں کسی بھی شعبے کو اتنے بڑے جلسے کے اہتمام کا فخر حاصل نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب مرکزی حکومت نے موصوف کو اردو دنیا کے سب سے بڑے ادارے کا سربراہ بنایا ہے۔ اب نہ تو ان کے سامنے وسائل کی کمی ہے اور نہ ہی دائرۂ کار کی۔ مخالفتوں، سازشوں، ریشہ دوانیوں، چشمکوں، عصبیتوں کے نہ جانے کتنے زخم در زخم ہوں گے جسے انھوں نے کبھی بے پردہ نہیں کیا بلکہ اردو زبان وادب کی خدمت کرتے رہے ہیں لہٰذا تمام محبان اردو اور خود حکومت کی پروفیسر موصوف سے یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ اپنی سربراہی کے دوران شایانِ شان اردو زبان کے نئے نئے اہداف قائم بھی کریں گے اور اسے حاصل بھی۔

کہا جاتا ہے کہ جہاں چاہ وہاں راہ— پروفیسر ارتضیٰ کریم اس کی زندہ مثال ہیں۔ اوائلِ عمری سے ہی موصوف کو اردو زبان، اردو تہذیب اور کلاسیکی ادب سے والہانہ عشق تھا اور حسنِ اتفاق سے ان کی پیدائش بہار کے مردم خیز شہر گیا میں ہوئی اور کلام حیدری اور سید محمد حسنین جیسے نابغہ استاد نے گیا میں اور پروفیسر قمر رئیس نے دہلی میں ان کی سرپرستی فرمائی جس سے ہونہار بروا کے چکنے پات کو اور زیادہ نکھرنے سنورنے کا موقع ملا۔ ان بزرگوں کے تجربات اور خود اپنے مشاہدات نے انھیں ادب کا ایک نہایت بالغ پارکھ بنا دیا اور اوائل عمری میں چند افسانے لکھنے اور شائع کروانے کے علاوہ وہ تخلیقی راہ سے یکسر الگ ہو کر صرف اور صرف تنقید و تحقیق کی راہ کے مسافر ہو گئے۔ ان کی محنت ولگن اور اردو زبان سے ان کے والہانہ شوق نے ہی ان کو آج ہندوستان کے سب سے بڑے اردو ادارے کا سربراہ بنایا ہے اور ان کے ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہونے کی خبر سے تمام اردو دنیا کے افراد میں خوشی کی ایک خوشگوار لہر محسوس کی جا رہی ہے۔ ان کی کتابوں میں عجائب القصص: تنقیدی مطالعہ، اردو فکشن کی تنقید، بہار کا اردو ادب، قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ، انتظار حسین: ایک دبستان، نوطرزِ مرصع: تدوین وترتیب وغیرہ طالبانِ ادب کے لیے سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تنقیدی و تحقیقی کتابوں کے علاوہ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے 100 سے زائد مقالے تحریر کیے اور ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کئی ملکوں کے ادبی مراکز میں اسے پیش کیا اور تواتر کے ساتھ ادبی رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے۔ موصوف کی نگرانی میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کرنے والے طالب علموں کی بھی کثیر تعداد ہے جو ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں اور اردو کی تہذیب وثقافت کا دیا بھی روشن کیے ہوئے ہیں۔

آپ کی ان صلاحیتوں کے اعتراف میں بہار اردو اکادمی نے متعدد دفعہ مختلف ایوارڈز سے نوازا۔ اس کے علاوہ دہلی اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی، ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی لکھنؤ، سنٹرل ہندی ڈائرکٹوریٹ آل انڈیا ترقی پسند ایسوسی ایشن نے بھی آپ کی صلاحیتوں کے شایانِ شان انعام واکرام سے نوازا ہے۔ انھوں نے کراچی میں ممتاز حسین لٹریری سوسائٹی کی دعوت پر شرکت کی اور پروفیسر ممتاز حسین پر یادگاری اور توسیعی خطبہ پیش کیا۔ پچھلے سال کناڈا کی ادبی انجمن 'رنگ منچ کناڈا' نے انھیں Life Time Achievement ایوارڈ سے نوازا۔ (ادارہ)

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تصنیفات/تالیفات

(1)	بہار کا اردو ادب (1971 تا 1980)	1986
(2)	عجائب القصص: تنقیدی مطالعہ	1987
(3)	موضوعات (تنقیدی مضامین)	1989
(4)	رشید جہاں — ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی	
(5)	میر ناصر علی دہلوی — اردو اکادمی، نئی دہلی	
(6)	کلام میر سوز	1991
(7)	قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ (پہلا ایڈیشن)	1992
(8)	قرۃ العین حیدر: ایک مطالعہ (دوسرا ایڈیشن)	2001
(9)	اردو فکشن کی تنقید (پاکستان میں یہ کتاب فضلی اینڈ سنس سے شائع ہوئی)	1996
(10)	انتظار حسین: ایک دبستان	1996
(11)	مختلف (تنقیدی مضامین)	1998
(12)	جوگندر پال: فن اور فنکار	1999
(13)	معرکۂ وہاب اشرفی وشمس الرحمن فاروقی	2000
(14)	مطالعات (تنقیدی مضامین)	2001
(15)	جدید تنقید کا منظر نامہ: اساس، استنباط	2003
(16)	اردو ادب: احتجاج اور مزاحمت کے رویے	2004
(17)	آغا حشر: عہد اور ادب	2006
(18)	اردو میں پاپولر لٹریچر	2006
(19)	مابعد جدیدیت اور پریم چند (تنقیدی مضامین)	2006
(20)	دہلی اردو اخبار 1841	2010
(21)	دہلی اردو اخبار 1857	2010
(22)	1857: پہلی جنگ آزادی	2010
(23)	کلیاتِ نظام اردو خطبات (جلد اوّل)	2010
(24)	کلیاتِ نظام اردو خطبات (جلد دوم)	2014
(25)	نوطرز مرصع (مع فرہنگ ومقدمہ)	2014
(26)	گریز (ناول) (مع مقدمہ)	2015

غضنفر اقبال

لکھنا سب سے بڑا روحانی اعزاز ہے

انل ٹھکر

انل ٹھکر، اُردو کے ان معتبر ادیبوں میں شامل ہیں جو اعلیٰ درجے کے فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ تھیٹر سے بھی جڑے ہوئے ہیں اور نہ صرف ڈرامہ لکھتے ہیں بلکہ بہترین اداکار بھی ہیں۔ آر کے نرائن کے مشہور زمانہ ٹی وی سیریل مال گڈی ڈیز میں انھوں نے اپنی اداکاری کے جلوے بھی دکھائے ہیں۔ اس کے علاوہ فن مصوری سے انل ٹھکر کو خاص دلچسپی رہی ہے۔

انل ٹھکر، غیر معمولی ذہانت اور حساس و دردمند دل رکھنے والی ایک محترم شخصیت ہیں۔ ہندو ہوتے ہوئے بھی مسلم کلچر کی گہری سمجھ رکھتے ہیں۔ زندگی کی 80 بہاریں دیکھ چکے ہیں لیکن ان کے قلم میں توانائی موجود ہے۔ نئے نئے موضوعات پر ناول رقم کرتے ہیں اور اپنے قارئین کو متوجہ کرتے ہیں۔ لیکن قومی سطح کے اعزاز سے محروم ہیں اور اپنے لکھنے کو ہی وہ سب سے بڑا روحانی اعزاز سمجھتے ہیں۔ پیش ہیں انل ٹھکر سے کی گئی گفتگو کے چند اقتباسات: (ادارہ)

غضنفر اقبال: انل ٹھکر صاحب براہِ کرم قارئین اردو دنیا کو اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیں:

انل ٹھکر: بحیرہ عرب کو چھوتی ہوئی ایک چھوٹی سی ریاست تھی 'کچھ' اب گجرات اسٹیٹ کا ضلع ہے۔ اس چھوٹی سی ریاست میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا 'ورسامڑی' جو 26 جنوری 2001 کو آئے زلزلے میں زمین دوز ہوگیا۔ اس گاؤں میں 6 جون 1934 کو میں پیدا ہوا۔ گاؤں کی آبادی چار ہزار کے قریب رہی ہوگی۔ مگر گاؤں کو ہزار بارہ سو لوگ ہی آباد رکھے ہوئے تھے۔ باقی لوگ روزی روٹی کی تلاش میں کوئی بمبئی، پنجاب، تو کوئی کراچی میں زندگی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ جو سال دو سال میں ایک آدھ مرتبہ گاؤں کا چکر لگا جائے۔ گاؤں میں دو تین چھوٹی موٹی حویلیاں تھیں جن کے در اور دریچے اپنے مالک کے لیے دیوار میں آنکھیں بچھائے رہتے۔ گاؤں میں کچھ گھر کسانوں کے، کچھ پردیس میں رزق کی تلاش میں جینے والوں کے تھے۔ ایک بستی رباری قوم کی تھی۔ جو بھیڑ بکریاں پالنے کا کام کرتے تھے۔ ان کی بستی عموماً خالی رہتی تھی۔ وہ اپنے ریوڑ کو چرانے اپنے پورے قبیلے کے ساتھ گجرات اور سوراشٹر تک مہینوں نکل جاتے۔ گاؤں میں بازار کے نام پر لون مرچ، بیڑی ماچس اور چائے کی ایک دکان تھی۔ یہاں کاروبار کی بہ نسبت وقت گزاری اور گپ شپ کا شغل زیادہ ہوتا تھا۔ شام کے وقت یہ چھوٹا راستہ سانس لینے لگتا۔ جب گاؤں کی عورتیں گلے تک گھونگھٹ کھینچ سر پر پیتل کا گھڑا اور کمر میں گاگر ٹکائے تالاب پر پانی بھرنے نکلتیں۔ میرے دادا کی تھوڑی سی زمین تھی۔ وہ اس پر کھیتی کرواتے، کھیتی کا دار و مدار بارش پر رہتا اور بارش اس قطعہ زمین پر کبھی کبھی تین تین، چار چار سال روٹھ جاتی۔ بادل راستہ بھول جاتے۔ قحط سالی کے دوران گرم ریت بدن کو جھلساتی، گاؤں بھائیں بھائیں کرتا۔ اس ناقابل اعتبار موسم کی وجہ سے آج بھی یہاں کے گاؤں ویران پڑے ہیں۔ میرے دادا کے پانچوں بیٹے رزق کی تلاش میں بمبئی چلے گئے۔ وہاں اپنے پیر جمانے کے بعد فرداً فرداً سب نے اپنے اہل خانہ کو بمبئی منتقل کرلیا۔ میرے والد دادا کے دوسرے نمبر کی اولاد تھے مگر اپنے کنبے کو بمبئی لے جانے والوں میں وہ آخری تھے۔ سب سے بعد میں گاؤں چھوڑنے سے مجھے گاؤں کی دھول میں اپنا بدن میلا کرنے کا موقع نصیب ہوا جن کی دھندلی یادیں آج بھی ماضی کی سیر کراتی ہیں۔ دادا کی گود میں کھیلنا، ان کے کندھے پر سوار ہوکر کھیتوں میں فصل کی نگرانی کے لیے آوازیں لگا کر پرندوں کو اڑانا، علی الصبح دادا کی انگلی پکڑ کر مندر میں ماتھا ٹیکنے جانا۔ گاڑی بان کی گود میں بیٹھ کر بیل گاڑی چلانا... اب تو وہ گاؤں بھی نہیں رہا۔ سنا ہے، اس قطعہ زمین پر اب چھوٹی بڑی فیکٹریاں کھڑی ہوگئی ہیں۔ ترقی کے نام پر وہاں کچے گھروں کے اطراف نئی بستی آباد ہوگئی ہے مگر اب وہ میرا گاؤں پہلے والا ورسامڑی نہیں رہا ہوگا۔

غ الف: آپ کے بچپن اور آج کے بچوں کے بچپن کے بارے میں کیا کہیں گے؟

انل ٹھکر: میرے بچپن اور آج کے بچوں کے بچپن کے درمیان ایک لمبا فاصلہ ہے۔ ہم میلے ٹھیلے سے خریدی لکڑی کی چھوٹی سی بیل گاڑی کو رسی باندھ کر کھینچتے ہوئے کلکاریاں

بھرتے تھے۔ آج کا بچپن کار، ہوائی جہاز کے کھلونوں سے جی بہلاتا ہے۔ کمپیوٹر اور ویڈیو گیم میں اپنے مستقبل کو دیکھتا ہے۔

غ الف: آپ کی تعلیم کس ماحول میں ہوئی؟

انل ٹھکر: ہمارے یہاں تعلیم کا ماحول صفر تھا۔ گاؤں میں اسکول نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے۔ ایک مرتبہ والد صاحب بمبئی سے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ (گاؤں میں جو چار چھ بزرگ تھے ان سے صلاح مشورہ کیا ہوگا) اچانک ایک روز گاؤں کے دس بارہ بچوں کو جمع کیا گیا۔ دیوی سرسوتی کی پوجا ہوئی۔ بتاشے اور مُرمرے بانٹے گئے اور بچوں کو ایک معلم کے حوالے کر کے اسکول شروع کر دیا گیا۔ اس طرح میرے ہاتھ میں سلیٹ اور کھڑیا آئی۔ مگر والد صاحب دوسری بار گاؤں آئے تو لوٹتے وقت اپنے کنبے کو بھی بمبئی لے آئے۔ اس طرح میری تعلیم کا خیمہ ورساٹری سے اُکھڑا۔ بمبئی میں دو تین سال گجراتی میں پڑھائی کی کہ والد صاحب کو رزق کی تلاش میں پنجاب لائل پور جانا پڑا۔ ہماری تعلیم کا ڈیرا پھر اٹھایا گیا۔ لائل پور آ کر سناتن دھرم ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ یہاں تین زبانوں میں سے دو زبانیں چننے کا رواج تھا۔ میں نے گُرمکھی کو چھوڑ کر ہندی اور اردو کو چنا اور گاڑی آگے بڑھی۔ مگر واہ رے قسمت!! ساتویں جماعت میں آیا کہ ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔ ہمیں بمبئی واپس آنا پڑا۔ یہاں نویں جماعت تک گجراتی میں تعلیم لی مگر شاید کاتب تقدیر کو چین نہیں آیا۔ والد صاحب کاروبار کے لیے ہبلی منتقل ہوگئے۔ اس خانہ بدوشی سے تنگ آ کر میں نے پڑھائی ترک کر دی۔ وقت گزاری کے لیے میں نے اسکول آف آرٹ دھارواڑ میں مصوری سیکھنے کے لیے داخلہ لے لیا۔ چار سال مصوری سیکھی۔ پڑھائی چھوٹ گئی۔

غ الف: ادب سے لگاؤ کی وجہ کیا رہی؟

انل ٹھکر: ہماری زندگی میں کسی چیز سے لگاؤ Back Door سے کب داخل ہو جاتا ہے۔ اس کا ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ میرے ساتھ یوں ہوا کہ میں اسکول آف آرٹ جانے کے لیے روزانہ دو بار دھارواڑ جایا کرتا تھا۔ صبح پانچ بیس کی ٹرین سے نکلتا چھ بجے پہنچ جاتا۔ میں اسکول جانے کے لیے باہر کا راستہ اختیار کرتا۔ ہلکی ہلکی کہر، پرندوں کی چہچہاہٹ اور خاموشی۔ کتنے خیال آتے، گزر جاتے۔ میں گھومتے گھامتے اسکول پہنچتا۔ دوپہر کا کھانا کھانے ہبلی آتا۔ دوپہر کے بعد واپس اسکول جاتا۔ دھارواڑ اسٹیشن سے اسکول دور تھا۔ راستے پر بھیڑ بھاڑ نہیں رہتی تھی۔ کبھی کبھی تانگہ یا سائیکل سوار کا گزر ہوتا تھا۔ گجراتی سماج کے کتب خانے کتاب سے لے جاتا۔ سڑک کے کنارے کتاب میں نظر گاڑے راستہ طے کرتا۔ اس طرح میں نے چار سال میں شرت چندر، ٹیگور، پریم چند اور دیگر گجراتی ادیبوں کو پڑھا۔ بعد ازاں میں نے شمع، آئینہ، بیسویں صدی جیسے رسائل پڑھ کر اردو سے قربت حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ اردو میں پڑھ لیتا تھا، لکھنے کی مشق چھوٹ گئی تھی۔

غ الف: وہ کیا محرکات تھے جب آپ تخلیقی ادب کی طرف آئے؟

انل ٹھکر: اسکول آف آرٹ میں ہم نے School day منایا جس میں پنڈت سدرشن کا ڈرامہ سکندر ہم نے کھیلا۔ یہ بات جب All India Radio پہنچی تو وہاں کے ڈائریکٹر جناب بھنور متھ صاحب نے مجھے بلا کر ہندی

اردو ادب اردو زبان کا تہذیبی حصہ ہے۔ یہ زبان سمندر کے مانند ہے۔ یہ اپنی بانہوں میں باہر سے آنے والی ہر زبان کے الفاظ کو اپنے میں سما کر ایک جان کر لیتی ہے اور پھر سمندر کے پانی کی طرح بھاپ بن کر دوسری زبانوں کو تر و تازہ کررہی ہے، ہندی، گجراتی، مراٹھی، کنڑا ایسی کتنی ہندوستانی زبانیں ہیں جن کو اردو نے لفظی بوندوں سے مالامال کردیا ہے۔ گجراتی اور مراٹھی میں تو ایک عرصے سے غزل بھی لکھی جارہی ہے۔ اردو دوسری زبانوں سے کم سن ہے۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھے گی اس کا جاہ و جلال اور بڑھے گا۔

ڈراما کے اداکاروں کی فہرست میں میرا نام شامل کر لیا۔ آگے چل کر A.I.R. دھارواڑ، گلبرگہ سے اردو پروگرام نشر ہونے لگے تو اس وقت کے اسٹیشن ڈائریکٹر نے مجھے ریڈیو کے لیے ڈراما لکھنے پر آمادہ کیا۔ میں نے ڈراما لکھا 'تم' بعد میں میرے عزیز دوست تنہا تمناپوری صاحب کے کہنے پر وہ ڈراما ماہنامہ 'شاعر' کو اشاعت کے لیے بھیجا۔ شاعر کے مدیر قبلہ اعجاز صدیقی صاحب نے حوصلہ افزا جملوں کے ساتھ ڈراما 'شاعر' میں شائع کیا مگر میں اس وقت آدھا تیتر آدھا بیٹر تھا۔ اردو لکھنے کی مشق نہ ہونے سے میں ریڈیو اور اسٹیج کے لیے ڈراما دیوناگری لپی میں لکھا کرتا تھا۔ بعد ازاں جب تخلیق چھپنے چھپانے کی بات آئی تو میں نے طے کرلیا کہ مجھے فارسی رسم الخط میں لکھنے کی مشق کرنی ہوگی۔ میرے اس مہم کو سر کرنے میں میرے محسن دوست جناب نجم الثاقب شحنہ اور یار عزیز تنہا تمناپوری نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کر کے اس جدوجہد کو میری سادھنا بنا دیا۔

غ الف: آپ کی پسندیدہ زبان کون سی ہے؟

انل ٹھکر: اللہ کا کرم ہے۔ میں ویسے تو ہندی، گجراتی، مراٹھی، پنجابی، کنڑا ایسی زبانیں جانتا ہوں۔ مگر پچھلے ستر سالوں سے جس اردو زبان کو میں بولتا اور لکھتا آیا ہوں۔ جس زبان میں میں نے عشق کر کے شادی کی۔ اس کو چھوڑ کر اور کون سی زبان میری پسندیدہ زبان ہو سکتی ہے۔ اردو میری رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔

غ الف: اپنے اہل و عیال کے بارے میں بتائیے:

انل ٹھکر: میری شادی 1953 میں ہوئی۔ اسکول آف آرٹس میں وہ میری ہم جماعت تھیں۔ پیار ہوا۔ ہم نے شادی کرلی۔ ترپین سال تک پورے خاندان کو اپنی والہانہ محبت سے شرابور کر کے 2005 میں وہ اس فانی دنیا سے رخصت کر گئیں۔ اولاد میں دو لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی امریکہ میں ہیں۔ بڑا بیٹا میرے ساتھ رہتا ہے۔ بڑی بیٹی بمبئی میں ہے۔ اللہ کے کرم سے سب خوش ہیں۔

غ الف: آپ کے قریبی احباب کون ہیں اور آپ ان کو کیوں پسند کرتے ہیں؟

انل ٹھکر: ہبلی میں گزارے پینسٹھ سال میں احباب کی فہرست میں سب سے اوّل نام آتا ہے۔ میرے استاد (ڈراما میں) جناب محمد ہاشم قلعہ دار (مرحوم)، فاروق لال میاں (مرحوم)، تنہا تمناپوری (مرحوم)، جناب نجم الثاقب شحنہ (مرحوم)، کامل کلادگی، مظہر محی الدین، سلیمان خماران کے نام سرفہرست ہیں۔ ایک انٹرویو میں میں نے کہا تھا۔ اب اس عمر میں احباب کی فہرست میں اضافہ ہونے کی گنجائش نہیں ہے۔ مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ دو سال پہلے لاہور (پاکستان) کے ایک ادبی سیمینار میں جناب گلزار جاوید (مدیر چہار سو، راولپنڈی) مہیندر پرتاپ چاند، ڈاکٹر رینو بہل اور محترمی نندکشور وکرم صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان کی شفقت آمیز دوستی دیکھ کر اس عمر میں جینے اور دوستی کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔ مجھے یہ سب احباب اس لیے پسند ہیں کہ یہ انسان دوست شخصیت کے مالک ہیں۔ یہ دوسروں کو مذہب کی عینک لگا کر نہیں دیکھتے۔ ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ امریکہ چلے گئے۔ وہ جگہ کسی نے پُر نہیں کی۔

غ الف: آپ کن ادیبوں اور شاعروں سے متاثر رہے ہیں؟

انل ٹھکر: میں محترمہ امرتا پریتم، موہن راکیش، ڈاکٹر راہی معصوم رضا صاحب سے متاثر رہا۔ ویسے تو ان ادیبوں کی لمبی

فہرست ہے۔ شاعری میرا موضوع نہیں ہے۔ البتہ چند شعرا ہیں جنھیں میں بڑے شوق اور چاؤ سے پڑھتا اور سنتا ہوں۔

غ الف: اردو ادب کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

انل ٹھکر: اردو ادب اردو زبان کا تہذیبی حصہ ہے۔ یہ زبان سمندر کے مانند ہے۔ یہ اپنی بانہوں میں باہر سے آنے والی ہر زبان کے الفاظ کو اپنے میں سما کر ایک جان کر لیتی ہے اور پھر سمندر کے پانی کی طرح بھاپ بن کر دوسری زبانوں کو تر و تازہ کر رہی ہے، ہندی، گجراتی، مراٹھی، کنڑا ایسی کتنی ہندوستانی زبانیں ہیں جن کو اردو نے لفظی بوندوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ گجراتی اور مراٹھی میں تو ایک عرصے سے غزل بھی لکھی جا رہی ہے۔ اردو دوسری زبانوں سے کم سن ہے۔ جیسے جیسے اس کی عمر بڑھے گی اس کا جاہ وجلال اور بڑھے گا۔

غ الف: آپ نے اب تک کتنے افسانے لکھے ہیں اور وہ کہاں کہاں شائع ہوئے؟

انل ٹھکر: میں نے اب تک قریب قریب پچاس افسانے لکھے ہیں۔ جو بھارت کے تقریباً سبھی معیاری رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ پاکستان میں ابلاغ، افکار، اور چہار سو میں چھپے ہیں۔ میرے تقریباً سبھی افسانے کنڑی زبان میں ترجمہ ہو کر کنڑ کے جانے مانے رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ بلراج ورما دہلی نے افسانوں کے ایک منتخب مجموعے 'تین خط تین زندگیاں' میں میرا افسانہ 'انشاء اللہ' شامل کیا تھا۔ نیا افسانہ (انتخاب) رام لال مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ دہلی نے افسانہ 'سنک' شامل کیا۔ ایوان اردو میں زبیر رضوی نے افسانہ 'موسمی پرندے' شامل کیا۔

غ الف: آپ معاصر افسانہ نگار کے بارے میں کچھ کہیے؟

انل ٹھکر: ترقی پسند افسانہ نویسوں نے اپنی دکان بڑھا دی اس کے بعد اردو افسانے میں بہت ہی سنجیدگی سے تجربے کیے گئے۔ جدیدیت کے نام پر اور روایتی انداز میں بھی اچھا کام ہوا۔ افسانہ نویسوں نے زمانے کے حالات اور واقعات کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا سیکھا۔ کوئی بھی تخلیق کار بدلتے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ افسانہ بھی بدلا ہے، بدل رہا ہے۔ آج کے افسانہ نویس کامیابی سے اپنی جنگ لڑ رہے ہیں۔

غ الف: آپ نے کن کن موضوعات کو اپنے فن کا حصہ بنایا ہے؟

انل ٹھکر: میں افسانہ لکھنے کے لیے کہانی گھڑتا نہیں۔ کسی واقعہ، کردار یا حادثے سے متاثر ہوتا ہوں تو ہی افسانہ لکھتا ہوں۔ اس سے میرے افسانوں کے موضوع بدلتے رہتے ہیں۔ میں نے عازمین حج کے جذبات اور عقیدت پر لکھا ہے۔ عورت کی گھٹتی، ظلم سہتی، زندگی کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ انسانی جذبات، غربت اور ذہنی کش مکش کو موضوع بنایا ہے۔

سوانحی کوائف

نام: چتر بھون ٹھکر

قلمی نام: انل ٹھکر

والدین: ماوجی بھائی، سکر بین

پیدائش: 6 جون 1934، بمقام ورسامیٹری، کچھ (گجرات)

تعلیم: نون میٹرک

شادی: 1953، نام گریجا ٹھکر (آس جہانی)

مطبوعات: تین ڈرامائی مجموعے: (1) خالی خانے 1982، (2) اندھے رشتے (طویل ڈرامہ) 1986، (3) چوتھی دیوار 2006، افسانوں کے مجموعے: (1) گرم برف 1990، (20) موسمی پرندے 1999، (3) صفر ضرب صفر 2007، ناول: اوس کی جھیل 2002، (2) خوابوں کی بیساکھیاں 2008، (3) رشتے 2013، (4) گم شدہ شناخت 2014 (یہ ناول اردو، دیوناگری اور کنڑی میں شائع ہوا ہے)۔

انعامات: 'خالی خانے' کو کرناٹک اردو اکادمی اور یوپی اکادمی نے انعام سے نوازا۔ 'اوس کی جھیل' اور 'خوابوں کی بیساکھیاں' کو Best Book under Fiction کے ایوارڈ سے نوازا۔ اکادمی نے اردو زبان و ادب کے میدان میں گراں قدر خدمات کے لیے 1996 میں روپے 10,000 کے انعام سے نوازا۔ جبکہ افسانوں کی کتابیں کسی اردو اکادمی یا اردو کے اداروں کو ارسال نہیں کی گئی تھیں۔ کرناٹک یونیورسٹی سے ریسرچ اسکالر محمد غوث برچھی والے نے 'انل ٹھکر شخصیت اور فن' پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا ہے۔ 2007 گلبرگہ یونیورسٹی سے محترمہ شمیم ریحانہ نے 'انل ٹھکر بہ حیثیت ڈرامہ نگار' مقالہ برائے ایم فل 2008 میں یونیورسٹی کو پیش کیا۔

غ الف: اردو افسانے کی روایت اور مستقبل کے بارے میں کچھ فرمائیں؟

انل ٹھکر: اردو افسانے کی روایت جو بھی رہی ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ اس کا مستقبل شاندار اور روشن ہے۔ ہمارے نقاد حضرات بیدی، منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر، قرۃ العین جن پر کافی کچھ لکھ کر تنقیدی کتابوں کا ڈھیر لگا دیے ہیں۔ یہ لوگ ماضی سے نظریں ہٹا کر مستقبل کی جانب کب دیکھیں گے، اب یہ حضرات اگر آج کے لکھنے والوں کی تخلیقات پر نظر ڈالیں اور ہمدردانہ سلوک سے ان پر اپنا قلم چلائیں تو افسانے کا معیار اور بلند ہو سکتا ہے۔

غ الف: آپ کو اپنے کون کون سے افسانے بہت پسند ہیں اور کیوں؟

انل ٹھکر: ابھی تو میں تخلیقی سفر میں ہوں۔ جس تخلیق پر میری نظر ٹھہر جائے ایسی چیز میں نے ابھی تک لکھی ہو ایسا مجھے لگتا نہیں۔

غ الف: آپ نے ڈھیر سارے ڈرامے لکھے ہیں اور آپ کے ڈراموں کی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ کیا ڈرامانگاری رو بہ زوال ہے؟

انل ٹھکر: آج بھی اردو ڈرامے لکھے جاتے ہیں۔ کولکاتا، بمبئی، دہلی جیسے شہروں میں اسٹیج بھی کیے جاتے ہیں۔ ڈراما کی کتابیں دوسری اصناف سے کم شائع ہوتی ہیں۔ اس صنف کا تعلق پڑھنے سے زیادہ اسٹیج پر دیکھنے سے ہے۔ اب ٹی وی سیریل کے آ جانے سے چھوٹے شہروں میں ڈراما کھیلنا قریب قریب ختم ہو گیا ہے۔

غ الف: آپ کے ناولوں 'خوابوں کی بیساکھیاں اور گم شدہ شناخت' پر قارئین کی رائے ہے کہ اگر کوئی مسلم ناول نگار مذکورہ ناول لکھتا تو اس کا سر قلم کر دیا جاتا۔ کیا یہ بات صداقت پر مبنی ہے؟

انل ٹھکر: حقیقت سے اس کا کوئی واسطہ ہو ایسا میں نہیں مانتا۔ یہ سوچ آج کے ماحول سے خوف زدہ ذہن کا عکس ہے۔ میرے ان ناولوں کی ہر جگہ سے پذیرائی ہوئی ہے۔ خوابوں کی بیساکھیاں ناول کا ہندی اور کنڑ زبان میں ترجمہ ہوا ہے اور اس ترجمے کو کرناٹک ساہتیہ اکادمی نے اوارڈ سے بھی نوازا ہے۔

غ الف: آپ کو فن مصوری سے بھی دل چسپی رہی ہے۔ آپ نے پہلی تصویر کون سی بنائی؟ اور ابھی تک آپ کی مصوری کے کون سے نمونے سامنے آئے ہیں؟

انل ٹھکر: اسکول میں داخلہ لینے والا انو وار دالف بے سے شروع کرتا ہے۔ میں نے فن مصوری سیکھنے کے لیے لکیر کھینچ کر ابتدا کی تھی۔ مصوری میں نے شوق کے خاطر سیکھی۔ البتہ 1972 میں میں نے اپنی پینٹنگس کی نمائش دہلی میں کی تھی۔ میں نے زیادہ تر لینڈ اسکیپ پر کام کیا ہے۔

غ الف: آپ مصوری میں کس سے متاثر ہیں؟ اور کس مصور کو پسند کرتے ہیں؟

انل ٹھکر: میں ریمبرینٹ سے متاثر رہا، ویسے پسندیدہ مصور بہت سے ہیں۔

غ الف: آپ ایک اداکار بھی ہیں۔ وہ کون سی فلمیں، ٹی وی سیریلس اور ڈرامے ہیں جن میں آپ نے اداکاری کے جلوے دکھائے ہیں،

انل ٹھکر: میں نے جناب گریش کارناڈ کی فلم وندانو وندکال دلّی، کانور کی ٹھکرائن، جناب ٹی۔ ایس۔ رنگا کی فلم

ساوتری، ترکن کتھے، شنکر ناگ کے ٹی وی سیریل مال گڈی ڈیز، جناب ناگا بھرنا کے سیریل تنالی راما، کانورن ہیگڑتی، پروفیسر واسن اور چند اور سیریلس میں اداکاری کی ہے۔

غ الف: آپ کس فلم، سیریل یا ڈرامے کے ہدایت کار ہیں، ہدایت کاری کے تجربے کو آپ کیسا محسوس کرتے ہیں؟

انل ٹھکر: میں نے کسی فلم یا سیریل کی ہدایت کاری نہیں کی۔ پینتیس سال اردو، ہندی، کنڑ اڈراموں کی ہدایت کاری کی ہے۔ ڈرامے کا فن فرد واحد کا فن نہیں ہے۔ یہ ایک ٹیم ورک ہے۔ ٹیم کا رہنما ہدایت کار ہوتا ہے۔ ٹیم کے رہنما کو اداکاری، موسیقی، سیٹنگس، لائٹس، ان فنون کی جانکاری لازمی ہوتی ہے۔ ان سب کی شمولیت سے ایک کامیاب ڈراما تیار ہوتا ہے۔ ہدایت کاری ایک جنون ہے۔ ہدایت کاری کوئی آسان کام نہیں ہے۔

غ الف: کوئی قابلِ ذکر واقعہ بتائیے جو آپ کے ساتھ گزرا ہے؟

انل ٹھکر: ویسے تو قابل ذکر واقعات بہت میرے ساتھ گزرے ہیں مگر میں آپ کو وہ واقعہ سناتا ہوں جس کا تعلق میرے ادب سے ہے، جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ کردار جن سے میں ملا ہوں۔ ان سے مل کر ان کے سکھ دکھ اور حوصلوں سے متاثر ہوا ہوں ان پر ہی قلم اٹھاتا ہوں۔ میرا پہلا ناول 'اوس کی جھیل' کی ساوتری سے میری ملاقات بنگلور جاتے وقت ٹرین میں ہوئی تھی۔ پسنجر ٹرین کا tier 3 کا ڈبہ تقریباً خالی تھا۔ میرے سامنے کی برتھ پر ایک بزرگ اور ایک جوان خوبصورت عورت آ کر بیٹھے۔ میں نے سوچا، باپ بیٹی یا خسر اور بہو ہوں گے۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ میں ان دونوں کو گھریلو باتیں کرنے کے لیے تنہا چھوڑ کر اوپری برتھ پر لیٹ گیا۔ کافی دیر کے بعد میں نے کروٹ لی۔ نیچے دیکھا تو مجھے محسوس ہوا، ان کا رشتہ وہ نہیں ہو سکتا جو میں نے سوچا تھا۔ میں تماشا دیکھتا رہا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا اس میں عورت ساجھے دار نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف مرد ہی عورت کے بدن کے لمس کا لطف اٹھا رہا تھا۔ رات نو بجے کے قریب ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ وہ بزرگ کچھ کھانا لانے نیچے اُترا۔ میں بھی اپنی برتھ سے نیچے آیا۔ موقع دیکھ کر میں نے اس عورت سے کہا۔ ''آپ مجھے اپنا ہمدرد، بھائی کچھ بھی سمجھیں۔ میں نے سب کچھ دیکھا ہے۔ آپ کی بے بسی کو محسوس کیا ہے۔ کیا، میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟'' عورت نے میرے چہرے کو پڑھا۔ جواب دیا۔ وہ جواب سن کر میرا وجود دہل گیا۔ اس نے کہا ''آپ اپنی نیند خراب نہ کریں۔ یہ آدمی چاہے تو بھی اس کی عمر اسے اس سے زیادہ کچھ کرنے نہیں دے گی۔ یہ ہمارے علاقہ کا ایم۔ ایل۔ اے ہے۔ میرے شوہر کی رضامندی سے اس کی ترقی کے لیے منسٹر صاحب کے پاس یہ مجھے لے جا رہا ہے۔ یہ تو پجاری ہے۔ صرف پرساد چکھ رہا ہے۔ میرا بھگوان تو بنگلور میں ہے۔ میرا بھوگ تو کل منسٹر صاحب لگائیں گے۔ وہاں آپ کی پہنچ ممکن نہیں۔'' میں آج بھی ان الفاظ کو نہیں بھول پایا۔ کئی مہینوں تک سوچتا رہا۔ اس روز کے بعد اس عورت کا کیا ہوا ہوگا، آگے مستقبل میں اس کی زندگی کیسی گزرے گی؟؟ میں نے اس موضوع پر ڈراما لکھا۔ 'اکھڑے لوگ' کنڑی میں اس کا ترجمہ ہوا۔ دونوں زبانوں میں کامیابی کے ساتھ اسٹیج ہوا۔ مگر میں مطمئن نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا۔ یک بابی ڈراما اس موضوع کے لیے چھوٹا کینواس ہے۔ میں نے اسے ناول کے سانچے میں ڈھالا۔

اردو زبان و ادب میں غیر مسلم ادیبوں کی تعداد کم ہونے کی بڑی وجہ ملک کا بٹوارہ ہے۔ صدیوں کے بھائی چارے میں سیاست دانوں نے ایسی نفرت گھول دی ہے جو ذہن و دل سے ہوتی ہوئی زبان و ادب تک پھیل گئی۔ آج بھی دونوں فرقوں میں ایسے لوگ ہیں جو اردو کو ایک فرقہ اور مذہب کی زبان ثابت کرنے کو کوشاں ہیں۔ مگر یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ نئی نسل کو اردو زبان کا ذائقہ لگ چکا ہے۔ آج غیر مسلم لڑکے، لڑکیاں آپس میں اکثر اردو میں گفتگو کرتے سنائی پڑتے ہیں۔ (جسے وہ ہندی سمجھتے ہیں) بولنے والے نظر آرہے ہیں تو سیکھنے والے بھی پیدا ہوں گے۔

غ الف: ہندوستانی تہذیب کو آپ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

انل ٹھکر: ہندوستانی تہذیب مہاساگر (Ocean) ہے۔ اس میں جانے کتنی تہذیبوں کا سنگم ہوا ہے۔ اس کی آشنا مزاجی نے اسے گنگا جمنی تہذیب کا حقدار بنایا ہے۔

غ الف: کس حد تک آپ مسلم تہذیب سے متاثر رہے ہیں؟

انل ٹھکر: مسلم تہذیب سے میں اکثر متاثر ہوں اس کا اندازہ آپ اس سے لگالیں کہ میرے منہ سے جاگتے میں یا نیند میں پہلے اللہ کا نام نکلتا ہے۔ پھر بھگوان کا۔ اللہ کو یاد کر کے رحم کی بھیک مانگتا ہوں۔ بھگوان سے دَیا کی گہار لگاتا ہوں۔

غ الف: اردو زبان کی رگوں میں قومی یکجہتی کے عناصر پائے جاتے تھے، آپ کا کیا خیال ہے؟

انل ٹھکر: اردو زبان کی رگوں میں آج بھی قومی یکجہتی کے عناصر رواں ہیں۔ بغیر اس کے یہ زبان کھوکھلی ہو جائے گی۔

غ الف: انل ٹھکر صاحب! ایک عہد وہ تھا جب اردو زبان و ادب میں غیر مسلم ادیبوں کی لمبی فہرست ہوا کرتی تھی۔ آج کیا وجہ ہے کہ غیر مسلم ادیبوں کی فہرست ترتیب دینے کے لیے ہاتھوں کی انگلیاں زیادہ ہو جاتی ہیں۔ آپ ان تمام باتوں کو کس انداز سے سوچتے ہیں؟

انل ٹھکر: اردو زبان و ادب میں غیر مسلم ادیبوں کی تعداد کم ہونے کی بڑی وجہ ملک کا بٹوارہ ہے۔ صدیوں کے بھائی چارے میں سیاست دانوں نے ایسی نفرت گھول دی ہے جو ذہن و دل سے ہوتی ہوئی زبان و ادب تک پھیل گئی۔ آج بھی دونوں فرقوں میں ایسے لوگ ہیں جو اردو کو ایک فرقہ اور مذہب کی زبان ثابت کرنے کو کوشاں ہیں۔ مگر یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ نئی نسل کو اردو زبان کا ذائقہ لگ چکا ہے۔ آج غیر مسلم لڑکے، لڑکیاں آپس میں اکثر اردو میں گفتگو کرتے سنائی پڑتے ہیں۔ (جسے وہ ہندی سمجھتے ہیں) بولنے والے نظر آ رہے ہیں تو سیکھنے والے بھی پیدا ہوں گے۔ جن میں سے لکھنے والے بھی وارد ہوں گے ہی۔

غ الف: کیا آپ کو ایسا احساس ہوتا ہے کہ آپ نے اردو ادب میں بہت کام کیا مگر قومی سطح کے بڑے اعزاز سے محروم ہیں؟

انل ٹھکر: ادب کا سفر کسی بھی سطح کے اعزاز کی آس کے سہارے طے نہیں کیا جا سکتا۔ 1980 سے میری تخلیقات شائع ہو رہی ہیں۔ اب تو اتنی دور نکل آیا ہوں کہ اعزاز کا خیال ہی نہیں آتا۔ لکھنے سے جو روحانی سکون ملتا ہے اس کی چاہ کا خمار ہی سب سے بڑا اعزاز ہے۔ دعا کریں۔ یہ چاہ بنی رہے۔ یہ خمار آخری دم تک قائم و دائم رہے۔

غ الف: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی خدمات کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

انل ٹھکر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ہر اعتبار سے اپنا کام اردو کے فروغ کے لیے پوری ایمانداری، خلوص اور جوش و خروش کے ساتھ انجام دے رہی ہے۔ جس کی خدمات کا اثر پورے ملک میں نمایاں ہو رہا ہے۔

غ الف: اردو پڑھنے والی نئی نسل کے لیے آپ کا پیغام؟

انل ٹھکر: عزیز! پیغام دینا بڑے لوگوں کا کام ہے۔ میں تو اردو زبان و ادب کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ میں کیا اور میرا پیغام کیا!!

■

Dr. Ghazanfar Iqbal, 'Saiban' Zubair Colony, Hagarga Cross, Ring Road, Gulbarga - 585104 (K.S)
Anil Thakkar, A-1, Shambhu Apartments, 38, Adarsh Nagar, Hubli - 580032 (K.S)

ہندوستان کی آزادی اور اردو نظم

بلال احمد میر

ایک حکیم کا قول ہے کہ آزادی، ضرورتوں کو محسوس کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اس قول میں کچھ مبالغہ ہوتو ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہماری دنیوی ضرورتوں اور آزادی کے تصور میں بہت فرق ہے۔ مختلف لوگوں کی آزادی مختلف رنگوں سے مزیّن ہوتی ہے۔ انگریزی راج 1857 سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے ہم کو اپنی غلامی کا احساس نہ ہوا تھا اور نہ ہی ہم نے اس کی نوعیت پہچانی تھی۔ لیکن زندگی کی ضرورتوں نے جلد ہی بتا دیا کہ کوئی چیز ہم سے چھین لی گی ہے۔ ہم نے کوئی چیز کھو دی ہے۔ اسی احساس زیاں نے آزادی کا دھندلا سا خاکہ بنایا۔ لیکن برسوں تک یہ خاکہ، خاکہ ہی رہا۔

ہندوستانی ادب بالخصوص ہندوستانی شاعری پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت اور واضح ہو جاتی ہے کہ آزادی کے موجودہ تصور تک پہنچنے میں جتنے زینے ہندوستانی سماج نے طے کیے اتنے ہی ہمارے ادب نے بھی طے کیے ہیں۔

اردو شاعری میں آزادی کے تصوّر ہی کو لیجیے زندگی کا احساس جس رفتار سے بڑھا ہندوستانی سماج میں حرکت اور بیداری کی لہریں جس تیزی سے آئیں اسی رفتار اور تیزی سے اردو شاعروں کے لیے آزادی کا تصوّر بدلا۔

غدر کے فوراً بعد سب سے پہلے نظم کی طرف محمد حسین آزاد نے توجہ دی۔ وہ بھی انگریزوں کے زخم خوردہ تھے۔ اس بارے میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں کچھ پرچے محفوظ ہیں۔ ان میں سے 24 مئی 1857 کے پرچے میں آزاد کی معرکہ آرا نظم، 'تاریخ عبرت افزا' درج ملتی ہے۔ آزاد کی وطن دوستی کے سلسلے میں یہ نظم خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس نظم میں 1857 کی جنگ میں مسلمانوں کی ناکامی پر آنسو بہائے گئے ہیں۔ لیکن ان کی ایک اور نظم حب وطن میں تمام اہل وطن سے خطاب کیا گیا ہے:

اے آفتاب صبح وطن تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ بھی نہیں آتا ہے نظر
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں تیرے جوش ہوگئے
کیوں سب تیرے چراغ ہیں خاموش ہوگئے

حالی نے دوسری طرف ادبی موضوعات میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے اردو شاعری کے لیے کچھ نئی سمتیں متعین کیں۔ شاعری میں نازک خیالی کے مقابلے میں حقیقت نگاری پر زور دیا۔ اُن کی نظموں نے

اکبرالہ آبادی

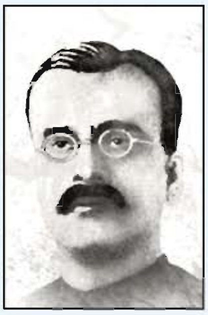
چکبست

ظفرعلی خان

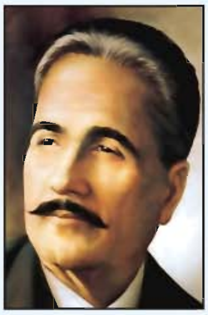
اقبال

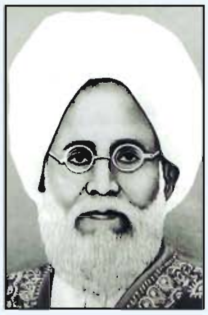
شبلی نعمانی

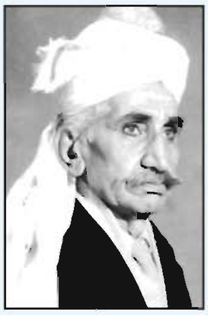
تلوک چند محروم

باہمی اتحاد اور یگانگت کی ترغیب دی:

اترو دریا سے اپنے بل تیر کے پار
کب تک تیرو گے ہو کے تونبوں پہ سوار
تم ڈوبنے کے کر رہے ہو سامان
دوسرں کا سہارا تکنے والو ہوشیار
ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

حالی کی نظموں نے قوم کے جمود کو حرکت، تنگ نظری کو کثرت نظارہ اور نشیب کو فراز میں بدلنے کا اصول سکھایا، 'وطن کی محبت' بھی اسی موضوع پر لکھی گئی نظم ہے، جس میں آزادیِ وطن اور حرّیت کا جذبہ کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے:

اے وطن! اے مری بہشتِ بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان وزمیں

اردو شعرا نے سامراجی حکومت کے ہر اس اقدام کی مخالفت کی جس سے ہندوستانیوں کو نقصان پہنچتا تھا۔ سرور جہاں آبادی نے بنگال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

آہ! اے بنگال آلام ومصائب کے شکار!
آہ! اے کرزن کی پالیسی کے صید بے قرار

——

تیرے پھولوں میں ہے عالم زخم دامن دار کا
خوں رُلاتی ہے نگاہ شوق کو تیری بہار

ملک میں جب،، سوراج سودیش اور بائیکاٹ ،مہم کا آغاز ہوا تب بھی اردو شعرا نے اپنی تخلیقات کی مدد سے عوام کے دلوں میں حرکت پیدا کر دی۔ غلامی کے احساس نے اتحاد کی ضرورت کو شدید تر کر دیا۔ قومی ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو کر اردو شعرا نے ان تحریکوں کو موضوع سخن بنایا۔ ظفر علی خان کی نظموں سے ان تحریکوں کے اہم پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے:

وطن کو میں چمنستاں بنا کے چھوڑوں گا
اور اس کی صبح کو خنداں بنا کے چھوڑوں گا
ہر ایک وقت کے دارا کو اور سکندر کو
میں اپنے قصر کا درباں بنا کے چھوڑوں گا
لہو شہید کا لوں گا اور اس کی سرخی کو
میں غازۂ رخِ ایماں بنا کے چھوڑوں گا
(طاقتِ ایمان)

ہندوستان بھی ان کی ایک اہم نظم ہے جس میں آزادی کا جذبہ گہرائی سے سرایت کر گیا ہے۔

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

——

وقت آپہنچا کہ یا مر جاؤ یا آزاد ہو!
تخت یا تختہ ہے حکمِ تاجدارِ انقلاب

سوراج کو حاصل کرنے کے لیے امام الدین خان راقب نے اپنی نظموں میں یہ لب ولہجہ استعمال کیا ہے:

سوراج کی پڑی ہے تو پیچھے پڑے رہو
منزل اگر کڑی ہے تو تم بھی کڑے رہو
جو کام ہو سکے وہ کرو قوم کے لیے
جس جس جگہ ہو تم وہیں جم کر کھڑے رہو

منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے 'سدیشی تحریک' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی جو قومی آزادی کے جذبے سے بھرپور ہے:

گھر اپنے کی جو چیز ہو وہ کچھ بھی نہیں ہے مال
بیکار ہے وہ خواہ ہو کشمیر ہی کا شال

آزادی کی راہ میں فرقہ پرستی ایک رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ قوم کو ایک مرکز پر متحد ہونے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی نے بہ صد اصرار شر پسندوں کے مخالفانہ رویّوں کے خلاف احتجاج کرنے کی ترغیب دی ہے۔

انھوں نے 'جنگ یورپ اور ہندوستانی' نظم بھی رقم کی ہے جس میں آزادی کی خوشبو مہکتی ہے:

اک جرمنی نے مجھ سے کہا ازرہِ غرور
آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں

——

سنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور
پھر وہ کہاں جو لائق اظہار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں ہے

آزاد، حالی اور اسمٰعیل کے کلام میں حب وطن کا بہت ابتدائی تصور پایا جاتا ہے۔ اس میں آزادی کے نقوش شاذ ہی نظر آئیں گے۔ قوم نے ایک اور انگڑائی لی تو حب وطن کے اسی خام تصور کے بطن سے آزادی کا وہ تصور پیدا ہوا جو اقبال، چکبست اور ابتدائی بیسویں صدی کے دوسرے شاعروں کے کلام میں جھلکتا ہے۔

ہوم رول تحریک جب ہندوستان گیر صورت اختیار کر چکی تھی۔ حکومت نے اس تحریک کے رہنماؤں کو جیلوں میں بند کرنا شروع کیا۔ اردو شعرا نے اس وقت بھی عوام میں ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے نظمیں لکھیں:

اہلِ وطن مبارک تم کو یہ بزم اعلا
جس میں نئی امیدوں کا ہے نیا اجالا
دنیا کے مذہبوں سے یہ رنگ ہے نرالا
مسجد یہی ہے اپنی اور ہے یہی شوالا
ہو، ہوم رول حاصل ارمان ہے تو یہ ہے
اب دین ہے تو یہ ہے، ایمان ہے تو یہ ہے
(چکبست)

جب خلافت تحریک چلی تب مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہزاروں مسلمانوں نے خلافت تحریک میں شرکت کی ہندوستانی سیاست میں ہندو مسلم اتحاد کا سب سے شاندار مظاہرہ اس وقت ہوا۔ اردو شعرا نے اسی زمانے میں کئی معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام ونشاں کب تک
(شبلی نعمانی)

خلافت وقار کی عظمت حفاظت اور مشترکہ مقصد کے تحت ہندو مسلمان کو ایک قومی جھنڈے کے نیچے متحد کرنے کے لیے اردو شعرا نے پر جوش اور ولولہ انگیز نظمیں پیش کی:

اگر حق سے تم کو ہے کچھ بھی لگاؤ
تو باطل کے آگے نہ گردن جھکاؤ

1919 میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ کا حادثہ جب پیش آیا۔ تب بھی اردو شعرا کا قلم خون میں ڈوبتا ہوا دکھائی دیتا ہے:

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہیداں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

(اقبال)

جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خوں کی
قصر آزادی کی آرائش کا ساماں ہوگئیں
زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قربان ہوگئیں

(ظفر علی خان)

میلہ سجھ کے باغ میں داخل ہوا کوئی
جمگھٹ عجیب جان کے شامل ہوا کوئی
نکلا تھا کوئی لوٹنے فصلِ بہار کو
آغوش میں لیے تھا کوئی شیر خوار کو
ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا
لو ہو سے لال دامن برطانیہ کیا

(تلوک چند محروم)

مارشل لا جیل خانہ، پھانسی اور حبسِ دوام
بندش نظر و زباں کیا کیا نہیں ایجاد کی
غرق ہوگا خود ستم گر گر کے خون ہند میں
سرخ مچھلی بن کے تیرے گی چھری جلاد کی

(سید مہدی حسن)

تحریکِ خلافت کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد سے قومی جدوجہد میں بڑی وسعت اور شدت آگئی تھی۔ حسرت اس زمانے میں اتحاد واخوت کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

کاغذ کے تھپے پھول ان کو
جن میں نہیں نام کو بھی خوشبو

اے ہندی سادہ دل، خبردار!
ہرگز نہ چلے یہ تجھ پر جادو

(مانٹیگو رفارم)

1921 میں کانگریس کے احمد آباد اجلاس میں حسرت نے کانگریس کا نصب العین 'مکمل آزادی' قرار دینا چاہا جس کو منظوری نہیں دی گئی تو حسرت نے کانگریس ہی چھوڑ دی۔ کچھ اشعار اس سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں جو اُن کی اولعزمی کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں:

اپنا سا ذوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم زباں سے ہم
کچھ ایسی دور بھی تو نہیں منزلِ مراد
لیکن یہ جب کہ چھوٹ چلیں کارواں سے ہم

سچ یہ کہ حسرت موہانی نے اپنی زندگی جدوجہد آزادی کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ صرف اور صرف آزادیِ ملک کے خواہاں تھے کسی منصب کے نہیں۔ وہ بیک وقت نڈر سیاست دان، شاعر، ادیب، صحافی اور نقاد تھے انھوں نے کئی نظمیں آزادی کے نام لکھیں۔ جیسے 'جورِ غلامانِ وقت' ہے۔ ان کی 'نجاتِ ہند' بھی آزادی کے جذبے سے لبریز ہے۔

جب انگریزوں نے ہندوستانیوں کی وفاداری کا صلہ انھیں رولٹ ایکٹ کی صورت میں دیا اور جلیان والا باغ کے حادثے کے بعد ہندوستانی اپنی آپسی تفریق بھول گئے اور ملک کا چپہ چپہ آزادی کے نعروں سے گونجنے لگا، اکبرالہ آبادی بھی دل کے ہاتھوں یہ کہنے پر مجبور ہو گئے:

سچ یہ کہ حسرت موہانی نے اپنی زندگی جدوجہد آزادی کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ صرف اور صرف آزادی ملک کے خواہاں تھے کسی منصب کے نہیں۔ وہ بیک وقت نڈرسیاست دان، شاعر، ادیب، صحافی ا ور نقاد تھے انہوں نے کئی نظمیں آزادی کے نام لکھیں۔ جیسے 'جورغلامانِ وقت' ھے۔ ان کی 'نجاتِ ہند' بھی آزادی کے جذبے سے لبریز ھے۔

نگرانیِ مراحل کبھی ایسی تو نہ تھی
تند موجِ لبِ ساحل کبھی ایسی نہ تو تھی
بدگمانی تری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی
بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

(اکبر الہ آبادی)

مولانا محمد علی کا پیغام آزادی ترقی اور مادی و روحانی سر بلندی کا ہے۔ ان کی شاعری میں عاشق کے دل کی دھڑکنیں اور جہادِ آزادی کے سپاہی کی امنگیں کچھ اس انداز سے مل جل گئی ہیں کہ اس کی دوسری نظیر اس عہد میں نہیں ملتی ملاحظہ ہو:

طاقت پرواز ہی جب کھو چکے
پھر ہوا کیا گر ہوئے بھی پر کھلے
چاک کر سینے کو پہلو چیر ڈال
یوں ہی کچھ حالِ دلِ مضطر کھلے

(ردِ سحر)

صفی، سیماب، شاد عظیم آبادی نے اگرچہ غزلوں میں بالواسطہ اور بلاواسطہ وطنی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن شاد عظیم آبادی کی نظمیں 'ترانہ اتحاد' اور 'خواب وطن' قومی تحریک سے گہری وابستگی کا پتہ دیتی ہیں۔

چنانچہ بے انصافی ہوگی اگر اس دور کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے 'کاکوری کیس' کے ملزمین اشفاق اللہ خان اور رام پرساد بسمل کے اشعار اور اس غزل کا ذکر نہ کیا جائے جو بچے بچے کی زبان پر تھی اور جو آج اجتماعی حافظے کا حصہ بن چکی ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت اب دلِ بسمل میں ہے

اردو کی ضبط شدہ نظمیں کے مرتبین نے اس غزل کو اخبار 'بندے ماترم' 1929 کے حوالے سے رام پرساد بسمل کے نام سے منسوب کیا ہے اور بالعموم یہی مشہور ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ بسمل عظیم آبادی کی غزل ہے۔ اب تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ یہ غزل بسمل عظیم آبادی کی ہی ہے جو اس وقت برطانوی حکومت کے خوف سے روپوش ہو گئے تھے اور رام پرساد بسمل سے منسوب ہونے پر مطمئن تھے کہ چلو جان بچی۔

اردو ادب میں انسان دوستی، حب الوطنی، سامراج دشمنی اور آزادی کا جذبہ پہلے بھی موجود تھا۔ لیکن 35-1934 میں جب دنیا دوسری جنگِ عظیم کا بھیانک خواب دیکھ رہی تھی۔ تب ہندوستان کی تحریک آزادی کا پر جوش اور ولولہ بھرا ہوا جذبہ اردو شعرا نے اپنی نظموں کے ذریعے عوام تک پہنچایا۔ اسی لیے فیض احمد فیض نے اپنی نظموں میں آزادی کا فلسفہ اس طرح پیش کیا:

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پر مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رولیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

(تسلی)

فراق نے بھی اسی زمانے میں آزادی کے آتشِ شوق کو تیز سے تیز کرنے میں وقت کا ساتھ دیا۔ آزادی کے گیت

گائے اور راہ کی مشکلوں کو گوارا بنانے کے لیے صبح آزادی کی بشارت دی اور اپنی غزلوں کے علاوہ نظموں کو بھی آزادی کے جذبے سے سرشار کیا۔ مثلاً:

حسن ماضی سے جو لپٹا ہے وہ سودائی ہے
کہ بدل جانے کی دنیا نے قسم کھائی ہے
داستاں اپنی ہی تاریخ نے دہرائی ہے
ہو خبر تجھ کو تو، ہوتی بھی یہی آئی ہے
انقلاب اور کسے کہتے ہیں یہ رنگ بھی دیکھ
زندگی موت کو بھی ساتھ لگا دیتی ہے

(زمانے کا چیلنج)

اشتراکیت نے اگر ساری دنیا کو اپنی مٹھی میں لے لیا تھا تو اردو شاعروں نے بھی اپنی شاعری کو اشتراکیت کا مبلّغ بنا دیا۔ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے سامراج کے خاتمے اور آزادیِ وطن کا پیغام دیا، جو عام آدمی کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ مثلاً:

نہیں سہل آزادیِ ہند یارو
ابھی تم کو میداں میں آنا پڑے گا
ابھی امتحاں تم کو دینا پڑے گا
ابھی تم کو جیلو ں میں جا نا پڑے گا
ابھی جسم ہوں گے لہو، پتھروں سے
ابھی زخم سینے پہ کھانا پڑے گا
بہت سے کڑے مرحلے راہ میں ہیں
یہ طے کر کے منزل تک آنا پڑے گا

(کڑے مرحلے: احمق پھپھوندی)

مجاہدینِ صف شکن، بڑھے چلو بڑھے چلو
روش روش، چمن چمن، بڑھے چلو بڑھے چلو
جبل جبل، دمن دمن، بڑھے چلو بڑھے چلو
بکش بکش، بزن بزن، بڑھے چلو بڑھے چلو
مجاہدینِ صف شکن، بڑھے چلو بڑھے چلو

(ترانہ جہاد: احسان دانش)

ہوشیار اے ہند! اے غفلت شعاروں کے دیار
نالہ برلب ہیں ترے الجھے ہوئے لیل ونہار

(ناقوس بیداری: احسان دانش)

جس چمن میں چھائی رہتی تھی خزاں
وہ بہار بے خزاں ہو جائے گا
دور ہو جائیں گی سب تاریکیاں
مطلقاً روشن جہاں ہو جائے گا

(فوق)

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن
ابھی ان کو غلام آباد میں میں گا نہیں سکتا
ابھی ہندوستاں کو آتشیں نغمے سنانے دو
ابھی چنگاریوں سے اک گل رنگیں بنانے دو

(مجبوریاں: سلام مچھلی شہری)

1936 وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کا ذرّہ ذرّہ بے چینی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ 1936 کے بعد سیاسی آزادی کے معنی معاشی آزادی کے ہو گئے تھے۔ 1939 میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوگئی سامراجیوں نے ہندوستانیوں کو زبردستی اس جنگ کی آگ میں جھونکنے کی کوشش کی چنانچہ انگریزوں نے فرقہ وارانہ آگ کو بڑھاوا دیا۔ جس سے قوم کے بٹ جانے کا خدشہ پیدا ہوگیا۔ مگر اس دور کی شاعری کا مقصد عوام میں قومی اتحاد کے جذبے کو مستحکم بنانے کے لیے اردو شعرا آزادی وطن کو مرکزِ خیال بنا کر عوام کو متحد ہونے کی اپیلیں کیں:

جوانو! از سرنو برسر پیکار ہو جاؤ
جہاد سرفروشی کے لیے تیار ہو جاؤ

(یحییٰ اعظمی)

1936 وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کا ذرّہ ذرّہ بے چینی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ 1936 کے بعد سیاسی آزادی کے معنی معاشی آزادی کے ہو گئے تھے۔ 1939 میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی سامراجیوں نے ہندوستانیوں کو زبردستی اس جنگ کی آگ میں جھونکنے کی کوشش کی چنانچہ انگریزوں نے فرقہ وارانہ آگ کو بڑھاوا دیا۔

یہ جنگ ہے جنگ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی مجبوروں کی
ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم
خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم

(مخدوم)

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ
باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ
کیوں ٹمٹما رہی ہے یہ پھر شمع زندگی
پھر کیوں نگارِ حق پہ ہیں آثار بیوگی

(مخدوم)

ساغر نظامی نے بھی اپنی شاعری میں آزادی کے جذبے کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا۔ ان کی نظم 'عہد' آزادی کی جذبے سے لبریز ہے جس کا ایک بند بہت ہی انقلابی ہے:

اے جوانو، نوجوانو توڑ دو ہندزار غلامی
خوش جمالو، نو نہالو پھینک دو سر سے بار غلامی

(ساغر نظامی)

جوش ملیح آبادی نے بھی سامراجیوں کے جبر وتشدد اور ہندوستانیوں کی لاچاریوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے کئی نظموں کو جذبۂ آزادی کا جامہ اس طرح پہنایا۔ ان میں 'شکست زنداں کا خواب'، 'وطن' اور 'لمحۂ آزادی'' قابل ذکر ہے

سنو اے بستگان زلف گیتی، ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر، غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

آزادی کی اس نئی صبح تک پہنچنے کے لیے روش صدیقی نے بھی آزادی کے جذبات کو اپنی نظموں میں اس طرح پیش کیا ہے:

انقلاب! اے ساکنان ارض مشرق انقلاب
وقت آیا ہے کہ اٹھے روئے گیتی سے نقاب
انقلاب! اے ساکنان ارض مشرق انقلاب

(بیداری مشرق)

سکندر علی وجد نے نئے ارادوں کے راز کو عام کیا۔ سیم وزر پر جان دینے والوں کو وطن پر نثار ہونے کی تلقین کی اور عوام کو 'صبح نو' کے آثار سے آگاہ کیا۔

شمیم کرہانی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں میں تحریکِ آزادی کی بے چین روح کو پورا اتار لینے میں کامیابی حاصل کی۔ 'قصر زرنگار' شمیم کرہانی کی بہترین نظم ہے لہجے میں خلوص اور دردمندی ہے۔ یہ پوری نظم تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے:

ہر کام کے نغمے گاتے ہیں، بے کار ترانہ کیا جانیں
ہم جنگ میں سر اسے دیتے ہیں، ہم پاؤں ہٹانا کیا جانیں
ہم عہد جوانی کے ماتے، بوڑھوں کا زمانہ کیا جانیں
لکھا ہے ہماری جبینوں پر، ہم سر کو جھکانا کیا جانیں

(قومی گیت: قومی سپاہی کی زبان سے)

امن لکھنوی نے سنہ بیالیس کی تحریک سے متاثر ہو کر اپنی نظم 'کارواں ومنزل' لکھی۔ کیفی اعظمی نے 'آخری مرحلہ' میں قومی جدوجہد کے اس موڑ کی بڑی موثر تصویر کھینچی اور وطن کے ساونتوں کو نفاق کے خطروں سے آگاہ کرتے ہوئے انھیں آخری مجاز فتح کرنے کی دعوت دی۔

1942 میں جب انگریزوں نے سر اسٹیفورڈ کریس

کو ہندوستانیوں کو برائے نام والی اسکیم پیش کرنے کے لیے بھیجا تب ہندوستانیوں کو سامراجیوں کے اس چکمے اور امن و آزادی کے ڈھونگ کا پردہ فاش کرتے ہوئے اردو شعرا نے عوام کو مذہب وملت، رنگ ونسل، فرقہ واریت اور صوبے واریت کے تفرقات مٹا کر متحد ہونے اور کندھے سے کندھا ملا کر غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالنے کے لیے للکارا سردار جعفری کی ایک مشہور نظم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو
اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
کسانو اٹھو کامگارو اٹھو
نئی زندگی کے شرارو اٹھو

اس اثنا میں گاندھی جی نے عوام کو 'تخت یا تختہ' یعنی ''کرو یا مرو'' کے زریں اصول پر عمل پیرا ہونے کا مشورہ دیا عوام نے متحد ہو کر سامراجی حکومت کے خلاف 'بھارت چھوڑ و' Quit India کا نعرہ لگایا۔ اب عوام سرکاری دفتروں پر جھنڈا لہرانے لگے اور فضا قومی نعروں سے گونج اٹھی۔ اس سازگار ماحول میں اردو شعرا نے عوام کو تعصب اور تنگ نظری سے بالا تر ہو کر ایک ایسی نئی دنیا کی بشارت دی جس میں انسانی ہمدردی سے معمور وسیع المشرب اور روادار انسان بستے ہوں:

ایک دو کیسے لاکھ ہزار   کون کرے ان کا شمار
ابل پڑے سگرے نرناری   ایکا ہے ان کا ہتھیار
گھبرائی گوری سرکار
بھارت جاگا مچی سرکار
(سید مطلبی فرید آبادی)

جلال آتش وبرق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام سے ہے زلزلوں کا زور یہاں
ہر ایک گام پہ اک انقلاب پیدا کر
(نوجوان سے: اسرار الحق مجاز)

میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
جو شانے پر بغاوت کا علم لے کر نکلتے ہیں
کسی ظالم حکومت کے دھڑکتے دل پہ چلتے ہیں
میں ان کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
جو آزادی کی دیوی کو لہو کی بھینٹ دیتے ہیں
صداقت کے لیے جو ہاتھ میں تلوار لیتے ہیں
(جاں نثار اختر)

آزاد انصاری نے اپنی نظم 'پیغام وطن' میں طبقۂ حکام کی خبر لی اور ان کی حکومت نوازی پر چوٹ کرتے ہوئے پوچھا ہے:

لب پہ آہِ سرد بھی ہے یا نہیں
دل میں قومی درد بھی ہے یا نہیں

ہندوستان کا قومی مشہور نعرہ 'جے ہند' اسی زمانے میں مقبول ہونا شروع ہوا تھا۔ تلوک چند محروم اپنی نظم 'سحر نو' میں اسی زمانے کا نقشہ دکھاتے ہوئے کہتے ہیں:

''جے ہند'' کے نعروں سے فضا گونج رہی ہے
''جے ہند'' کی عالم میں صدا گونج رہی ہے
یہ ولولہ یہ جوش یہ طوفان مبارک
ہر آن مبارک!

1945 میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ ہندوستان کی سیاسی گتھی سلجھانے کے لیے کینٹ مشن بھیجا گیا۔ اس سے ہندوستان کی کوئی بھی سیاسی پارٹی مطمئن نہیں ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی نے 'سمندر پار کے فرشتہ ہائے رحمت' کو وقت کا چیلنج سناتے ہوئے خبر دار کیا:

15 اگست تک تحریک سے متعلق اردو شعرا نے اپنی نظموں میں انتہائی مثبت، تعمیری اور قومی اتحاد و سا لمیت کا مظاہرہ کیاہے۔ ان نظموں میں وقت اور زمانے کے تقاضوں کو سمجھا اوراس کے مطابق عزم واستقلال کے ساتھ برطانوی سامراج کے خلاف ذھن و فکر کی آبیاری کی۔ ظلم واستبداد کے آگے سرنگوں ہو جانے کے بجائے انھوں نے اپنی جان کی بازی لگانے اور سر فروشی کی ترغیب دیتے رهنا زیادہ مناسب سمجھااور اپنی آواز بناکر عوام تک پهنچایا

مورخوں سے کہو خون میں ڈبوئیں قلم
بدل چکا ہے ارادے میں اضطراب اپنا
خزاں رہے کہ بہار آئے ہر چہ بادا باد
اب اک زقند کا ہے منتظر شباب اپنا

بالآخر 20 فروری 1947 کو سامراجی حکومت نے اعلان کر دیا کہ جون 1947 سے پہلے وہ ہندوستان کی حکومت کے بوجھ سے سبکدوش ہو جائے گی فرقہ وارانہ تناسب کی بنا پر ملک کی تقسیم اور ہندوستانی رہنماؤں کو سیاسی اختیارات منتقل کرنے کے لیے ایک نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان بھیجا گیا۔ اس نے مقررہ میعاد سے پہلے ہی ملک کی تقسیم کا کام مکمل کر دیا اور 14 اگست 1947 کو پاکستان اور 15 اگست کو ہندوستان نام کی خود مختار حکومتوں کا افتتاح کیا۔ بہر حال انگریز ہندوستان کو چھوڑ تو گیا لیکن:

لالے کو دبایا سنبل سے قمری کو لڑایا بلبل سے
جاتا تو ہے صیاد مگر گلشن کو لٹا کر جاتا ہے
(اقبال سہیل)

آزادی کی دیوی نمودار تو ہوئی لیکن خون میں ڈوبی ہوئی زمین سے آسمان تک فرقہ واریت کا زہر بھر گیا۔ تعصب اور تنگ نظری کی آگ اتنی بھڑک چکی تھی کہ صدیوں کا تہذیبی سرمایہ اس میں فنا ہوتا نظر آتا تھا۔ ہندو مسلم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور درندگی، سفاکی اور بربریت کی وحشی قوتیں بے لگام ہوگئیں۔ اس نازک مرحلے پر بھی اردو شعرا نے عوام سے امن و آشتی کی درخواست کی اور قوم کو سامراجی چالوں سے محتاط رہنے کے لیے خبر دار کیا۔

فیض کی 'صبح آزادی' میں یہ بجھی بجھی اور درد کی لہر ان مصروں میں ہمیشہ کے لیے مجسم ہوگئی ہے:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل
(فیض احمد فیض)

سامراجیوں کے چنگل سے نجات پانے کے بعد ملک میں قتل و غارت کے وقتی طوفان پر بھی باہمی کوششوں سے قابو پالیا گیا۔ اس سلسلے میں اردو شعرا نے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

حکم معزولی بہ نام تیرگی آہی گیا
وادی شب میں پیام روشنی آہی گیا
چیرتا ظلمت کو تہہ در تہہ سحاب اندر سحاب
پھر افق پر آفتاب زندگی آہی گیا
(آنند نرائن ملا)

وہ فسوں گر ہے نہ وہ دور شبانا
ہر روز نئے رنگ بدلتا ہے زمانہ
کل جو بھی ہوا آج بھلا دو وہ فسانہ
جائز نہیں آپس میں جبینوں کی شکن آج
(اقبال سہیل)

15 اگست تک تحریک سے متعلق اردو شعرا نے اپنی نظموں میں انتہائی مثبت، تعمیری اور قومی اتحاد و سلمیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان نظموں میں وقت اور زمانے کے تقاضوں کو سمجھا اور اس کے مطابق عزم واستقلال کے ساتھ برطانوی سامراج کے خلاف ذہن وفکر کی آبیاری کی۔ ظلم واستبداد کے آگے سرنگوں ہو جانے کے بجائے انھوں نے اپنی جان کی بازی لگانے اور سرفروشی کی ترغیب دیتے رہنا زیادہ مناسب سمجھا اور اپنی آواز بنا کر عوام تک پہنچایا۔

■

Bilal Ahmad Mir Research Scholar, Prof. C.R Rao Road, P.O. Central University, Hyderabad - 500046 (Telangana)

جمیل اختر

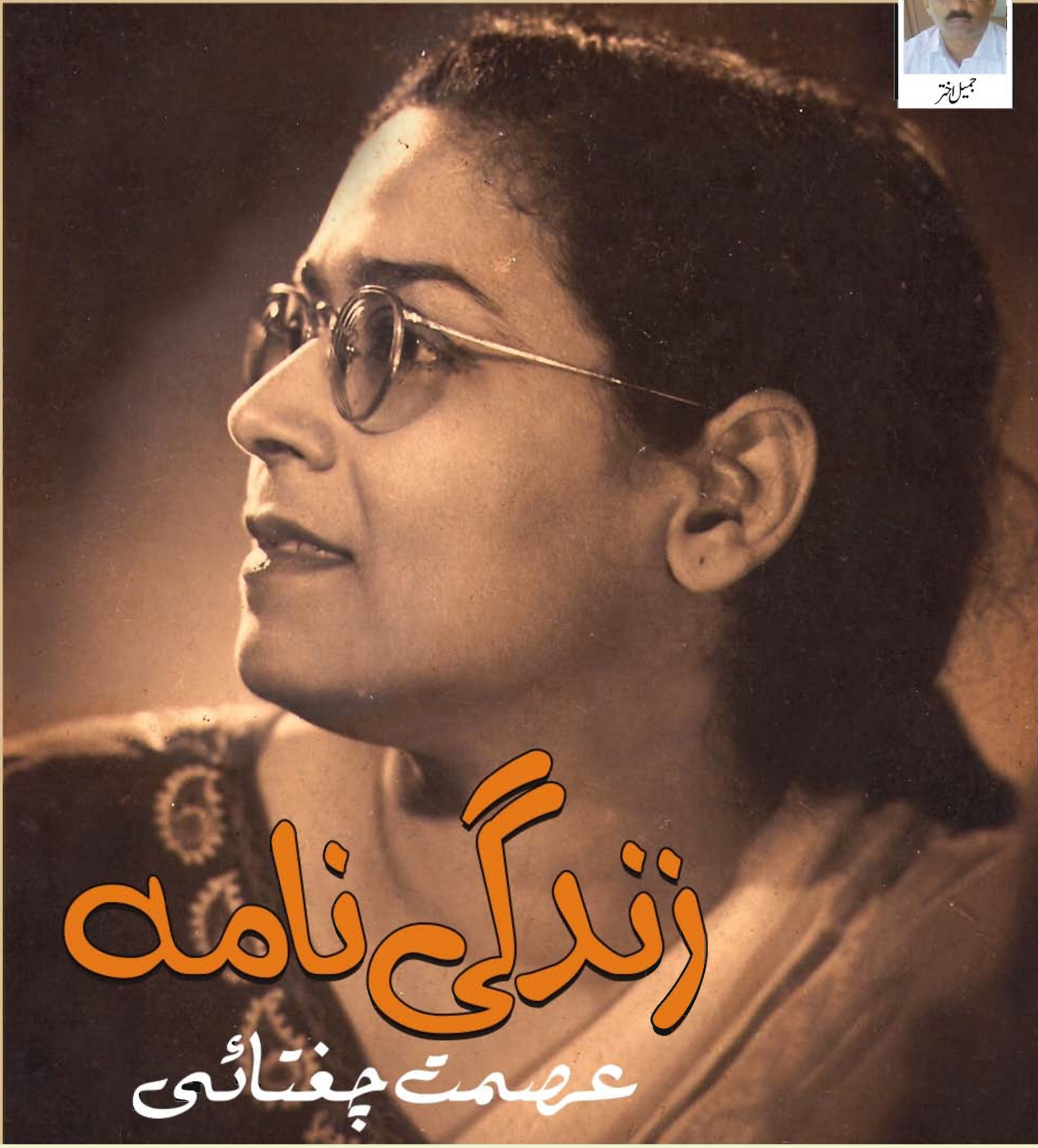

زندگی نامہ

عصمت چغتائی

آغاز و انجام

اصل نام: عصمت خانم چغتائی

قلمی نام: عصمت چغتائی

تاریخ پیدائش: 21 اگست 1915

آبائی وطن: بھوپال

سکونت: بمبئی (1945 میں)

وفات: 24 اکتوبر 1991 (76 سال کی عمر میں)

وقت: شب (صبح بستر پر مردہ پائی گئی)

تدفین: چندواڑی شمشان گھاٹ میں (وصیت کے مطابق نذر آتش کر دیا گیا)

ازدواجی زندگی: شادی 1942 میں

شوہر: شاہد لطیف (1941 - 1967)

اولادیں:

سیما: بڑی لڑکی۔ اس نے غیر مسلم سے شادی کرلی۔ ان کا ایک بیٹا آشیش ہے دونوں ماں بیٹے آریہ سماجی ہیں۔ ایک اشتہاری کمپنی کے مالک ہیں۔ سیما کا انتقال ہو چکا ہے۔

سبرینہ: ایک پلاسٹک سرجن کی اسسٹنٹ ہیں۔ انھوں نے ایک پارسی سے شادی کی۔

والدین:

والد: مرزا قسیم بیگ چغتائی (سرکاری ملازم تھے۔ پیشے سے جج تھے)

والدہ: نصرت خانم چغتائی

اجداد:

دادا: مرزا کریم بیگ چغتائی

سلسلۂ نسب: جابر حکمراں چنگیز خاں سے ملتا ہے

تعلیم:

ابتدائی تعلیم: گھر پر ہوئی

ابتدائی جماعت: آگرے کے میونسپل اسکول میں
میٹرک: علی گڑھ (نویں جماعت سے)
بی۔اے: آئی ٹی کالج لکھنؤ
بی ایڈ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مشاغل:

ہیڈمسٹریس: ریاست جاورہ، گرلز اسکول
ہیڈمسٹریس: اسلامیہ گرلز ہائی اسکول بریلی، 1937
پرنسپل: راج محل، گرلز ہائی اسکول، جودھ پور
انسپکٹریس: میونسپل اسکول، بمبئی 1941
سپرنٹنڈنٹ آف میونسپل اسکول، بمبئی

اعزازات و انعامات:

غالب ایوارڈ: ٹیڑھی لکیر، ایوان غالب دہلی، 1974
فلم فیئر ایوارڈ: بیسٹ اسٹوری، گرم ہوا (کیفی اعظمی کے ساتھ) 1975
سمان ایوارڈ آف اردو لٹریچر: 1990
پدم شری: حکومت ہند 1975
اقبال سمان: ریاست مدھیہ پردیش، 1990
پرویز شاہدی ایوارڈ: مغربی بنگال اردو اکادمی
مخدوم ایوارڈ
نہرو ایوارڈ

فلمی زندگی (اسکرپٹ نویسی)

1. چھیڑ چھاڑ: پہلی فلم، کے آصف پروڈیوسر 1943
2. ضدی: (ناول پر مبنی) ہدایت کار شاہد لطیف، ہیرو دیو آنند، 1946 یا 1948
3. آرزو: اسکرین پلے اور اسٹوری لکھی۔ ہدایت کار: شاہد لطیف، 1950
4. بزدل: ہدایت کار، شاہد لطیف، پریم ناتھ اور نمی 1948 نغمہ نگار کیفی اعظمی (پہلی بار)
5. شیشہ 1949
6. فریب 1953
7. دروازہ 1954
8. سوسائٹی 1955
9. سونے کی چڑیا: اسکرین پلے، تمام فلموں کے ہدایت کار شاہد لطیف تھے۔ ڈائرکٹر نوتن، بلراج ساہنی اور طلعت 1958
10. جواب آئے گا: (بچوں کے لیے) دو فلم عصمت نے خود بنائی (ڈائرکٹر) 1968
11. مائی ڈریم: دستاویزی، ڈائرکٹر 1975
12. علی سردار جعفری: دستاویزی، ڈائرکٹر 30 منٹ کی
13. گرم ہوا: عصمت نے خود بنائی۔ 1974
14. جنون: مکالمے لکھے اور اداکاری کی۔ 1978
15. لحاف اسٹوری (2009)

کہانی جس پر مقدمے چلے:

لحاف: 1942 میں ادب لطیف لاہور میں شائع ہوئی۔ 1944 میں لاہور ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر ہوا۔

ادیب جن سے متاثر ہوئیں:

دوستووسکی
چیخوف
سمرسٹ ماہم
برناڈشا

نقش اول:

1. پہلا افسانہ ڈھیٹ، ساقی، مارچ 1938
2. پہلا افسانوی مجموعہ، کلیاں، مکتبہ اردو ادب، لاہور، 1941 (اس میں کل سترہ افسانے شامل ہیں)
3. پہلا ناول: ضدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، 1941
4. پہلا ناولٹ: تین اناڑی (بچوں کے لیے) مکتبہ جامعہ، دہلی 1960
5. پہلا خاکہ: دوزخی، ساقی، جون 1942
6. پہلا رپورتاژ: بمبئی سے بھوپال تک، ورائٹی بک بنک 1979
7. پہلا ڈراما: فسادی، ساقی جنوری 38 (عصمت کی پہلی شائع شدہ تحریر یہی ہے)
8. پہلا مضمون کیا موجودہ ادب روبہ تنزل ہے، نقوش لاہور، دسمبر 1959
9. پہلی فلم: چھیڑ چھاڑ، 1943

افسانوی مجموعہ:

1. کلیاں: مکتبہ اردو ادب، لاہور 1941
آزاد کتاب گھر، دہلی 1963
2. ایک بات: مکتبہ اردو ادب لاہور، 1942
3. چوٹیں: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1942
4. دو ہاتھ: مکتبہ اردو ادب لاہور 1952
5. چھوئی موئی: کتب پبلشرز لمیٹڈ ممبئی، 1947
ورائٹی بک بینک لاہور 1952
6. بدن کی خوشبو: سرفراز احمد منظور پریس لاہور 1979
7. آدھی عورت آدھا خواب، بیسویں صدی پبلی کیشنز، 1986

ناول:

1. ضدی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1941
2. ٹیڑھی لکیر: یولی بک کارنر، رام پور، 1944
3. معصومہ: اشتیاق پبلی کیشنز، دہلی 1961
4. سودائی: اسٹار پبلی کیشنز، دہلی، 1964
5. عجیب آدمی (بہروپ نگر) ہندی پاکٹ بکس، دریا گنج، دہلی 1974
6. ایک قطرۂ خون: فن اور شخصیت ممبئی، 1975
7. جنگلی کبوتر: ہند پاکٹ، بکس دہلی، 1975
8. کاغذی پیرہن (خودنوشت) پبلی کیشن ڈویژن، دہلی 1994

ناولٹ:

تین اناڑی: مکتبہ پیام، مکتبہ جامعہ، دلی 1960
نقلی راج کمار 1960
دل کی دنیا 1960

ڈراموں کا مجموعہ:

شیطان
دھانی بانکپن، کتب پبلشرز، ممبئی 1947

افسانوی مجموعوں میں شامل افسانے:

1. **کلیاں**

(1) پردے کے پیچھے (2) گیندا (3) شادی (4) جوانی (5) ڈائن (6) ڈھیٹ (7) خدمت گار (8) بچپن (9) تاریکی (10) کافر (11) نیرا (12) اف یہ بچے (13) بڑی شرم کی بات ہے
(اس مجموعے میں چار ڈرامے، انتخاب، سانپ، فسادی، رتجے بھی شامل ہیں)

2. **ایک بات**

(1) ننھی سی جان (2) نفرت (3) ایک بات (4) ہیرو (5) حال (6) ہیروئن (7) بیریاں (8) پیشہ (9) باورچی

3. **چوٹیں**

(1) بھول بھلیاں (2) پنکچر (3) ساز (4) سفر میں (5) اس کے خواب (6) جنازے (7) لحاف (8) بیمار (9) میرا بچہ (10) تل (11) چھوٹی آپا (12) جھری میں سے (13) ایک شوہر کی خاطر

4. **دو ہاتھ**

(1) دو ہاتھ (2) یار (3) بے کار (4) کلو کی ماں (5) نیند (6) کنواری (7) چلان (8) عشق پر زور نہیں

5. **چھوئی موئی**

(1) بہو بیٹیاں (2) کیڈل کورٹ (3) جڑیں (4) سونے کا انڈا (5) کچے دھاگے (6) یہ بچے (7) چھوئی موئی (اس مجموعے 'ایک کہانی' مضمون ہے اور بمبئی سے بھوپال تک، رپورتاژ)

6. **بدن کی خوشبو**

(1) چارپائی (2) بدن کی خوشبو (3) گھونگھٹ (4) ہندوستان چھوڑ دو (5) روشن (6) کارساز (7) خدمت گار (یہ پہلے مجموعہ میں شامل ہے)۔

اداروں کے ذریعے مرتبہ افسانوی مجموعے:

1. **آدھی عورت آدھا خواب**

(1) خریدلو (2) نوالہ (3) کیڈل کوٹ (4) بے کنڈے کی پیالی (5) چراغ روشن ہے (6) لفنگا (7) گھروالی

نوٹ: اس نام سے دوسرا مجموعہ بھی آیا ہے جس میں چراغ روشن ہے کو چھوڑ کر باقی تمام افسانے مشترک ہیں۔

2. **عصمت کے شاہ کار افسانے**

(1) اپنا خون (2) گھروالی (3) جانی دشمن (4) چڑی کی ڈگی (5) محبوب (6) تل (7) امربیل (8) بے کار (9) پیشہ (10) وہ کون (دس میں صرف چھ نئے ہیں)

3. **عصمت کے یادگار افسانے**

(1) گھروالی (2) مغل بچہ (3) بھول بھلیاں (4) بقلم خود (5) چھوئی موئی (7) ننھی کی نانی (7) ساس (8) چارپائی (9) پیشہ (10) کنواری (صرف چار نئے افسانے ہیں)

4. **لحاف**

(1) لحاف (2) تیسرا دورہ (3) کشتے (4) عشق کا بھوت (5) ثواب (6) کوسنے (7) جنم جنم کی پیاس (8) آنٹی (9) باچھو (10) نیند (11) سفید چادر (12) یار (13) لفنگا (صرف آٹھ نئے افسانے ہیں) اس نام کا دوسرا مجموعہ بھی آیا ہے جس میں 23 افسانے ہیں۔ دونوں میں مشترک صرف لحاف ہے)

5. **عصمت کے بہترین افسانے**

(1) تل (2) ایک شوہر کی خاطر (3) امربیل (4) پردے کے پیچھے سے (5) کچے دھاگے (6) چٹان (7) دو ہاتھ (8) جڑیں (9) پیشہ (10) بہو بیٹیاں (11) کافر (12) چڑی کی ڈگی (13) تاریکی (14) سوت کا ریشم (15) لحاف (16) ننھی کی نانی (17) ڈائن (18) خدمت گار (صرف ایک افسانہ نیا ہے)

6. **لحاف**

(1) گھروالی (2) تیرا ہاتھ (3) چارپائی (4) پیشہ (5) جھڑی میں سے (6) چھوئی موئی (7) جوانی (8) ننھی سی جان (9) گھونگھٹ (10) تاریکی (11) ایک شوہر کی خاطر (12) بچھو پھوپھی (13) اف یہ بچے (14) دوزخی (15) لحاف (16) بھول بھلیاں (17) ہیروئن (18) چوتھی کا جوڑا (19) چھوٹی آپا (20) کنواری (21) بچپن (22) بدن کی خوشبو (23) تنہا تنہا (اس میں صرف چھ افسانے نئے ہیں)

7. **یہاں سے وہاں تک**

(1) تیسری آنکھ (2) میں چپ رہا (3) بدن کی خوشبو

8. **ہم لوگ**

(1) ہم لوگ (2) سوری ممی (3) سانپ کے تلوے (4) اللہ کا فضل (5) نوالہ (6) ثریا (7) مجنون (8) تیسرا دور (9) کلو (10) لفنگا (11) زہر (12) خریدلو (13) بہو بیٹیاں

9. **آدھی عورت آدھا خواب**

(1) خریدلو (2) لفنگا (3) نوالہ (4) گھروالی (5) کیڈل کورٹ (6) بے کنڈے کی پیالی

10. **عصمت کے شاہکار افسانے**

(1) سوت کا ریشم (2) جامن (3) مغل بچہ (4) کلو کی ماں (5) چھوئی موئی (6) پہلی لڑکی (7) ننھی کی نانی (8) دو ہاتھ (9) چوتھی کا جوڑا (10) بھول بھولیاں (11) پنکچر

11. **لیڈی کلر**

(1) اللہ کا فضل (2) بچھو پھوپھی (3) زہر کا پیالہ (4) پتھر دل (5) لیڈی کلر (6) نیند (7) سفید چادر (8) یار (9) لفنگا

12. **امربیل**

(1) اپنا خون (2) جانی دشمن (3) محبوب (4) امربیل (5) گھروالی (6) چڑی کی ڈگی (7) تل (8) بے کار (9) پیشہ

13. **دوزخ**

(1) سوری ممی (2) زہر (3) مٹھی بالش (4) امربیل (5) بہو بیٹیاں

14. **گل دان**

(1) تکملہ (2) زہر کا پیالہ (3) دیوتا (4) اللہ کا فضل (5) چینی کی گڑیا (6) ڈھکوسلا (7) میری دوست (8) بچھو بوٹی (9) پتھر کا دل (10) گلدان (11) تیرا ہاتھ (12) مقدس فرض (13) ینی (14) جو اماں ملی تو کہاں ملی (15) کنیادان (16) نوالہ (17) آخری کہانی (18) یہاں سے وہاں تک (رپورتاژ) (19) دوزخ (ڈراما)

خاکے:

1. دوزخی (عظیم بیگ چغتائی)، ساقی جون، 1942، چوٹیں
2. عشق مجازی (اسرار الحق مجاز)، شاہراہ مجاز نمبر، مارچ 1956
3. اور وہ، نیا دور کراچی، مارچ اپریل 1956
4. میرا دوست میرا دشمن (منٹو)، نقوش منٹو نمبر، مارچ 1956
5. خواجہ احمد عباس، اردو کے بہترین افسانے مرتبہ پرکاش پنڈت
6. چراغ روشن ہیں (کرشن چندر)، آدھی عورت آدھا خواب، بیسویں صدی پبلشرز، 1986
7. خوابوں کا شہزادہ (بنے بھائی)، پندرہ روز چنگاری دہلی، نومبر 1983
8. کچھ میری یادیں (پطرس)، نقوش پطرس نمبر، ستمبر 1959
9. سوکھے پتے (میراجی)، مفاہیم گیا، ستمبر اکتوبر 1979
10. کانٹوں بھری وادیاں (جاں نثار اختر)، فن اور شخصیت، مرتبہ: صابر دت ممبئی
11. میں تمھیں جانتی ہوں (مہندر ناتھ)، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1980

رپورتاژ:

1. بمبئی سے بھوپال تک: چھوئی موئی
2. یہاں سے وہاں تک (سفر پاکستان) بیسویں صدی نومبر دسمبر 1977 (گل دان)

خودنوشت:

1. آپ بیتی، نقوش آپ بیتی نمبر جون 1964
2. بیتے ہوئے دن کچھ ایسے ہیں، ویمنز کالج میگزین علی گڑھ اپریل 66 (پاپا میاں نمبر)
3. غبار کارواں، آج کل دہلی، نومبر 71
4. میرے زمانے کا علی گڑھ، آج کل اپریل 71
5. میری آپ بیتی، آدھی عورت آدھا خواب
6. کاغذی ہے پیرہن، پہلی کیشن ڈویژن دہلی
7. شخصیات وواقعات جنھوں نے مجھے متاثر کیا

ڈرامے:

1. فسادی، ساقی جنوری 38، کلیاں
2. انتخاب، ادبی دنیا اکتوبر 39، کلیاں
3. سانپ، کلیاں
4. شیطان، ساقی مارچ 1944، شیطان
5. خواہ مخواہ ایضاً
6. تصویریں، ساقی فروری 1944 ایضاً
7. دلہن کیسی ہے ایضاً
8. شامت اعمال ایضاً
9. دھانی بانکپن، آج کل خواتین نمبر اگست 1975، سویرا شمارہ 3
10. بنے، ساقی مارچ 39، کلیاں
11. دوزخ، سویرا شمارہ، 24، گل دان
12. عورت اور مرد، چوٹیں

مضامین:

1. ایک بات، ایک بات
2. ہیروئن، نقوش پطرس نمبر، ایک بات
3. کہانی، آج کل نومبر 70، چھوئی موئی
4. فسادات اور ادب، نقوش لاہور، دسمبر 59، چھوئی موئی
5. کچھ تو کہیے کدھر جائیں، نقوش اکتوبر 1949، چھوئی موئی
6. پوم پوم ڈارلنگ، چھوئی موئی
7. عورت ایک کھلونا، قومی راج ممبئی، اکتوبر 75
8. نئی تصویر عورت کی، منور ماہندی، جولائی 85
9. آدھی عورت آدھا خواب، بیسویں صدی
10. کیا موجودہ ادب روبہ تنزل ہے، نقوش دسمبر 1959

11. ترقی پسند ادب اور میں، آج کل، نومبر 70
12. مجھے کہنا ہے کچھ، الفاظ مارچ تا جون 1980
13. کیا ترقی پسند تحریک سے ادب کو نقصان پہنچا ہے
14. اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے، نیا دور کراچی، (56-55)
15. میں اور میرا امن
16. بے چاری عورت، نقوش لاہور، 1970
17. کیا والدین کی ایک دوسرے سے علاحدگی بچوں پر ظلم ہے، بیسویں صدی، جولائی 82
18. ایڈیٹر بیسویں صدی کے نام خط، بیسویں صدی مئی 84

انٹرویوز:

1. عصمت چغتائی سے انٹرویو: یونس اگاسکر
2. عصمت چغتائی سے ملاقات: جلیل باز ید پوری
3. عصمت چغتائی سے ملاقات: چاند گل
4. باتیں عصمت آپا سے: شمع افروز زیدی
5. عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر: ابوالفیض سحر
6. عصمت سے انٹرویو: ڈاکٹر محمد اشرف
7. عصمت چغتائی ایک تاثر: امین راحت چغتائی، فنون لاہور، مارچ اپریل 77
8. عصمت کا آخری انٹرویو، فیاض رفعت، نیا دور لکھنؤ نومبر 1996
9. عصمت چغتائی: مجیب صدیقی، روبہ رو، مرتبہ: شکیل اختر 2012

افسانوں کی الفبائی ترتیب

رسالہ — مجموعہ

آ

آخری داؤ — نقش 1959
آخری کہانی — بیسویں صدی، جنوری 92 — گل دان
آدھی عورت آدھا خواب — سوافسانے
آنٹی — لحاف

ا

اپنا خون — شمع دہلی، 1971
عصمت کے شاہکار افسانے/سوافسانے
اتفاق کی بات — تعمیر ہریانہ جنوری 78
اس کے خواب — ساقی جولائی، 1941 — چوٹیں
اف یہ بچے، ساقی اگست، 1939، کلیاں/لحاف/سوافسانے
اللہ کا فضل — نقش (10-9)، 1970 — گل دان
امر بیل، نقش (2-1)، 1968، عصمت کے بہترین افسانے/شاہکار افسانے/سوافسانے
اندھا یگ — سوافسانے
ایک بات — ساقی جنوری 43، — ایک بات
ایک خط — نقوش شمارہ 101
ایک شوہر کی خاطر — ساقی ستمبر 42 — :چوٹیں

ب

باچھو — نقوش، 1964 — لحاف
باورچی — ایک بات
باندی
بچپن — ساقی مئی 38 — کلیاں
بچھو پھوپھی — نقوش مئی 59 — گل دان
بدن کی خوشبو — بدن کی خوشبو
بڑے شرم کی بات ہے — کلیاں
بہو بیٹیاں — سویرا (39) مارچ 67 — چھوئی موئی
بھابھی — سوافسانے
بھول بھلیاں — ساقی جنوری 42 — چوٹیں
بھیڑیں — فنون لاہور، اپریل 63 — سوافسانے
بے کار — سیپ شمارہ (1)، نقش 63 — دو ہاتھ
بے کندے کی پیالی — شاعر 72 — سوافسانے
بیڑیاں — ایک بات
بیمار — ادبی دنیا فروری 41 — چوٹیں
بقلم خود — عصمت کے یادگار افسانے
بلاتکار — روبی جون 84
بچہ — ساقی، نومبر 1940
بتے — ساقی مارچ 39 — کلیاں
بچھو بوٹی — شمع فروری 1974
بن بلایا مہمان (میرا بچہ) ساقی اکتوبر 1940

پ

پتھر کا دل — روبی، مئی 74 — گل دان
پردے کے پیچھے — ساقی، اکتوبر 39 — کلیاں
پنکچر — ساقی جنوری 41 — چوٹیں
پہلی لڑکی — سوافسانے
پہلی منزل — ساقی جنوری 44 — گل دان
پیشہ — ایک بات
پنی — روبی ستمبر 83

ت

تاریکی — ادبی دنیا فروری 40 — کلیاں
تل — ادبی دنیا، نومبر 41 — چوٹیں
تنہا تنہا — سوافسانے
تھوڑی سی پاگل — سیپ جنوری 77 — سوافسانے
تیسرا دور — سیپ خاص نمبر (19) — چوٹیں
تیسری آنکھ — سوافسانے
تیسرا ہاتھ — سوافسانے
تیسرا ہاتھ — بیسویں صدی جنوری 80 — گل دان
تجزیہ بازی — الفاظ نومبر دسمبر 82
تکملہ (زبردستی)، ساقی جنوری 40 — گل دان
تو مر جاؤ — شاہکار شمارہ 9
تلخ حقیقتیں — شمع جون 1956

ث

ثواب — لحاف
ثریا — ہم لوگ

ج

جال — ایک بات
جانی دشمن — عصمت کے شاہکار افسانے
جڑیں — چھوئی موئی
جنازے — ساقی دسمبر 41 — چوٹیں
جوانی — خمار پٹنہ — کلیاں
جہاں اور بھی ہیں — سوافسانے
جھری میں سے — ساقی اگست 42 — چوٹیں
جو اماں ملی تو کہاں ملی — بیسویں صدی جنوری 84 — گل دان
جنم جنم کی پیاس — لحاف

چ

چابڑے — سوافسانے
چٹان (لیڈی کلر) نقش (7-6)، 65 — دو ہاتھ
چڑی کی دُگی — سوافسانے
چند تصویریں بتاں — سوافسانے
چوتھی کا جوڑا — نقوش افسانہ نمبر، دسمبر 5 — سوافسانے
چھوٹی آپا — ساقی افسانہ نمبر جولائی 42 — چوٹیں
چھوئی موئی — ساقی دسمبر 48 — چھوئی موئی
چینی کی گڑیا — روبی جون 70 — گل دان
چھپٹ رس — روبی
چارپائی — بدن کی خوشبو
چراغ روشن ہے، آج کل دسمبر 77، آدھی عورت آدھا خواب

خ

خریدلو — نقش (10-9)، 1969 — سوافسانے
خدمت گار — ساقی، اکتوبر 1938 — کلیاں

د، ڈ

دو ہاتھ — شاہکار (13) — دو ہاتھ
دیوتا — روبی اگست 69 — گل دان
ڈھیٹ — ساقی مارچ 38 — کلیاں
ڈائن — ساقی جنوری 40 — کلیاں
ڈھکوسلا — آج کل مئی 73 — گلدان

ر، ز

روشن — نقوش سالنامہ جنوری 63 — بدن کی خوشبو

زر خرید   سو افسانے
زہر   سویرا شمارہ 23، 1966   سو افسانے
زہر کا پیالہ   نقش کراچی (6)   گل دان
زر خرید بیویاں   نقش 87 / بانو کراچی مئی 60

س، ش

سارٹی فیکٹ   روبی مارچ 84   سو افسانے
ساس   ساقی جولائی 40، عصمت کے یادگار افسانے
سانپ کے تلوے   کتاب لکھنؤ، جون 69   سو افسانے
سفر میں   چوٹیں
سوت کا ریشم   سو افسانے
سوری ممی   گفتگو ممبئی 67   سو افسانے
سونے کا انڈا   آج کل یکم اپریل 49   چھوئی موئی
سفید چادر   روبی فروری 72   لحاف
سونے کے گھونٹ   سیپ جنوری 77
ساز   چوٹیں
سندرسی   آتش گل، دہلی
سفر در سفر   شاہراہ سالنامہ 55
شادی   ادبی دنیا سالنامہ، 40   کلیاں

ع

عشق پر زور نہیں   سیپ شمارہ (2)   دو ہاتھ 52
عشق، عشق، عشق   سو افسانے
عشق کا بھوت   لحاف
عورت   سو افسانے

ف

فنانسر   شمع جنوری 59
فلم نگری   شمع اکتوبر 51

ک

کارساز،   ......   بدن کی خوشبو
کافر   ساقی اپریل 38   کلیاں
کچے دھاگے   شاہراہ ستمبر اکتوبر 49   چھوئی موئی
کلو نمبر 1   فنون جولائی اگست 6   سو افسانے
کلو نمبر II   فنون جولائی اگست 6   سو افسانے
کلو کی ماں، نقوش دس سالہ انتخاب نمبر جون 58، دو ہاتھ
کنواری   شاہکار (II)   دو ہاتھ
کیڈل کورٹ   چھوئی موئی
کیسی بیوی کیسا شوہر   سو افسانے
کایا پلٹ   نقش (2)، 1952
کشتے   لحاف
کوستے   لحاف
کنیادان   بانو اپریل 85   گل دان

کہانی   آج کل نومبر 48   چھوئی موئی
کیوں رے کتے (میرا بچہ)، ساقی ستمبر 40

گ

گنگا بہتی ہے   سو افسانے
گھروالی، چہار رنگ، مارچ 84، عصمت کے یادگار افسانے
گھونگھٹ   نقوش افسانہ نمبر ستمبر 74   بدن کی خوشبو
گل دان، روبی اگست، 75، شب خون دسمبر 70، گل دان
گڈا گڑیا   شمع مئی 56
گیندا   نیا ادب لکھنؤ، 39   کلیاں

ل

لمبے ہاتھ   بیسویں صدی، جنوری 83   سو افسانے
لال چیونٹے   سو افسانے
لفنگا   نقش (4-3)، 72   لحاف
لحاف   چوٹیں
لہو   رفیق نسواں، لاہور اگست 39

م

مٹھی مالش، نیا دور کراچی (12-11)، نقش 57، سو افسانے
مقدس فرض   روبی اپریل 83   گل دان
موکھا   شمع جنوری 87   سو افسانے
محبوب، نقش (12-11)، 1967، عصمت کے شاہکار افسانے
میں چپ رہا   سو افسانے
معائنہ   ادب لطیف، سالنامہ 1946
مغل بچہ   نقوش جنوری 76
میری دوست   کتاب لکھنؤ نومبر 73   گل دان
میلے کا ٹوکرا   آج کل اپریل 77
میرا بچہ   ساقی ستمبر 40   چوٹیں
میرا بچہ   ساقی اکتوبر 40

ن

نفرت   ساقی اکتوبر 42   ایک بات
ننھی کی نانی، نقوش افسانہ نمبر جنوری 54، عصمت کے یادگار افسانے
نوالہ   فنون سالنامہ 68   سو افسانے
نئی دلہن   شاعر 1979   سو افسانے
نیرا   ساقی جون 39   کلیاں
نیند   نقوش افسانہ نمبر نومبر 60   دو ہاتھ
ننھی سی جان   ساقی دسمبر 41

و، ہ

وہ کون تھا، بیسویں صدی نومبر 70، عصمت کے یادگار افسانے
ہم سفر   سو افسانے
ہندوستان چھوڑ دو، ادب لطیف، سالنامہ 62، بدن کی خوشبو

ہیرو   ایک بات
ہیروئن   نقوش ستمبر 59   ایک بات
ہنستے ہنستے   نقوش پطرس نمبر، ستمبر 59
ہم لوگ   ہم لوگ

ی

یار   دو ہاتھ
یہ بچے   چھوئی موئی

کہانی ایک عنوان دو:

1. بن بلایا مہمان   میرا بچہ
2. تکملہ   زبردستی
3. چٹان   لیڈی کلر
4. سوری ممی   ہم لوگ
5. کیوں رے کتے   میرا بچہ

کہانیاں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں

1. آخری داؤ   2. ایک خط
3. اتفاق کی بات ہے   4. بلاتکار
5. بچہ   6. بچھو بوٹی
7. بن بلایا مہمان   8. پینی
9. تجزیہ بازی   10. تو مر جاؤ
11. تلخ حقیقتیں   12. ثواب
13. ثریا   14. چھٹ رس
15. زر خرید بیویاں   16. سارٹی فیکٹ
17. سونے کے گھونٹ   18. سندرسی
19. سفر در سفر   20. کایا پلٹ
21. کیوں رے کتے   22. گڈا گڑیا
23. لہو   24. میلے کا ٹوکرا
25. میرا بچہ   26. نوالہ
27. ننھی سی جان   28. فنانسر
29. فلم نگری   30. نئی دلہن

رسائل (جن میں کہانیاں شائع ہوئیں):

1. آتش گل، دلی   2. آج کل، دہلی 44 کے بعد
3. ادب لطیف، لاہور   4. ادبی دنیا، لاہور
5. الفاظ، علی گڑھ   6. بانو، دہلی
7. بیسویں صدی، دہلی   8. تعمیر، ہریانہ
9. رفیق نسواں، لاہور   10. روبی، دہلی
11. ساقی، دہلی   12. سیپ، لاہور
13. سویرا، لاہور   14. شاعر، ممبئی
15. شاہکار، دہلی   16. شمع، دہلی
17. کتاب، لکھنؤ   18. گفتگو، ممبئی
19. گنگ و جمن، کانپور   20. فنون، لاہور

21. نیا ادب، لکھنؤ
22. نیا دور، کراچی
23. نقش، کراچی
24. نقوش، لاہور
25. خمار، پٹنہ
26. شاہراہ، دلی
27. چہار رنگ، دلی
28. جمالستان، دہلی

فن اور شخصیت پر کتابیں:

1. عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر، مرتبہ: جمیل اختر، انٹرنیشنل فاؤنڈیشن، دہلی، 2001
2. عصمت چغتائی شخصیت اور فن، جگدیش چندر ودھاون، اردو اکادمی، لکھنؤ، 1996
3. عصمت چغتائی بحثیت ناول نگار، فرزانہ اسلم، سہانت پرکاش، 1996
4. دل کی دنیا مع تجزیہ، شریف احمد، حسامی بک ڈپو، دہلی، 1999
5. اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ، محمد اشرف، نصرت پبلشرز، لکھنؤ، 1997
6. عصمت چغتائی کی ناول نگاری (ٹیڑھی لکیر کی روشنی میں)، شبنم رضوی، ....، 1997
7. زندہ اپنی باتوں میں (بیدی، عصمت اور عباس)، فیاض رفعت، تخلیق کار پبلشرز دہلی، 2000
8. منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور: پرویز شہریار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2011
9. نیا افسانہ مسائل اور امکانات بہ یاد عصمت چغتائی: قمر رئیس، اردو اکادمی دہلی، 92
10. عصمت چغتائی شخصیت اور فن: ایم سلطانہ بخش اسلام آباد، دسمبر 1992
11. عصمت چغتائی کی غیر افسانوی نگارشات: محمد اشرف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2010
12. عصمت چغتائی شخصیت اور فن، ڈاکٹر دل افروز گنجو، مصنفہ خرد، 2010
13. عصمت چغتائی: فکر و فن، توحید خاں، 2014
14. اردو ادب کی ایک ڈی: ڈاکٹر عبداللہ، چمن بک ڈپو دہلی
15. عصمت چغتائی کا سماجی شعور (ناولوں کی روشنی میں): عشرت آرا سلطانہ، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ 46

تحقیقی مقالے:

1. عصمت چغتائی کی ناول نگاری: شمیم رضوی، دلّی یونیورسٹی
2. منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور: پرویز شہریار، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی
3. عصمت چغتائی — فکر و فن: توحید خاں، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی
4. عصمت چغتائی: شخصیت اور فن: دل افروز گنجو، سری نگر یونیورسٹی
5. عصمت چغتائی بحثیت ناول نگار: فرزانہ اسلم، پٹنہ یونی ورسٹی
6. عصمت چغتائی کی فکشن نگاری کا تنقیدی جائزہ: طلعت ماہ، ایم صغیر بیگ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، 2002

رسائل کے خصوصی نمبر:

مکالمات دلی، 1991

قافلہ

آج کل

شاعر

عصمت کی جہتیں:

- افسانہ نگار
- ناول نگار
- ڈراما نگار
- بچوں کی ادیبہ
- خاکہ نگار
- مضمون نگار
- فلم ساز
- اسکرپٹ رائٹر
- اداکارہ
- رپورتاژ نگاری

عصمت کے ہم عصر:

- کرشن چندر
- راجندر سنگھ بیدی
- بلونت سنگھ
- خواجہ احمد عباس
- قرۃ العین حیدر
- صالحہ عابد حسین
- احمد ندیم قاسمی
- عبداللہ حسین
- خالدہ مسرو
- جیلانی بانو
- ہاجرہ
- خدیجہ مستور

عصمت کے ناقدین و محققین

- مولانا صلاح الدین احمد
- کرشن چندر
- پطرس بخاری
- مجنوں گورکھپوری
- خواجہ احمد عباس
- وزیر آغا
- باقر مہدی
- فیض احمد فیض
- وقار عظیم
- وارث علوی
- الطاف فاطمہ
- ہاجرہ مسرور
- یوسف سرمست
- محمد احسن فاروقی
- سعادت حسن منٹو
- محمد حسن عسکری
- اوپندر ناتھ اشک
- سید محمد عقیل
- محمد حسن
- عزیز احمد
- سہیل بخاری
- شمیم حنفی
- خلیل الرحمٰن اعظمی
- حیات افتخار
- ابوالکلام قاسمی
- فضیل جعفری
- صفیہ اختر
- سلمی صدیقی
- شارب ردولوی
- عبدالسلام
- قرۃ العین حیدر
- مظہر امام
- گوپی چند نارنگ
- قمر رئیس
- شمیم حنفی
- صادق
- میرزا ادیب
- مسیح الزماں
- جمیل اختر
- جگدیش چندر ودھاون
- محمد اشرف
- ڈاکٹر محمد اشرف
- دل افروز گنجو
- فرزانہ اسلم
- شبنم رضوی
- محمد توحید خاں

عصمت کے مترجم:

- طاہرہ نقوی
- سکریتا پال
- صادق
- ایم اسدالدین

عصمت کے تراجم دوسری زبانوں میں:

- انگریزی
- ہندی
- بنگالی
- تیلگو

جنسیات پر مبنی افسانے:

- جال
- پنکچر
- بھول بھلیاں
- ہیرو
- تل
- گیندا
- بیمار
- خدمت گار
- پیشہ
- ڈھیٹ
- بیڑیاں
- لحاف
- شادی
- تاریکی
- چھوٹی آپا

سماجی حقیقت نگاری والے افسانے:

- چوتھی کا جوڑا
- ننھی کی نانی
- دو ہاتھ
- بے کار
- چھوئی موئی
- نیرا
- نیند
- کلو کی ماں
- بچھو پھوپھی
- ساس
- ڈائن
- چٹان
- کنواری
- کاروبار
- ایک شوہر کی خاطر
- سونے کا انڈا
- نفرت
- جوٹھی تھالی

فسادات، قومی یک جہتی و اشتراکیت کے موضوعات والے افسانے:

- جڑیں
- لال چیونٹے
- کچے دھاگے
- ہندوستان چھوڑ دو
- کافر
- بھیڑیں
- مٹھی مالش
- نوالہ
- نفرت
- کیڈل کورٹ
- نمک کی ستیہ گرہ
- کیوں سے کتے
- بن بلایا مہمان

یہ تمام افسانے سیاسی جاگیرداری، بے کاری، ملک کی تقسیم، آزادی کی جہد و جہد وغیرہ پر مبنی ہیں۔

■

Dr. Jameel Akhtar 18-G, CPWD Colony, Vasant Vihar, New Delhi - 110054
Mob.: 9818318512

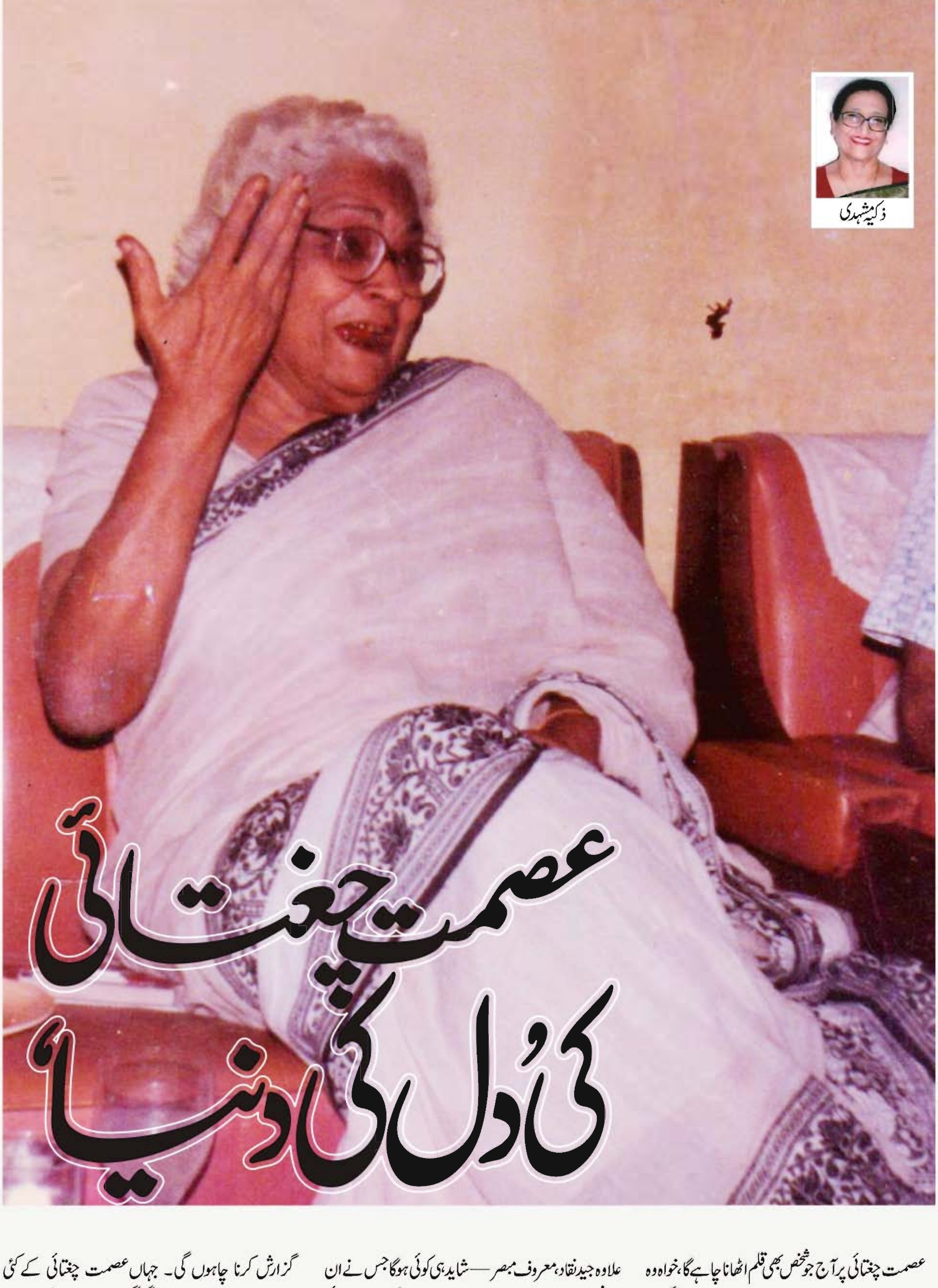

ذکیہ مشہدی

عصمت چغتائی کی 'دل کی دنیا'

عصمت چغتائی پر آج جو شخص بھی قلم اٹھانا چاہے گا، خواہ وہ ان کا قاری ہو یا مبصر، اس کے ذہن میں یہ خیال آنا ناگزیر ہے کہ اب ایسا کیا باقی رہ گیا ہے جو ان کے متعلق لکھا جائے تو پڑھنے والے کو محسوس ہو کہ ایک نیا دروازہ کھلا، ایک نیا گوشہ دریافت ہوا۔ منٹو، کرشن چندر، فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، سردار جعفری اور اردو ادب کے دوسرے بڑے ناموں کے علاوہ جید نقاد، معروف مبصر —— شاید ہی کوئی ہوگا جس نے ان کے فن پر اظہار خیال نہ کیا ہو۔ ان پر نکتہ چینی بھی خوب ہوئی لیکن عصمت اردو ادب کا ایسا ستون ہیں جسے کوئی بھی زلزلہ اکھاڑنے سے قاصر ہوگا۔ اس تناظر میں راقم الحروف کا ان کے متعلق کچھ لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے۔ بس ایک نسبتاً کم معروف ناولٹ 'دل کی دنیا' کی باز قرأت کی گزارش کرنا چاہوں گی۔ جہاں عصمت چغتائی کے کئی افسانے اور ناول ہمیشہ موضوع گفتگو رہے، اس کا تذکرہ بہت کم کیا گیا۔ یہ ناولٹ سید سالار مسعود غازی کے مزار کی 'بیک ڈراپ' میں لکھا گیا ہے۔ درگاہ اور خود حضرت وہ کینوس مہیا کراتے ہیں جس پر انھوں نے اپنے قلم کے برش سے کئی نہایت زندہ، فعال، متحرک اور دل پر رقم ہوجانے والے

کرداروں کی تصویریں پینٹ کی ہیں۔ راقم الحروف کا تعلق اودھ کے جس علاقے سے ہے وہاں سید سالار مسعود غازی عرف بالے میاں کے معتقدین خاصی بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں بیشتر تعداد نچلے اور نچلے متوسط طبقے کے لوگوں کی ہے۔ اس کی تاریخی وضاحت موجود ہے لیکن اس کا ذکر بے محل ہوگا۔

عصمت چغتائی کے والد جو برٹش عملداری میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے، بہرائچ میں بھی تعینات رہے جہاں بالے میاں کا مزار ہے اور بڑی دھوم سے سالانہ عرس منایا جاتا ہے۔ ناولٹ کی کہانی کی راوی خود عصمت ہیں جو اس وقت نو دس سال کی کم عمر لڑکی ہوا کرتی تھیں۔ اتفاق سے ان کی رہائش گاہ درگاہ کے بالکل قریب تھی۔ وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا وہ ان کے کچے ذہن پر اس طرح رقم ہوا کہ جب انھوں نے اپنے مشاہدات و احساسات کو الفاظ میں ڈھالنا شروع کیا تو یہ ناولٹ بھی لکھا گیا۔ ایک جینوئن فنکار ہونے کے ناطے عصمت نے بقول خود 'وہی لکھا جو دیکھا' دل کی دنیا میں بھی ان کی حقیقت نگاری عروج پر ہے۔

اس مختصر ناول میں دو اہم مرکزی کردار ہیں۔ ایک بوا اور دوسری قدسیہ۔

عصمت چغتائی کا مضمون تو پولیٹیکل سائنس تھا لیکن وہ نفسیات داں زیادہ محسوس ہوتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں سیاست کا کہیں دخل نہیں۔ ہاں انسانی ذہن پرت در پرت کھلا پڑا ہوا ملتا ہے۔

بوا ایک نوجوان عورت ہے۔ کچھ ایسا اشارہ موجود ہے کہ اسے کسی سے لگاؤ تھا یا کوئی شخص اس کو چاہتا تھا جسے اس کے والدین نے 'مانجھی کا پوت' ہونے کے سبب قبول نہیں کیا اور بوا کی شادی کہیں اور کردی۔ دلہن کو رخصت کرا کے بارات دریا کے راستے واپس جارہی تھی کہ اتفاق سے کشتی طوفان کی زد میں آگئی۔ لوگ غرقاب ہوگئے صرف دلہن بنی بوا ایک تختے سے چمٹی، تین دن لگاتار بہتی رہی اور آخر کو زندہ سلامت کنارے لگ گئی۔ لیکن جب وہ کنارے لگی تو ایک ذہنی مریض میں تبدیل ہو چکی تھی۔

شدید خوف یا صدمہ ذہنی توازن کے اچانک بگڑنے کا سبب بن سکتا ہے۔ ابھی بالکل حال میں نیپال میں تباہ کن زلزلہ آیا تھا۔ بہار کے کچھ علاقوں میں بھی اس کے شدید جھٹکے محسوس کیے گئے۔ تباہی اور اموات کی رپورٹوں کے ساتھ (کچھ عرصہ بعد) اخباروں میں یہ رپورٹیں بھی آئیں کہ ڈاکٹروں کے یہاں ذہنی مریض بڑی تعداد میں آرہے ہیں جنھیں شدید خوف، گھبراہٹ، اختلاج اور نیند کی کمی کی شکایتیں ہوگئی ہیں۔ تین دن لگاتار کوئی انسان، وہ بھی دلہن بنی ایک کمسن لڑکی، اس شدید خوف میں مبتلا رہے کہ اب ڈوبا کہ تب ڈوبا تو اس کا کسی ذہنی عارضے میں مبتلا ہوجانا نہ غیر فطری ہے نہ ناقابل یقین۔ بوا مجہول سی ہوجاتی ہیں۔ انھیں یہ وہم ہوجاتا ہے کہ وہ سید سالار مسعود غازی کی محبوبہ ہیں اس لیے انھوں نے انھیں بچالیا۔ بلکہ انھیں یہ بھی گمان ہوجاتا ہے کہ 'مانجھی کے پوت' کی صورت وہ خود ان کا ہاتھ مانگنے آئے تھے۔ وہ اپنے گرد ایک دنیا تشکیل دے لیتی ہیں جہاں ان کا محبوب ہے اور وہ ہیں۔ بوا متشدد نہیں ہیں، نہ ہی ہر مجہول انسان ہوتا ہے۔ وہ بس نیم دیوانی ہیں۔ یہ ایک نفسیاتی عارضے، شیزوفرینیا، کی سادہ صورت ہے، جس میں مریض حقیقت سے کنارہ کش ہوکر اپنی دنیا الگ بسالیتا ہے۔

عصمت چغتائی کے والد جو برٹش عملداری میں اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھے، بہرائچ میں بھی تعینات رہے جہاں بالے میاں کا مزار ہے اور بڑی دھوم سے سالانہ عرس منایا جاتا ہے۔ ناولٹ کی کہانی کی راوی خود عصمت ہیں جو اس وقت نو دس سال کی کم عمر لڑکی ہوا کرتی تھیں۔ اتفاق سے ان کی رہائش گاہ درگاہ کے بالکل قریب تھی۔ وہاں انھوں نے جو کچھ دیکھا وہ ان کے کچے ذہن پر اس طرح رقم ہوا کہ جب انھوں نے اپنے مشاہدات و احساسات کو الفاظ میں ڈھالنا شروع کیا تو یہ ناولٹ بھی لکھا گیا۔ ایک جینوئن فنکار ہونے کے ناطے عصمت نے بقول خود 'وہی لکھا جو دیکھا' دل کی دنیا میں بھی ان کی حقیقت نگاری عروج پر ہے۔

یہاں ایک نکتہ قابل غور ہے کہ بوا کی کسی بات یا حرکت سے ان کے مذہب کا پتہ نہیں چلتا۔ نام تو ان کا کچھ ہے نہیں۔ بس وہ بوا کہلاتی ہیں۔ اس طرح وہ ذات اور فرقے سے اوپر اٹھ کر ایک عورت ہیں، صرف ایک عورت اور اسی صورت میں ان کا کردار پرت در پرت کھلتا رہتا ہے اور اس قدر مشاقی سے تراشا جاتا ہے کہ اس میں کہیں بھی آورد کا نام ونشان نہیں ملتا۔ اگر کوئی کردار گردو پیش پایا بھی جائے تو بھی اس کو الفاظ کے قالب میں اس طرح ڈھال لینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے باریک بین مشاہدے، انسانی فطرت کی گہری سمجھ اور پھر قلم پر مضبوط گرفت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عصمت کے پاس یہ سب کچھ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ ناولٹ پڑھتے پر محسوس ہوتا ہے کہ بوا ہمارے گرد گھوم رہی ہیں، ابھی کہیں سے اچانک سامنے آجائیں گی۔ باوجود اس کے کہ عصمت کے سبھی کردار نہایت متحرک اور جاندار ہوتے ہیں، یہ احساس کسی نے نہیں بیدار کیا کہ وہ چھم سے آن موجود ہوگا۔

دوسرا کردار ایک خوش حال، بھرے پرے مسلم گھرانے کی نوجوان لڑکی قدسیہ ہے۔ اسے پندرہ برس کی عمر میں بیاہ دیا گیا ہے لیکن شوہر کے ساتھ صرف چھ مہینے گزر پاتے ہیں کہ وہ مزید تعلیم کے لیے لندن چلے جاتے ہیں اور وہاں سے ایک میم 'لٹکا' لاتے ہیں۔ قدسیہ گھر بیٹھی رہ جاتی ہے۔ متوسط طبقے کے اس 'شریف' گھرانے میں خلع، طلاق، دوسری شادی وغیرہ شجر ممنوعہ ہیں۔ قدسیہ انتہائی درجے کے فرسٹریشن میں مبتلا ہے۔ وہ بڑی ڈھیلی ڈھالی سی لڑکی ہے جس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کرے کیا۔ شاید اس لیے بھی کہ اس کے پورے سماجی وکنبہ جاتی سیٹ اَپ میں اس کے لیے کرنے کو کچھ ہے بھی نہیں سوائے اس کے کہ آنسو بہاتی رہے اور کڑھتی رہے۔ ایک مرتبہ تو اس نے شوہر کو یہاں تک لکھا کہ میں اس میم کی لونڈی بن کر آپ کے قدموں میں پڑی رہوں گی لیکن مجھے یوں نہ چھوڑیے۔ قدسیہ کی مایوسی اور گھٹن رفتہ رفتہ عصبی دوروں کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

آج کے دور میں جو پڑھی لکھی لڑکیاں ہیں اور جن کے کنبے روشن خیال ہیں شاید اس سچویشن میں ایسی بے بس نہ ہوں لیکن دیہی اور نیم شہری علاقوں میں اسی طرح کی عصباتی مریضائیں آپ آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ کسی خانقاہ میں چلے جائیے مل جائیں گی۔ کبھی اس طرح کے دورے مصنوعی ہوتے ہیں اس لیے کہ ہر طرف سے نظر انداز کی جانے والی، زیادتیوں کی شکار عورت پر جن بھوت مسلط سمجھ کر رشتہ دار خصوصی رعایتیں برتنے لگتے ہیں۔ یا ڈر کر زیادتیوں سے باز آتے ہیں۔ کبھی یہ دورے حقیقی بھی ہوتے ہیں اس لیے کہ اندر ہی اندر اکٹھا ہونے والے جذبات نکاسی کا صحیح راستہ نہ پاکر یہ ٹیڑھا راستہ اختیار کرلیتے ہیں۔ قدسیہ کی ذہنی اذیت، اس کی گھٹن، اس کی بے بسی، اس کا غصہ کس طرح بالآخر ان دوروں کا سبب بنتا ہے یہ ایک فطری بہاؤ کے تحت مصنفہ نے اجاگر کیا ہے۔ کہیں کوئی تصنع نہیں، کوئی آورد نہیں، کوئی میلوڈرامہ نہیں۔

یہ عصمت کا وہ موضوع بھی ہے جس کے لیے انھیں 'ٹائپ کاسٹ' کیا جاتا ہے یعنی عورتوں کی گھٹن، مردوں کی بالادستی اور سماج کا ان کے تئیں بے رحم رویہ۔ قدسیہ کے شوہر اپنی پسندیدہ بیوی کے ساتھ خوش وخرم زندگی بسر کررہے ہیں۔ انھیں کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن کسی کے ذرا سے اشارے پر کہ قدسیہ کو طلاق دلوا کر اس کی دوسری شادی کرا دی جائے، خاندان کی بزرگ خاتون اکھڑ جاتی ہیں۔ آخر ایک مرتبہ خود

قدسیہ کے منہ سے یہ باغیانہ جملے ادا ہوتے ہیں: ''جوتی پر واروں اس دنیا کو۔ دس برس سے جوانا مرگ مجھے رُلا رہا ہے، اس کو دنیا کچھ نہیں کہتی۔'' دورے جیسی ایک کیفیت میں قدسیہ اپنی چوڑیاں توڑ کر انھیں پھانکنے بھی چلتی ہے۔ سل بٹہ اٹھا کر لوگوں کا سر پھاڑنے کو بھی تیار ہے لیکن بالآخر بغاوت کرتی ہے، مثبت بغاوت جو اس کی زندگی سنوارتی ہے۔ سر پھاڑنے اور خودکشی کرنے جیسی نہیں۔

رشتے کے ایک دیور شبیر حسن کو اس سے محبت ہوجاتی ہے گرچہ یہ بھی قدسیہ جیسے ڈھیلے ڈھالے سے انسان ہیں بقول عصمت چغتائی 'عجب مخنچو'۔ گھر سے نکل لینا نہ ان کے بس کا تھا نہ قدسیہ کے لیکن ایک اور ہمدرد انسان مستقیم عرف مُچھّو چچا ان دونوں کی مدد کر کے انھیں نئی زندگی کی ابتدا کرنے کے لیے گھر سے باہر نکال لے جاتے ہیں۔ بعد میں یہ قدسیہ کو خلع دلوا کر رشتے کو جائز مرتبہ دلواتے اور دونوں کا مستقبل خوش آئند بنا دیتے ہیں۔ یہ ناولٹ کا اختتامی حصہ ہے۔

نیم دیوانی بوا اس کنبے میں نہایت فطری انداز میں داخل ہوتی ہیں۔ وہ درگاہ کے آس پاس گھومتی پھرتی تھیں اور اکثر پر سوز آواز میں اودھی زبان کے (جو ان کی اپنی زبان تھی) لوک گیت گاتی رہتی ہیں۔ ان کی تخیلاتی دنیا ایک خوش وخرم دنیا ہے۔ کنبے کے سبھی لوگ انھیں پسند کرنے لگتے ہیں، خاص طور پر بچے اور قدسیہ لیکن اس بھالو کی طرح جس نے ازراہِ ہمدردی کسی سوتے شخص کی ناک سے مکھی اڑانے کے لیے پتھر چلا دیا تھا، گھر کے لوگ بوا کا علاج کرانے کی سوچتے ہیں کہ وہ ہوشمند لوگوں کی دنیا میں لوٹ آئیں۔ جیسے کہ یہ دنیا انھیں ایسا ہی خوش وخرم رکھ سکے گی) بوا کا علاج حکیم صاحب سے کرایا جاتا ہے جو اس قدر تیز مسہل اور کشتے کی گولیاں استعمال کرتے ہیں کہ بوا کا پورا نظام ہضم الٹ پلٹ ہوجاتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ جسمانی اذیت میں گزارتی اور اس کے بعد ایک دن اس دنیا سے رفع ہوجاتی ہیں۔ بوا کی موت قدسیہ کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے۔ گرچہ بوا اس سماج کی شکار ہوئی ہیں جو غلط یا سہی لوگوں پر اپنی مرضی تھوپنا اور ان کی زندگیوں کو کنٹرول کرنا چاہتا ہے پھر بھی یہ موت قدسیہ کو احساس دلاتی ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی اپنے مطابق گزارے۔

بلاشبہ عصمت چغتائی نے اس سے زیادہ اچھے ناول لکھے ہیں لیکن دل کی دنیا کے کرداروں کے ذریعے وہ جس طرح عورتوں کی ذہنی کیفیات کا جائزہ لیتی اور رفتہ رفتہ ذہنی امراض کی گرفت میں آنے کی جو عکاسی کرتی ہیں اس پر عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عصمت چغتائی کو بار بار باغی کہا جاتا ہے لیکن ایک بار انھوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہا ''کہاں کی بغاوت، کیسی بغاوت۔ کیا میں نے کسی پر تلوار چلائی، ڈنڈا اٹھایا؟'' ایسا کہتے ہوئے وہ شاید الفاظ سے کھیل رہی تھیں۔ بغاوت صرف ڈنڈا اچلانے، بم پھوڑنے کا نام نہیں۔ دل کی دنیا میں وہ قدسیہ سے کہتی ہیں کہ جا بھاگ جا۔ جا، اس مطلق العنان، عورت دشمن سماج کے منہ پر تھوک دے۔ بیشک یہ انھوں نے ان الفاظ میں نہیں کہا، برملا نہیں کہا لیکن کہانی کو جو اختتامیہ موڑ دیا وہ پکار پکار کر یہی کہتا ہے۔ ویسے یہاں یہ بغاوت قدرے محتاط بغاوت ہے۔ اس لیے کہ قدسیہ کے فرار ہونے کو خودکشی کا رنگ دیا جاتا ہے۔ یعنی لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ کنویں میں کود گئی۔ اس کی لاش کنویں میں نہ ملنے کی صراحت یوں کی گئی کہ وہ پانی میں گری تو وہاں مرصع تخت لیے ہوئے کھڑی حوروں نے اسے تھام لیا اور ایلس ان ونڈرلینڈ کی ایلس کی طرح اسے ایک دوسری ہی دنیا میں لے گئیں۔ چونکہ قدسیہ پر دورے پڑا کرتے تھے، سادہ لوح عوام کو یہ جن، بھوتوں، حوروں کی مشترکہ کارروائی محیرالعقول نہیں محسوس ہوئی۔ شاید اس ناول کو جب لکھا گیا عصمت کی بغاوت میں جارحانہ رنگ کم تھا۔

نیم دیوانی بوا اس کنبے میں نہایت فطری انداز میں داخل ہوتی ہیں۔ وہ درگاہ کے آس پاس گھومتی پھرتی تھیں اور اکثر پر سوز آواز میں اودھی زبان کے (جو ان کی اپنی زبان تھی) لوک گیت گاتی رہتی ہیں۔ ان کی تخیلاتی دنیا ایک خوش و خرم دنیا ہے۔ کنبے کے سبھی لوگ انہیں پسند کرنے لگتے ہیں، خاص طور پر بچے اور قدسیہ لیکن اس بھالو کی طرح جس نے ازراہِ ہمدردی کسی سوتے شخص کی ناک سے مکھی اڑانے کے لیے پتھر چلا دیا تھا، گھر کے لوگ بوا کا علاج کرانے کی سوچتے ہیں کہ وہ ہوشمند لوگوں کی دنیا میں لوٹ آئیں ۔جیسے کہ یہ دنیا انہیں ایسا ہی خوش و خرم رکھ سکے گی) بوا کا علاج حکیم صاحب سے کرایا جاتا ہے۔

ہمارے سماج میں بہت تبدیلیاں آئی ہیں۔ شہروں خصوصاً بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ قدسیہ کے کردار کو فرسودہ سمجھ سکتے ہیں۔ بیشک اس قدر رونے دھونے اور سوت کی کنیز بننے کی التجا کرنے والی عورتیں ہمارے بڑے شہروں میں ملنا مشکل ہوں گی لیکن عنقا نہیں ہیں۔ راقم الحروف بذات خود ایک ایسی خاتون سے واقف ہے جو ریاضی میں بی ایس سی تھیں لیکن اپنے شرابی آئی پی ایس شوہر سے اس قدر پٹتی تھیں کہ ایک مرتبہ اسقاط تک ہوگیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ چلی کیوں نہیں جاتیں۔ جایئے ملازمت کیجیے تو ان کا جواب یہ تھا کہ میں بچوں کو نہیں چھوڑ سکتی اور میری اپنی آمدنی ان بچوں کو وہ آسائش نہیں دے سکے گی جو ان کا باپ دے رہا ہے۔ تو مختلف عنوان سے مجبور عورتیں آج بھی کہیں نہ کہیں دکھائی دے جاتی ہیں۔ ہاں ان کے اعصاب مضبوط ہیں اور تعلیم نے انھیں (بغاوت کی جرأت ہو) تو خود مکتفی ہونا بھی سکھا دیا ہے۔ اس پیارے ہندوستان جنت نشان میں بیل گاڑیاں اور لکژری کاریں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ عصمت کا کوئی کردار آج بھی فرسودہ (Obsolete) نہیں ہوا ہے۔ آس پاس کھڑا نظر آجائے گا۔

اپنی خودنوشت میں عصمت نے لکھا ہے کہ ان کے متعلق کنبے کے افراد کہتے تھے کہ ''نچھو کی لونڈیا ہے کہ موا بجار'' ادب میں ان کا داخلہ یوں ہی ہوا تھا جیسے شیشہ گروں کی دنیا میں بجار گھس آیا ہو۔ سب سے زیادہ ہتھ چھٹ ان کی زبان ہے۔ منگولوں کی تلوار جیسی دھاردار۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر وار کرتی لیکن ساتھ ہی دل میں ایک میٹھا درد جگاتی جیسے کچے پھوڑے پر انگوٹھے سے ہلکا سا دباؤ ڈالا گیا ہو۔ کسی بھی دوسرے فکشن نگار کے یہاں یہ زبان نہیں ہے اور مرد تو خیر لکھ ہی نہیں سکتے۔ مزا یہ ہے کہ نہ کہیں بھاری بھرکم الفاظ ہیں نہ بھاری بھرکم علمیت۔ بس زمینی کردار اور ان کرداروں کی اپنی لغت۔ کہیں نرم تو کہیں نیش عقرب سے آراستہ۔ دل کی دنیا میں بھی یہی زبان پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ میں مثالیں دے کر مضمون کو بوجھل نہیں بنانا چاہتی نہ ہی امتحان میں لکھے گئے پرچے کی صورت دینا چاہوں گی۔ کہانی، کردار، منظرنامہ، ایک خوشحال شہری مسلم گھرانہ، ایک نیم دیہاتی مجہول عورت، شوہر کے ذریعے ستائی جانے والی، نصف صدی پہلے کی اقدار میں محصور لڑکی — یہ سب آپس میں اس طرح گُتھے ہوئے ہیں کہ ایک مکمل پیٹرن (Pattern) بن رہا ہے۔ یہ پیٹرن، یہ نمونہ ہمارے آپ کے بیچ کی کہانی ہے جو آج بھی زندگی سے خارج نہیں ہوئی ہے۔ لحاف، ننھی کی نانی، چوتھی کا جوڑا، دو ہاتھ، ٹیڑھی لکیر کی بھیڑ بھاڑ میں دل کی دنیا نظر انداز نہ ہوجائے۔ اس کی باز قرأت یقیناً عصمت کے مداحوں کے لیے خوشگوار ثابت ہوگی۔ دل دیر تک انسانی ہمدردی سے سرشار، ایک میٹھی میٹھی چبھن محسوس کرتا رہے گا۔ دیوانگی اور فرزانگی کے درمیان روزن بنا کر جھانک جھانک کر دیکھے گا کہ کیسی ہے یہ دنیا۔

■

Zakia Mashhadi.,F-1, Grand Pallavi Court, Judges Court Road, Patna - 800004 (Bihar)

صبیحہ انور

عصمت آپا کا سفرِ بہرائچ
ایک بازیافت

وہ شروع اپریل کی قدرے گرم مگر خوشگوار دوپہر کا آغاز تھا جب ہم بہرائچ پہنچے تھے۔ گاڑی تین گھنٹے کے سفر کے بعد بہرائچ کی مشہور، شہید سید سالار مسعود غازی میاں جنھیں لوگ محبت میں بالے میاں بھی کہتے ہیں کی، درگاہ کے اونچے پھاٹک کے باہر رک گئی تھی۔

درگاہ کے گنبد کی سفیدی دھوپ میں کچھ زیادہ ہی چمکدار ہوگئی تھی، سامنے پھاٹک پر لوہے کی موٹی موٹی زنجیریں اور زنجیروں میں پرانی وضع کے بہت سے زنگ آلود تالے لٹک رہے تھے۔ ان زنجیروں کی کہانی تو معلوم نہیں، میرا خیال ہے کہ یہ زنجیریں اندر بے محابا داخل ہونے والے مریدین کے ریلے کو روکنے کا کام کرتی ہوں گی کیونکہ زنجیروں کو ہاتھ سے اونچا کر کے لوگ لگاتار پھاٹک سے گزر رہے تھے۔

اندر درگاہ کا آنگن دالانوں سے گھرا ہوا تھا اور درختوں کے نیچے بیٹھے لوگ بچے، برقع اور چادروں میں لپٹی ہوئی عورتیں سڑک سے ہی دکھائی دے رہی تھیں۔

میں نے عصمت آپا کی طرف دیکھا، عصمت آپا نے تمام راستے باتیں کی تھیں، اس وقت غافل سو رہی تھیں، میں نے ان کے ملائم ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے کہا ''آپا ہم بہرائچ پہنچ گئے'' اسی وقت ڈرائیور نے باہر نکل کر اپنے کپڑوں سے راستے کی گرد جھاڑی اور کھٹاک سے دروازہ بند کیا۔ دروازے کی آواز سے عصمت آپا جاگ اٹھیں۔ سامنے درگاہ کی شاندار سفید عمارت تھی۔ جیسے کوئی پسندیدہ چیز دیکھ کر بچہ ہمک کر گود سے اتر آتا ہے، عصمت آپا گاڑی سے اتر پڑیں۔ وہ اس وقت سراپا مسکراہٹ ہوگئی تھیں۔ باہر نکل کر کچھ دیر پھاٹک کو شوق سے دیکھتی رہیں۔

تھوڑی دیر پہلے وہ راستے کی طوالت سے اکتا گئی تھیں۔ مگر اس وقت انھیں تکان کا کوئی احساس نہیں تھا۔

میں خوش تھی کہ میں نے اپنا بہت پرانا وعدہ پورا کر دیا تھا، اور عصمت آپا کے ساتھ بہرائچ پہنچ گئی تھی۔ عصمت آپا کے والد خان بہادر میرزا قسیم بیگ چغتائی کی، اپنی ملازمت کے دوران دوبار بہرائچ میں پوسٹنگ رہی۔ عصمت آپا کے بچپن کا بہت اہم حصہ بہرائچ میں گزرا۔ مرزا قسیم بیگ چغتائی وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ عصمت آپا کی یادوں اور تحریروں میں اپنے 'ابا' جنھیں وہ کبھی 'سرکار' کہتیں، کبھی 'ابیاں' کا کردار ایک مکمل کردار تھا۔ جو چنگیز خاں کی نسل سے تھا۔ ابا کا ذکر کرتے وقت وہ اپنے جد امجد سے ضرور ناطہ جوڑتی تھیں اور فخریہ انداز میں کہتیں چغتائی خان چنگیز خان کا بیٹا تھا۔ اپنے ابا کے بارے میں کہتیں ''مرزا قسیم بیگ چغتائی وہ ہستی تھی جس کا کوئی رخ آلودہ نہ تھا۔ مجھے ان کی کوئی نا انصافی، کوئی زیادتی، کوئی غلط قدم یاد نہیں، میں نے انھیں ہر اعتبار سے ایک مکمل انسان کی حیثیت سے دیکھا تھا۔ وہ فخریہ بتاتیں ابا میاں بھرپور مرد تھے، سرپٹ گھوڑا دوڑاتے، ٹینس کھیلتے، باغبانی کرتے، یار دوستوں کی محفلیں سجاتے۔''

اماں مامتا کی ماری بھولی معصوم، مگر دنیاوی معاملات میں غضب کی ہوشیار تھیں۔ نصرت خانم نام تھا۔ عصمت خاندان بھر میں 'نچھو کی لونڈیا' کہی جاتی تھیں۔ جب عصمت آپا نے جودھ پور کے ایک نواب سے شادی سے انکار کیا اماں کا تبصرہ تھا۔

''اے موئے نواب کو باولے کتّے نے کاٹا ہے جو تجھ سے شادی کرنے چلا۔''

عصمت کی باتیں سنتیں تو جل کر کہتیں۔

''تم بس جیبھ چلیو۔ روٹی کھیو۔''

عصمت آپا نے اماں کا یہ جملہ بہت بار دہرایا تھا۔

عصمت آپا کے بچپن کی یادیں آخر عمر میں ان کی پوری زندگی کی یادوں پر حاوی ہوگئی تھیں۔ ان کی یادوں میں مرزا قسیم بیگ چغتائی کے بھائی بہن خود ان کے دس بچے، بھانجے، بھتیجے اور نہ جانے کتنے ماموں، ممانیوں، خالو، خالاؤں، پھوپھی پھوپھا کی اولادیں، نوکر اور نوکروں کے خاندان، نہ صرف ایک چغتائی قبیلے کی یاد دلا دیتے تھے بلکہ خاندانی محبتوں، رشتوں کی پاسداری اور کنبہ پروری کی مثال بھی سامنے رکھتے تھے۔ سب کی رگوں میں چنگیزی خون تھا جب وہ گھریلو جھگڑوں اور آپسی رنجشوں کی باتیں کرتیں تو تاتاری یلغار کی یاد تازہ ہو جاتی۔ مگر ہر کردار کا ذکر وہ اتنی محبت سے کرتی تھیں کہ سوچنا پڑتا کہ زندہ رہنے اور خوش رہنے کے لیے ایک جاگتی ہوئی سانس لیتی ہوئی حِس مزاح اور اور مثبت فکر سب سے ضروری چیز ہے جو عصمت آپا کی تحریر اور تقریر کی جان تھی۔ عصمت آپا کے بچپن کی ابتدائی یادوں میں بہرائچ کا تذکرہ ہمیشہ بہت بھرپور ہوتا تھا۔

وہ واقعہ جو آگے چل کر 'ایک قطرہ خوں' جیسے ناول کی بنیاد بنا، بہرائچ کا ہی تھا۔ جب ایک بار محرم کی ایک مجلس میں پانچ سال کی بچی نے حضرت علی اصغر کی شہادت کا ذکر سنا تھا، چھ ماہ کے معصوم بچے کے گلے میں ترپھلے تیر کا بیان۔ ان کی یادداشت کا وہ واقعہ تھا جسے وہ کبھی نہ بھلا سکی تھیں، اس واقعے نے انھیں بے قرار کر دیا تھا۔ وہ بتاتیں 'کیوں مارا' کے نعرے کے ساتھ انھوں نے فرش پر مچلنا شروع کر دیا تھا، مجلس سے تو باہر کر دی گئیں بلکہ سب بھائی بہن وہاں سے بغیر حصہ لیے ان کو برا بھلا کہتے واپس آئے۔ گھر پہنچ کر اماں نے 'کیوں مارا' کی چیخیں سنیں تو کہا ''اسی کو مارو پہلے اس نے کچھ کیا ہوگا'' رات کو بوا نے سمجھایا تھا ''اجید بہت کھراب تھا، بہت جالم تھا وہ مارے ربیس'' نا انصافی، زیادتی اور ظلم نے اس بچی کو رات بھر سونے نہ دیا۔

اور آگے چل کر احتجاج، انحراف اور اختلاف جیسے لفظ ان کے مزاج، ان کی شخصیت بلکہ پوری زندگی پر پھیل گئے تھے، اس کے بعد ان کی زندگی کے عام رویوں سے انحراف اور مفاہمت نا آشنا فکر اور زیادہ تند ہوتی گئی۔

ان کی باجی کی شادی کی یادیں بھی بہرائچ کی یادوں سے جڑی تھیں۔ بقول ان کے

''بہرائچ کے رؤسا اور افسران ہار پھول لے کر اسٹیشن پہنچے تھے دولہا کو پہلے سے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ دولہا کو دیکھ کر ابا کو پسینہ آ گیا تھا، دق کا مریض، لمبا بانس، کچی داڑھی، ماتھے پر شکنیں، آنکھوں میں تکان،''

یہ واقعہ بھی ان کے خاندان کا ایک المیہ تھا۔ جس کا وہ اکثر ذکر کرتی تھیں۔ لکھنؤ میں ایک ملاقات میں انھوں نے بہرائچ جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں انھیں بہرائچ لے کر چلوں گی۔ عصمت آپا کے ناولٹ 'دل کی دنیا' اور پھر 'کاغذی پیرہن' میں بہرائچ کا ذکر اتنی تفصیل سے پڑھ کر یہ تو اندازہ تھا کہ علی گڑھ، جودھ پور، آگرہ، بمبئی کے ساتھ ساتھ ان کی یادوں میں بہرائچ کا بھی ایک اہم مقام ہے۔ عصمت آپا سے ادبی جلسوں، محفلوں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، ان کی محبت اور بے تکلفی کو دوستی کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتی مگر مجھے یہ سوچ کر ہی اچھا لگتا ہے کہ انھوں نے لکھنؤ میں بیشتر بار میرے گھر پر قیام کیا۔ ان کی وجہ سے بہت سے لوگ میرے گھر آئے۔ وہ ایک دو ہفتے کے لیے اور ایک دو دن کے لیے بھی آئیں اور 1987 میں مارچ اور اپریل تقریباً دو ماہ ان کا قیام میرے گھر پر رہا، اتنے دن میرے گھر اور میرے دوستوں میں جشن کا عالم تھا۔ دو ماہ کا یہ وقفہ آج بھی میری یادوں میں اسی طرح روشن اور جیتا جاگتا ہوا ہے۔ عصمت آپا کی بے پناہ حسِ مزاح، گھن گرج والا لہجہ اور بے باکانہ انداز بیان ایسا نہیں جسے بھلایا جا سکے۔

کرشن چندر کی برسی تھی، اردو اکادمی کی دعوت پر وہ ایک ہفتے کے لیے لکھنؤ آئیں۔ آنے سے پہلے عصمت آپا نے مجھ سے وعدہ کروالیا تھا کہ اس بار بہرائچ ضرور چلیں گے۔ مگر بہرائچ کے پروگرام سے پہلے ان کی بھتیجی کی بیٹی رانی پاکستان سے آ گئیں۔ رانی عظیم بیگ چغتائی کی بڑی بیٹی مدحت کی بیٹی ہیں۔ تین چار دن لکھنؤ میں ان کی شاپنگ کا سلسلہ، دعوتیں، نشستیں اور گھر پر لوگوں کا جمگھٹا رہا مگر ہم بہرائچ نہ جا سکے۔ وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی وزارت میں ایک خوبرو وزیر صاحب نے عصمت آپا کو کھانے پر مدعو کیا۔ عصمت آپا نے ان کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست کے بجائے فلمی دنیا میں اپنی صلاحیتیں آزمائیں۔ انھوں نے عصمت آپا کی تعریف کرتے ہوئے کہا آپ کی پرسنالٹی بہت شاندار ہے آپ کو تو کسی ریاست کا گورنر ہونا چاہیے۔ عصمت آپا بڑی معصومیت سے بولیں ''میرا بس چلے تو میں بہرائچ کی گورنر بن جاؤں''۔ ایک زبردست قہقہہ لگا اور میں دل ہی دل میں خجل ہو گئی تھی کہ میں اس بار بھی بہرائچ کا وعدہ پورا نہ کر سکی تھی۔

اسی لیے اس وقت بہرائچ کی سرزمین پر کھڑی میں خود کو بہت ہلکا اور مطمئن محسوس کر رہی تھی۔

بہرائچ کے راستے میں عصمت آپا اپنی بچپن کی یادوں کے ساتھ ساتھ بالے میاں اور نابینا زہرہ بی بی کی شادی، رات کے وقت بارات کی دھوم دھام پھر آندھی میں بارات کی بھیڑ کا منتشر ہو جانا تفصیل کے ساتھ دہراتی رہی تھی۔ یادوں کی یورش نے انھیں بے چین کر رکھا تھا۔ تہبند اور لمبے کرتے پہنے ہوئے

عصمت آپا کی باتوں پر ہنستے ہوئے۔ جیلانی انور اور صبیحہ انور

فقیر جن کے گلے میں کوڑیوں اور رنگین پتھر کی مالائیں ہوتی تھیں ان کے ہاتھ میں جھنڈے ہوتے تھے جسے لگّی کہا جاتا۔ بالے میاں کا ذکر وہ کسی ہیرو کی طرح کر رہی تھیں جو غریبوں کو ظلم اور زیادتی سے بچانے کے لیے لڑتے لڑتے اپنی جان دے دیتا ہے۔ انھیں ریوڑی، ملیدہ، اور بتاشوں کے مزے بھی یاد تھے۔ اس وقت انھیں اپنے بچپن کی سہیلیاں صغریٰ اور بتول بھی یاد آ رہی تھیں جن کے گھر کا املی کا گھنا پیڑ دیوار پار کر کے دوسرے گھروں میں بھی پھیل گیا تھا۔ انھوں نے بمبئی کی ایک پارسی دوست کا بھی ذکر کیا تھا جو اکثر ان سے غازی میاں سے نت نئی فرمائشیں کرواتی رہتی تھی۔ یعنی منتیں منگواتی رہتی تھیں اور وہ سب پوری بھی ہو جاتی تھی۔ ''بھئی بڑی عزت رکھی ہے میری، میں تو غازی میاں کو اپنا بوائے فرینڈ کہتی ہوں۔'' عصمت آپا نے خود اپنا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا کیونکہ میں بہت حیرانی سے ان کا منھ تک رہی تھی۔

ہم دونوں جیسے ہی درگاہ کے پھاٹک میں داخل ہوئے۔ کئی سفید پوش لوگ جن میں شاید سجادہ نشین، اور درگاہ کے مجاور اور وہاں موجود دوسرے لوگ شامل تھے اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے وہ تمام لوگ بہت خوش اور پرجوش تھے۔ تعارف کرانے کی ضرورت ہی نہ پڑی ایک صاحب کہہ رہے تھے'' بہت انتظار کروایا آپ نے میرا دل کہتا تھا کسی دن آپ ضرور آئیں گی''۔ کوئی کہہ رہا تھا'' آپ نے اتنا بہرائچ کا ذکر کیا اور لکھنؤ تک آ کر آپ بہرائچ نہ آئیں۔'' ہم لوگوں نے گیٹ پر موجود لوگوں سے درگاہ سے ملی ہوئی ڈپٹی کلکٹر صاحب کی کوٹھی کے بارے میں پوچھا تھا جواب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی، شاید انھیں لوگوں نے اندر عصمت آپا کی آمد کی اطلاع کر دی تھی۔ یہ عام لوگ تھے، ادب نواز تھے مگر کوئی ادبی باتیں نہیں کر رہا تھا، انھیں اس مجمع سے یہ تو اطمینان تھا کہ کوئی ان سے 'لحاف'، 'گیندا' یا 'ننھی کی نانی' کی بات نہیں کرے گا۔ ایک بار عصمت آپا نے مجھ سے کہا تھا میں 'لحاف' پر بہت بات کر چکی اب اس کا ذکر بھی پسند نہیں۔ کوئی مجھ سے 'لحاف' کی بات کرتا ہے تو دل چاہتا ہے اس سے بات ہی نہ کروں۔ جیسے میں نے لحاف کے علاوہ اور کچھ لکھا ہی نہیں۔ عصمت آپا اس پرجوش استقبال سے بہت خوش تھیں۔ ان کا بے ساختہ لہجہ، بے تکلف طرز تکلم اپنے ساتھ بھیڑ لے کر چل رہا تھا۔ یہ پذیرائی دیکھ کر احاطے میں موجود دوکاندار جن میں تسبیح، ٹوپی بیچنے والے، کالے دھاگے میں لپٹے ہرے لال پلاسٹک کے تعویز بیچنے والے ان کی طرف لپکے اور اپنا سامان عصمت آپا کو اس طرح پیش کرنے لگے جیسے بادشاہ یا کسی بزرگ کو نذر پیش کی جاتی ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ اتنی طوالت اور زحمت اٹھانے کے بعد عصمت آپا خوش تھیں۔ انھوں نے کروشیا کی ٹوپی والے کی درخواست پر ایک ٹوپی لے لی تھی۔

درگاہ کی عمارت چاروں طرف دالانوں سے گھری تھی، بائیں ہاتھ کے دالان کو پار کر کے درگاہ کا آفس تھا جہاں چائے، کولڈ ڈرنک، بسکٹ اور دوسرے لوازمات کے ساتھ ہمارا باقاعدہ استقبال ہوا۔ وہاں بیٹھ کر پھر انھوں نے غازی میاں کو یاد کیا۔ الائچی دانے، گٹے، بھنے چنے اور ملیدہ کے بارے میں بھی پوچھا۔ ابھی تک سفید ساری کا آنچل سر پر تھا، ذرا دیر میں انھوں نے سر پر ٹوپی لگالی، لوگوں نے اسے ان کا جوش عقیدت سمجھا کچھ کھسیاہٹ ہوئی وہ آرام سے ٹوپی لگائے کولڈ ڈرنک پی رہی تھیں۔ میں نے ہاتھ میں ٹوپی دیکھ کر پوچھا تھا'' اس کا کیا کریں گی''۔ ''میرے بوائے فرینڈ کی نشانی ہے سر پر رکھوں گی''۔

مگر ایک بات تھی جو مجھے بے چین کر رہی تھی کہ ان لوگوں میں کوئی ایسا نہ تھا جس کو درگاہ کی چہار دیواری سے ملحق کوئی کوٹھی یاد ہوتی۔ ڈپٹی کلکٹر صاحب کی کوٹھی جس کے برآمدے سے ملا

گول کمرہ تھا، کمرے کے دروازوں کے شیشے ہرے لال نیلے تھے، دروازوں کے اوپر کی چھتریوں میں بھی رنگین شیشے لگے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر آنگن کے دونوں طرف دالان اور کمرے تھے۔ کونے میں کنواں تھا۔ ایک طویل صحنچی کے برابر باورچی خانہ اور کوٹھریوں کی قطار تھی۔ باورچی خانے والی صحنچی کے پاس نیبو کے درخت پر کمرخ کی بیل پھیلی تھی، مگر اس وقت وہاں کوئی ایسا نہ تھا جس نے یہ سب دیکھا ہو۔

وہاں موجود لوگوں کے اصرار پر وہ سب کے ساتھ درگاہ کے آنگن میں مزار کی طرف گئیں ضرور مگر راستے سے ہی واپس آگئیں۔ درگاہ میں مریدوں کی بھیڑ بہت تھی۔ عرس کا زمانہ قریب تھا اس وقت عصمت آپا کے چہرے پر اکتاہٹ آگئی تھی اور ساری خوشی دھیرے دھیرے کافور ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس پل مجھے خیال آیا کہ عصمت آپا کو بہرائچ نہیں لانا چاہیے تھا۔ وہ بہرائچ جہاں ابا اور اماں تھے، منے بھائی، ننھے بھائی، شمیم اور چنو کی شرارتوں، شوخیوں کی ایک دنیا آباد تھی۔ بچپن کی یادیں وقت کی جھیل کی تہہ میں آرام سے ٹھہری ہوئی تھیں۔ یہاں آکر اس پرسکون جھیل میں وقت کی سچائی اور حال کی نیرنگی کا پتھر نہیں پھینکنا چاہیے تھا۔ یہ 1987 کی گرمیاں تھیں۔ عصمت آپا یونہی بہت تنہا ہو چکی تھی انھیں اور تنہا کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ وقت سے ہار نہیں ماننا چاہتی تھیں۔ ان کے سوچنے کا انداز کچھ اس طرح تھا۔

''ہم دس بھائی بہنوں میں سے دو کے اولاد نہیں ہوئی آٹھ نے انتیس بچے پیدا کیے۔ جن میں سے تیرہ پاکستان چلے گئے سولہ ہندوستان میں رہ گئے۔

ہم دس بھائی بہن تھے مگر میں مرنے والوں کا ذکر نہیں کرتی ایسا لگتا ہے، ہم دسوں زندہ ہیں اور ہم اب بھی چھ بھائی اور چار بہنیں ہیں''

عصمت آپا نے اشارے سے ایک بوڑھے شخص کو جو خاصے سمجھ دار لگ رہے تھے، بلا کر کچھ پوچھا۔ وہ شاید تعزیے والا تاریخی واقعہ یاد دلانا چاہ رہی تھیں۔ جب شہر میں تعزیے کے جلوس کی وجہ سے تناؤ تھا۔ جلوس کے راستے میں پیپل کے درخت کی شاخیں اتنی پھیل گئی تھیں کہ اس کے نیچے سے گزرنے کے لیے تعزیہ کو جھکانا ضروری تھا۔ مگر نہ پیپل کی شاخ کٹ سکتی تھی نہ تعزیہ جھک سکتا تھا۔ خون خرابے کے پورے امکانات تھے عصمت آپا کے الفاظ میں ''تگڑے، تندرست لٹھیت گھوم رہے تھے۔ لکھنؤ سے بانکے بلاٹکٹ آرہے تھے، کاکوری ملیح آباد کے پٹے باز جمع تھے، ابا نے نویں کی رات میں اماں کو بتا دیا کہ فساد کی روک تھام کے لیے ان کی ڈیوٹی لگی ہے۔ اماں نے ماتم شروع کر دیا، ان کے گریبان میں جھول گئی تھیں۔'' یہ واقعہ عصمت آپا نے کئی بار سنایا تھا جب ان کے ابا نے انگریز کلکٹر سے اجازت لیے بغیر دور تک سڑک کھدوا کر گہری کروا دی تھی اور تعزیہ بغیر جھکے آرام سے سڑک سے گزر گیا تھا۔ مگر وہاں کوئی ایسا نہ ملا جس نے یہ واقعہ سنا ہو تا۔

وہ خود بھی کچھ گھبرا سی گئی تھیں ان کے چہرے پر تکان اور ہزیمت تھی جیسے کوئی خوبصورت خواب بیچ سے ٹوٹ جائے اور پتہ چلے کہ کچھ بھی تو نہیں ہے، لاکھ دہراتے رہیے، خوش ہوتے رہیے مگر کوئی ثبوت کوئی نشان باقی نہیں۔

ہم بھیڑ سے ہٹ کر ایک پیڑ کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ چاروں طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی میں نے عصمت آپا کو رائے دی کہ کیوں نہ ہم چل کر تھوڑی دیر گاڑی میں بیٹھیں۔ لکھنؤ سے ساتھ لایا ہوا کھانا کھائیں۔ پھر درگاہ والوں سے مل کر خدا حافظ کہیں اور لکھنؤ چلیں۔ راستہ بہت طویل ہے۔ مزار سے تھوڑی دور پر چار دیواری کے آخری سرے پر مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ ایک طرف چار دیواری ٹوٹی ہوئی تھی۔ چونے کاری کا سامان پھیلا تھا۔ 14 مئی سے شروع ہونے والی عرس کی تاریخیں قریب تھیں۔

میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولیں ''آؤ ادھر چلتے ہیں''، میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھیلی ہوئی اینٹوں پر سے ہو کر ہم دونوں چار دیواری کے دوسری طرف پہنچ گئے۔ دیوار کے پاس کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے اور ہم پھاٹک کے مقابل والی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ زمین اونچی نیچی تھی۔ پرانی عمارتوں کا انگڑ کھنگڑ ڈھیر تھا۔ وہیں گھاس اور ملبے میں دبی چھوٹی سی سبک مگر خستہ حال دو تین سیڑھیاں ایک طرف اترتی دکھائی دیں۔ عصمت آپا نے ان سیڑھیوں پر اپنے دونوں قدم اس طرح مضبوطی سے جمائے کہ میں ڈری کہ ان کا کیا بھروسہ کہیں اتنی تیز دھوپ میں یہیں بیٹھ نہ جائیں۔ مگر اچانک وہ سیڑھیاں اتر کر بے تابی سے چلتی ہوئی ایک میدان کے بیچوں بیچ پہنچ گئیں۔ ''ارے یہی تو ہے وہ گھر'' وہ آنگن میں کھڑی تھیں چوکور وسیع آنگن جس کے چاروں طرف کبھی دالان اور کمرے رہے ہوں گے۔ سرکار کا گول کمرہ۔ جس میں کبھی رنگے برنگے شیشے لگے ہوں گے، انھیں یاد تھا۔ کمرے کے برابر میں ایک چھوٹا کمرہ تھا جہاں سے اندر ہی اندر سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ چاروں طرف ملبے کا ڈھیر تھا، مگر انھیں وہاں سب کچھ نظر آرہا تھا۔ مارے خوشی کے ان کی سانسیں تیز چل رہی تھیں۔ میں ذہن میں کوئی نقشہ بنانے سے قاصر تھی۔ کہیں کہیں عمارت کے آثار تھے۔ ''وہاں باورچی خانہ تھا، اُدھر کے دالان میں ہمارے ننھیال کا خیمہ اور ددھیال کا خیمہ ادھر'' یہ قصہ وہ کئی بار سنا چکی تھیں۔

وہ فخریہ انداز میں کہتیں ''ہمارے ننھیال اور ددھیال کے بیچ عجیب گھپلہ تھا۔ ددھیال والے چنگیز اعظم کی اولاد تھے جو اپنے کو مرزا نہیں بلکہ میرزا کہتے وہ خطاب جو خون کی ندیاں بہا کر حاصل کیا گیا تھا وہ انسانی کھوپڑیوں کے انبار اور گھوڑے کے سموں کا ذکر کرتیں جو انسانی خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بڑی مصیبت تھی کہ دوسری طرف نانیہال والوں کا ناطہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ سے جا ملتا تھا۔'' وہ کہتیں ''پتلی مونگ کی دال کھانے والے مولوی۔ کوئی سرا شیخ سلیم چشتی سے بھی جا ملتا تھا اس لیے ددھیال والے ان کو مجاور بھی کہتے تھے۔'' وہ کہتیں ''پتہ نہیں شیخوں میں شادی کر کے ابا نے یہ گھپلہ کیوں کر دیا مگر مصیبت یہ تھی کہ میرا نانیہال کے شیخوں کا پتلا پانی خون، دادھیال کے کارنامے سن کر فخر سے کھولتا نہیں تھا بلکہ کم ہمت اور ڈرپوک چوہے کی رطوبت کی طرح میری آنکھوں سے چھلک اٹھتا۔''

درگاہ کے پیچھے والی اس کوٹھی کے ملبے میں کھڑی عصمت آپا دھیرے دھیرے اپنی جون میں واپس آرہی تھیں۔ بیچ میں کھڑے ہو کر انھوں نے اپنے دونوں ہاتھ گھڑی کی سوئیوں کی طرح پھیلا دیے۔ یہ نانیہال والے۔ وہ دادھیال کا مورچہ۔ انھوں نے آمنے سامنے اشارہ کیا، ادھر باورچی خانہ۔ اس کے برابر نیبو کے پیڑ پر پھیلی ہوئی کمرخ کی بیل۔ ہم لوگ آنگن کے

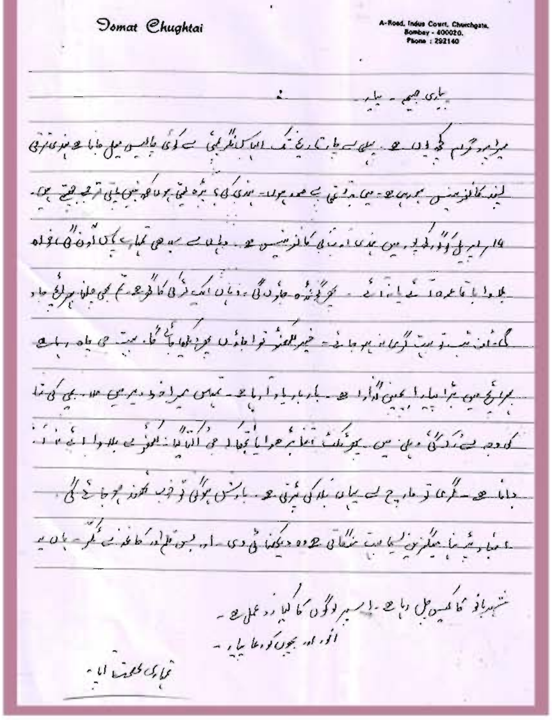
Ismat Chughtai

A-Road, Indus Court, Churchgate,
Bombay - 400020.
Phone : 292140

اس گوشے کی طرف بڑھے جہاں ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر میں پڑے لکڑی کے کھمبوں کے درمیان گھاس پھوس اور خودرو جنگلی بیلیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ کر دیکھا بیل میں پیلی ہری چھوٹی چھوٹی کمرخیں لگی ہوئی تھیں۔ بیل کو ہاتھ سے پکڑ کر اونچا کیا۔ کمرخیں قندیل کی طرح ایک قطار میں نیچے لٹکنے لگیں۔ میں نے دیکھا عصمت آپا کے چہرے پر سکون اور یقین کی سرخ بدلی سی چھا گئی۔ عصمت آپا بالکل جذباتی نہ تھیں۔ بے حد پریکٹیکل خاتون تھیں۔ مگر اس وقت ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہوکر چمک رہا تھا۔ ان کو وہیں روک کر ٹیلے پر چڑھ کر میں نے بہت سی کمرخیں توڑیں پانی کو ترستی ہوئی چھوٹی چھوٹی کمرخیں۔ عصمت آپا نے آگے بڑھ کر کمرخیں اپنی ساری کے آنچل میں لے لیں۔ ان کی تمام یادیں یقین بن کر سامنے آ گئیں تھیں۔ اب ان کو دادھیال سائڈ کے دالان سے قریب اس باولی کی تلاش ہوئی جس کی جگت کے پاس قدسیہ خالہ نے اپنی چپلیں چھوڑی تھیں اور صبح پورے گھر میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ میاں کی یاد میں غمگین رہنے والی سدا کی روگی قدسیہ خالہ کا پلان بہت زوردار تھا۔ میں یہ واقعہ سن اور پڑھ چکی تھی۔ مگر بہرائچ کے گھر کے ساتھ باؤلی بھی ضروری تھی، وہ باولی جو استعمال کم ہی ہوتی تھی مگر گھر بھر کو اپنی موجودگی سے ڈراتی رہتی تھی گھر کے کھنڈر میں کہیں نہیں ملی۔

ہم دونوں دھیرے دھیرے اسی راستے سے واپس آ گئے۔ گھر کے اندر کا نقشہ تو وہی تھا مگر وہ پھاٹک جس پر دو گھوڑے باندھے جاتے تھے اور مالی، دھوبی، گراس کٹ، کوچوان اور اوپر کے کام کے نوکر بیٹھے رہتے تھے۔ وہ کہاں گیا؟ میں تو عصمت آپا کی یادوں کی انگلی پکڑ کر چل رہی تھی۔ ان کے حافظے پر مجھے پورا یقین تھا۔

غیر معمولی حافظے کے علاوہ ان کی ایک اور بات بہت یاد آتی ہے کہ عصمت آپا میں بولنے کی غیر معمولی طاقت تھی کہتی تھیں ''ہمارا خاندان غیر معمولی 'بکو' ہے۔ ہم چلتے پھرتے، کھاتے پیتے باتیں کرتے ہیں، بحث کرنا ہمارا مشغلہ ہے۔ بتاتی تھیں کہ ''عظیم بھائی زبانی بحثوں، معرکوں اور جنگوں کو ''چورن بانٹنا'' کہتے تھے۔ یعنی یہ کھانے کے بعد کا چورن تھا جس سے کھانا ہضم ہوجاتا، باتیں، بس باتیں، راہ چلتوں سے، نوکروں سے، ڈرائیوروں سے راہ گیروں سے باتیں۔''

میرے گھر میں بھی نوکروں سے اور مختلف آنے جانے والے لوگوں سے ان کی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ سب سے برابر سے باتیں کرتیں۔ اصرار کر کے چائے یا شربت پلواتیں، اس زمانے میں ہمارے گھر کے نوکروں میں نصیبن کی اماں ایک خاص کردار تھیں۔ خود تو نوکر نہ تھیں، ان کا بیٹا پریس میں کام کرتا، وہ دن بھر اُوم گھوم کر ہمارے گھر یا پریس میں رہتیں۔ غضب کی باتونی، اور شرارتی عورت تھیں، خود بھی اپنی شرارتیں اور بے وقوفیاں مزے لے لے کر سناتی تھیں، اتنے دنوں میں عصمت آپا سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہوگئی تھیں۔ ایک دن میں نے ان کو اکیلے میں لے جا کر سمجھایا کہ ''تم کو معلوم بھی ہے کہ یہ کون ہیں، بہت قابل بہت بڑی آدمی ہیں۔ پوری دنیا میں ان کا نام ہے، ان سے بہت تمیز سے بات کیا کرو۔'' نصیبن کی اماں رازدارانہ لہجے میں بولیں ''مگر سگریٹ بہت پیتی ہیں۔'' میں نے کہا ''تم کو کیا ان کا شوق ہے جو چاہے کریں۔'' پھر قبولیں کہ ''ہم کا بھی روج پلاوت ہیں۔'' مجھے ہنسی بہت آئی مگر یقین نہ آیا عصمت آپا سے پوچھا تو دیر تک ہنستی رہیں۔ کہنے لگیں ''غضب کی عورت ہے بات کرو تو پتہ چلتا ہے کہ بات کرنے کے لیے عالم فاضل ہونے کی شرط نہیں۔ اس سے بات کر کے دماغ کی کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ میں تو اسے روز سگریٹ پلاتی ہوں کہ بیٹھ کر بات کرے پوری زندگی کا خلاصہ ہے یہ عورت۔''

رخصت ہوتے وقت بالے میاں کی درگاہ سے عصمت کو ایک مخملی چادر، مٹھائی اور بہت سے تبرک دیے گئے۔ بالے میاں سے متعلق کئی کتابچے بھی تھے۔ واپسی پر وہ بہت خوش تھیں، یادوں کے نئے نئے دروازے کھل گئے تھے، ان کا بچپن اسی طرح ان کے ساتھ تھا راستے میں کئی بار انھوں نے پرس سے نکال کروہ کروشیہ کی ٹوپی بھی سر پر لگالی تھی۔

(حالانکہ چند سال بعد اسی حافظے نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، سنا تھا وہ اکیلی بیٹھی رہتی تھیں کسی کے پاس ان سے باتوں کا بھی وقت نہ تھا)

ہم لوگ واپس آ کر درگاہ کی طرف والے دالان سے ملحق کمرے میں داخل ہوئے یہاں سب کھانے کے لیے ہمارے منتظر تھے۔ اندر کمرے میں کھانا لگا تھا میرا ڈرائیور بھی ناشتے دان دے گیا تھا۔ موجود لوگوں نے اندر کمرے میں چلنے کی درخواست کی کھانا وہیں لگا تھا، ہم اندر کمرے میں داخل ہوئے... یہ ایک گول کمرہ تھا ایک طرف نصف دائرے میں پانچ دروازے تھے جن پر مٹ میلے شیشوں کے بیچ کچھ رنگین شیشے بھی باقی رہ گئے تھے۔ دروازوں کے اوپر کی رنگین چھتریوں کے نصف دائروں میں سب رنگین شیشے موجود تھے۔ سامنے کی دیوار کے ایک کونے میں پتلا سا دروازہ تھا۔ کھانا ختم ہوتے ہی رومال سے ہاتھ پونچھتی ہوئی عصمت آپا بغیر کچھ بولے اس دروازے کی طرف بڑھیں۔ میں ان کے پیچھے تھی۔ اس چھوٹے کمرے میں اندر ہی اندر سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔ آگے عصمت آپا اور پیچھے میں سیڑھیوں سے اوپر چھت پر پہنچے، کھلی چھت چاروں طرف پرانی وضع کا لوہے کا کٹہرہ ہمارے گھٹنوں تک تھا ہم دیر تک وہاں کھڑے رہے۔ اوپر سے درگاہ کا صحن۔ دالانوں کے بہت سے سجے سجائے در اور مزار کی طرف جانے والا راستہ سامنے تھا عقیدتمندوں سے بھرا ہوا۔ درگاہ کے اندر اور چار دیواری کے باہر چھوٹے بڑے خیمے اور چھولداریاں لگی تھیں۔ عصمت آپا بار بار ٹٹول کر کٹہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ کٹہرہ وہی تھا مگر انھیں اس کے نیچے ہوجانے پر تعجب تھا۔ ان کی یادوں میں شاید کٹہرہ اونچا تھا۔ وہ یادوں میں گم تھیں میری ہمت نہ ہوئی کہ ان سے کہوں کہ یہ وقت کی عیاری ہے کہ آپ کو اونچا کر کے، چپکے سے گزر گیا۔ چھت بڑی تھی مگر ان کی یادوں جیسی غیر معمولی بڑی نہیں تھی۔ ان کو اس پر بھی تعجب تھا۔ دور دور بھٹے کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ سامنے چمکدار کالی سڑک پر موٹریں، رکشے اور سائیکلیں بھاگ رہی تھیں۔

ننھیالی اور ددھیالی پڑاؤ والے دالانوں کے گھر کا میدان اسی چھت کے نیچے دکھائی دے رہا تھا جہاں ہم اس وقت کھڑے تھے رنگین شیشوں والے گول کمرے کے دروازے کبھی اسی آنگن میں کھلتے تھے۔ ان دروازوں کے سامنے گولائی میں بنی ہوئی لکھوری اینٹوں کی سیڑھیاں کوڑے اور کاٹھ کباڑ میں چھپ گئی تھیں اسی کونے میں پتلی سی جگت والا کنواں جسے عصمت آپا باولی کہہ رہی تھیں اتنی اونچائی سے مجھے نظر آ گیا۔ میں نے عصمت آپا کو کنویں کی موجودگی کی اطلاع دی۔ کنواں دیوار کے قریب جھاڑیوں سے چھپا ہوا تھا۔ کنویں کی گہرائی میں پانی پر نیلا آسمان تارے کی طرح چمک رہا تھا۔ کنویں کو دیکھ کر جیسے کھنڈر کا نقشہ ان پر پوری طرح واضح ہوگیا تھا۔ وہ بالکل مطمئن اور خوش خوش نیچے آ گئیں۔

رخصت ہوتے وقت بالے میاں کی درگاہ سے عصمت کو ایک مخملی چادر، مٹھائی اور بہت سے تبرک دیے گئے۔ بالے میاں سے متعلق کئی کتابچے بھی تھے۔ واپسی پر وہ بہت خوش تھیں، یادوں کے نئے نئے دروازے کھل گئے تھے، ان کا بچپن اسی طرح ان کے ساتھ تھا راستے میں کئی بار انھوں نے پرس سے نکال کر وہ کروشیہ کی ٹوپی بھی سر پر لگالی تھی۔ میں خوش تھی کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ یہ سفر ایک مقام کی نہیں بلکہ ایک کیفیت کی بازیافت تھا۔ اس سفر میں مَیں ان کے ساتھ تھی۔ یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات تھی۔

■

Dr. Sabeeha Anwar., Nami Press Building Nakhas, Lucknow - 3 (UP)

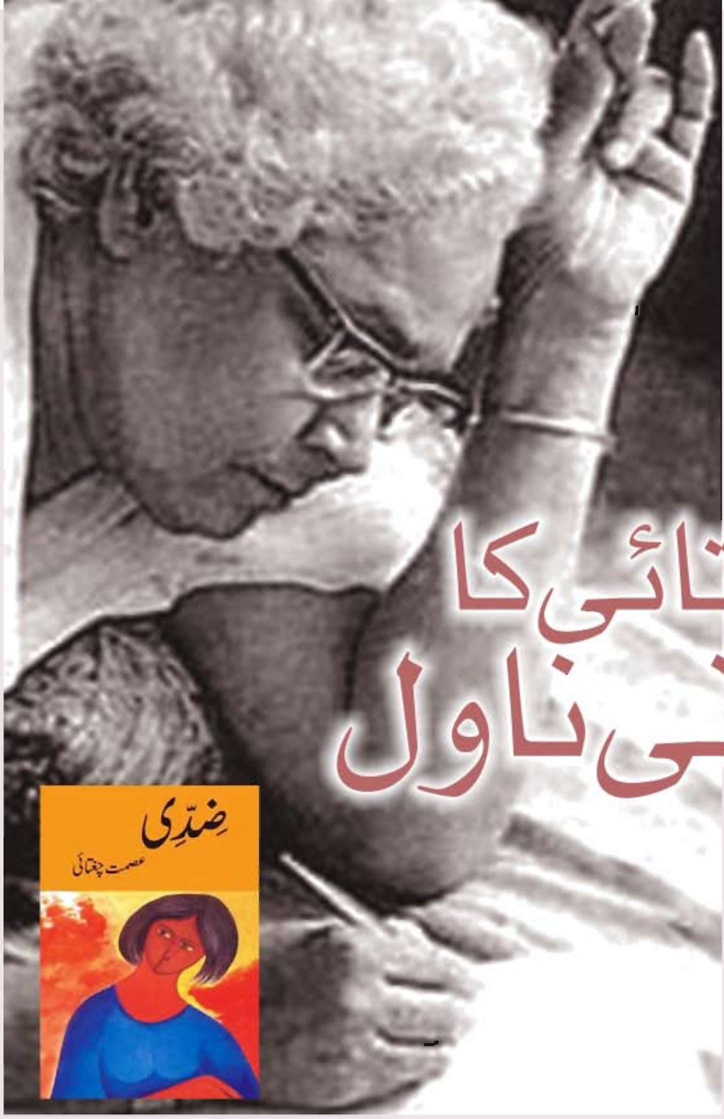

صالحہ زریں

عصمت چغتائی کا پہلا رومانی ناول ضدّی

128 صفحات پر مشتمل 'ضدّ ی' عصمت چغتائی کا پہلا ناولٹ ہے جو 41-1940 میں لکھا گیا۔

اس ناولٹ میں مرکزی کردار پورن اور آشا ہیں۔ پورن سنگھ ایک امیر زمیندار کا لڑکا ہے۔ پورن کو زمیندار ہونے کا ذرا بھی گھمنڈ نہیں ہے مگر اس کے باپ کو اپنے پیسوں پر بہت گھمنڈ ہے۔ پورن کو اونچی ذات اور نیچی ذات اعلیٰ و ادنیٰ میں کسی قسم کا فرق نظر نہیں آتا۔ وہ سب کو برابر سمجھتا ہے کہ سب انسان ہیں اور سبھی کے پاس دھڑکتے ہوئے دل اور جذبات ہیں۔ شاید اسی خیال کی وجہ سے وہ اپنے گھر کی نوکرانی آشا سے عشق کرنے لگتا ہے۔ آشا ایک قبول صورت لڑکی ہے وہ پورن سنگھ کے بیمار ہونے پر بے پناہ خدمت کرتی ہے اور آشا بھی قریب رہ کر پورن سنگھ سے محبت کرنے لگتی ہے مگر وہ اپنی حیثیت جانتی ہے کہ شاید گھر والے بہو کے روپ میں مجھے قبول نہ کریں کیونکہ میں کم ذات ہوں۔ ان سب کے باوجود پورن اور آشا کی محبت دھیرے دھیرے پروان چڑھتی ہے۔ پورن کے گھر میں ایک اور لڑکی گھر کا کام کاج کرتی ہے جس کا نام چمکی ہے۔ چمکی بھی دل ہی دل میں پورن سے محبت کرنے لگتی ہے۔ ایک دن آشا گلدان کو پورن کے من پسند پھولوں سے سجا کر اس کے کمرے میں میز پر رکھ آتی ہے تبھی تھوڑی دیر کے بعد چمکی وہاں آ جاتی ہے اور وہ پھولوں کو اٹھا کر موری کے پاس پھینک دیتی ہے۔ پورن سے محبت کرنے کی وجہ سے وہ آشا سے رقابت کی آگ میں جلتی رہتی ہے۔ پورن وہ پھول اٹھا کر اپنی میز کی دراز میں رکھ لیتا ہے۔ یہی پھول آشا کی محبت کی نشانی یا سمبل بن جاتا ہے۔ ایک دن گاؤں میں بازار لگتا ہے وہاں پر پورن آشا کو چمکی اور گاؤں کے ایک لڑکے رجنی کے ساتھ ہنستے بولتے دیکھتا ہے تو تلملا اٹھتا ہے اور برملا آشا سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد پورن آشا کو ہمیشہ کے لیے اپنا بنانا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ شادی کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔ لیکن گھر والے آشا کی غریبی اور نیچ ذات ہونے کی وجہ سے شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتے اور آشا کو پورن کی نظروں سے دور کرنے کے لیے اس کی بہن کملا کے گھر بھیج دیا جاتا ہے۔ آشا کو بھیجنے کے بعد پورن کی شادی گھر والے کملا کی نند شانتا سے کر دیتے ہیں۔ لیکن پورن اس شادی کے لیے رضامند نہیں ہوتا اور وہ رات دن آشا کی یاد کو دل سے لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے بھیا بھابھی سب منا منا کر تھک جاتے ہیں آخر کار اسی صدمے کی وجہ سے پورن سنگھ بیمار رہنے لگتا ہے۔ بھابھی پورن کو ماں کی محبت اور جذبات کو واضح طریقے سے سمجھاتی ہے اور اسے شانتا سے شادی کے لیے تیار کر لیتی ہے۔ اس کی بارات بڑے دھوم دھام سے لے جاتی ہے شادی کے شامیانے میں پورن اور آشا ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں اتفاق سے شامیانے میں آگ لگ جانے کی وجہ سے بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ پورن اس بھگدڑ میں شانتا کو چھوڑ کر آشا کو گلے لگا لیتا ہے۔ آشا کو شیام لال جو پورن کا بہنوئی ہے اسے وہاں سے ڈرا دھمکا کر بھگا دیتا ہے جب پورن اپنے گھر والوں کو ڈھونڈ کر واپس آتا ہے تو شانتا کو وہاں نہ پا کر ہوش و حواس کھو دیتا ہے شادی کے بعد پورن ساری زندگی شانتا سے ازدواجی رشتہ قائم نہیں کر پاتا۔ شانتا اپنے شوہر کی محبت کا لمبے عرصے تک انتظار کرنے کے بعد پورن کی بھابھی کے بھائی مہیش سے عشق کرنے لگتی ہے۔ یہ ساری باتیں پورن کے گھر والوں کو بری لگتی ہیں اور وہ پورن کو بتاتے ہیں۔ پورن ساری باتیں سننے کے بعد بھی شانتا کے لیے خراب قسم کا ردعمل نہیں ہوتا اور کہتا ہے "اگر وہ مہیش سے محبت کرتی ہے تو کرے مجھے کیا کرنا۔" پورن سنگھ کی حالت دھیرے دھیرے بگڑنے لگتی ہے۔ گاؤں سے آشا کو اس کی

تیمارداری کے لیے بلایا جاتا ہے۔ پورن آشا کو دیکھ کر اپنی باہوں میں لے لیتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے اور آشا بھی اسی کے ساتھ جل کر مرجاتی ہے۔

عصمت نے اس پورے ناولٹ میں صرف پورن اور آشا کی محبت کے ذریعے دھرم اور مذہب کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی ہے لہٰذا اس وجہ سے یہ ناولٹ سماج کی اصلاح کا بھی کام کرتا ہے۔ اس ناولٹ کا میکپ اور مزاج رومانی قسم کا ہے جو اس دور میں جب کرشن چندر اور عزیز احمد ایسی کہانیاں لکھ رہے تھے تو یہ رنگ بہت پسند کیا جاتا تھا۔ پھر بھی عصمت نے ایک اہم سماجی مسئلے کو ترقی پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ عصمت نے اس ناول کا پلاٹ ترکی کے ایک مشہور ناول نگار نامق کمال کے ناول سے لیا ہے۔ اور اسی کہانی کو ہندوستانی سیٹنگ میں پیش کر دیا ہے۔ عصمت کا دور زمیندارانہ دور تھا اور وہ اس دور کو اتنے قریب سے دیکھ رہی تھیں کہ اوپری طبقہ کس طرح نچلے طبقہ پر حاوی ہو رہا تھا۔ اور اس کو کس طرح اپنی زور زبردستیوں کا شکار بنا رہا تھا۔ یہ سرمایہ دار طبقہ ان سے اپنی خدمت بھی کراتا ہے اور ان کے جذبات کو کچلتا بھی ہے۔ لہٰذا اعلیٰ طبقے کی نظر میں ادنیٰ طبقے کی نہ کوئی عزت ہے نہ کوئی وقعت دوسری طرف سماج کا یہ غریب اور پست طبقہ اپنی ساری زندگی ان کی خدمت میں گزار کر ختم ہوجاتا ہے۔

قاری اس مختصر سے ناولٹ کو پڑھنے کے بعد اگر چہ یہ محسوس کرتا ہے کہ دلچسپ عشق کے قصے کے سہارے اس کے سارے کے سارے کردار آپس میں بندھے رہتے ہیں۔ مگر ہر کردار کی اپنی اپنی شناخت ہے۔ گھر میں دیور بھابھی کے رشتے ہندوستانی طور طریقوں کے مطابق ایک دوسرے میں ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ ہے تو دوسری طرف ماں باپ کی عزت وقار بڑے بھائی بھابھی کا احترام وادب بھی اور اسی عزت و احترام کی خاطر پورن اپنی ساری زندگی تباہ کر ڈالتا ہے۔ ماں باپ کا کہنا ہے کہ اگر نیچ ذات کی لڑکی کو وہ اپنی بہو بنائیں گے تو ان کے خاندان پر بدنامی کا داغ لگ جائے گا تو دوسری طرف بیٹا ماں باپ کا دل نہ دکھا کر ان کی عزت کی خاطر اپنی جان تک گنوا دیتا ہے۔ یہ اعلیٰ طبقہ اپنے خاندانی وقار کو اپنے بیٹے سے زیادہ عزیز رکھتا تھا تو بیٹا بھی کم ضدی نہیں کہ وہ کسی کو عشق میں دھوکہ نہیں دے سکتا۔ پورن ایک طرح سے اپنا بدلا پورے خاندان اور سماج سے خاموش بغاوت کے ذریعے سے لیتا ہے۔ مگر پھر بھی اسے کامیابی نہیں ملتی۔ جب اس کی بیوی شانتا گھر کے دوسرے رشتے دار سے عشق کرتی ہے تو پورن یہ سب کچھ جان کر بھی خاموش رہتا ہے اور خاندان پر بدنامی کا داغ لگنے سے خوش ہوتا ہے اور اس کے سینے کی آگ ٹھنڈی پڑتی معلوم ہوتی ہے۔ پورن کا یہ دھیما دھیما اور دبا دبا احتجاج گھر والوں کے خلاف تھا جس کو گھر والے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے:

''مگر محبت میں ٹھوکریں جتنی خدا نے لازمی سمجھی ہیں اتنی تو اچھی نہیں لگتی ایک ٹھوکر تو وہ ہوتی ہے جس میں رقیب صاحب کی ایک جھلک سے دماغ بھنا جاتا ہے۔ لیکن جوں ہی بادل چھٹے پھر چاندنی ہے کبھی رنجش بھی ہوجاتی ہے لیکن یہ تو فلاسٹوپ کی طرح جملہ کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔ ایک اور بڑی ٹھوکر ہے جو یار لوگ جان بوجھ کر لگاتے ہیں اور وہی ہوتی ہے سماج کی دولتی۔ اس میں گر نکلا چلا گیا تو خیر ورنہ کھائی تو سامنے ہی ہے سب ٹھوکریں انسان سہہ جاتا ہے پر سماج کی ٹھوکر سے

عصمت نے اس پورے ناولٹ میں صرف پورن اور آشا کی محبت کے ذریعے دھرم اور مذہب کی تفریق کو مٹانے کی کوشش کی ہے لہٰذا اس وجہ سے یہ ناولٹ سماج کی اصلاح کا بھی کام کرتا ہے۔ اس ناولٹ کا میکپ اور مزاج رومانی قسم کا ہے جو اس دور میں جب کرشن چندر اور عزیز احمد ایسی کہانیاں لکھ رہے تھے تو یہ رنگ بہت پسند کیا جاتا تھا۔ پھر بھی عصمت نے ایک اہم سماجی مسئلے کو ترقی پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ عصمت نے اس ناول کا پلاٹ ترکی کے ایک مشہور ناول نگار نامق کمال کے ناول سے لیا ہے۔ اور اسی کہانی کو ہندوستانی سیٹنگ میں پیش کر دیا ہے

تلملا اٹھتا ہے۔ کیا کیا کتابوں میں قصے کہانیوں میں سماج کی ٹانگ گھسیٹی، مگر سماج ہے کہ شیر کی طرح ڈٹا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ یہاں سماج کا نام ہے اور ٹکر ہوتی ہے انسان سے خود اپنے پیارے دل کے ٹکڑوں سے۔''

(ضدی، 69،70)

پورن ایسا کر کے فرسودہ اور قدیم رسم ورواج سے متعلق نئی نسل کو ایک پیغام ضرور دے جاتا ہے۔ ناولٹ میں عصمت نے جو کردار پیش کیے ہیں ان میں نفسیاتی ردعمل کے ذریعے روزمرہ کی زندگی کو پیش نظر رکھ کر سماج کی خرابیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔

عصمت کا یہ ناولٹ اگر چہ ایک طرف سماج کی اصلاح کرتا ہے تو دوسری طرف وہ اس بڑی خرابی کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے۔ عصمت کی نظر میں ذات پات اعلیٰ وادنیٰ کی تفریق کو اگر ختم کیا جاسکتا ہے تو صرف جذباتی رشتوں کے ذریعے۔

قاری کو ناول کے آغاز ہی میں اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ عصمت نے اس طبقاتی کش مکش کو بڑی حد تک محسوس کیا ہے۔ اس لیے وہ ناولٹ کے پلاٹ کو گھر کے افراد کے ذریعے بن کر تیار کر دیتی ہیں۔ ناولٹ میں کرداروں کی باہمی ٹکر، تکرار، بحث ومباحثہ بڑوں کا ادب واحترام عزت ووقار چھوٹوں کی محبت عورتوں کے لحاظ کا بڑی حد تک پاس رکھا گیا ہے۔ آپس کے جذباتی رشتے ہیں تو وہ بھی شرم وحیا کے دائرے میں۔ ناولٹ فلم کی اسٹوری کا سا مزہ دیتا ہے۔ جس طرح فلموں میں آخر وقت میں ہیرو اور ہیروئن ملتے ہیں اور اپنی زندگی کو اپنی محبت پر قربان کر دیتے ہیں ٹھیک اسی طرح اس ناولٹ کا خاتمہ بھی ایک دوسرے کی محبت کی قربانی پر ختم ہوجاتا ہے۔

یہ ناولٹ رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زندگی میں ہونے والی محبت، حسد، رقابت بغاوت جو بہت کچھ انسانی فطرت ہے جو تلخ تجربات اور واقعات کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں۔ ناولٹ میں کہیں کہیں حقیقت نگاری اور رومانیت کا ملا جلا روپ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ حقیقت اس بات کی کہ گھر خاندان ذات پات اعلیٰ ادنیٰ جھوٹی روایت پرستی اور کھوکھلے سماج کی تصویر اس ناول میں عصمت بڑی باریک بینی اور خوبی سے کھینچتی چلتی ہیں۔ جس کی وجہ سے سماج کے فیوڈل Feudal طبقے کی جھوٹی شان وشوکت بھی نمایاں ہو کر منظر عام پر آتی ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''محبت میں ناکامی اور موت قصوں میں عام بات ہے لیکن طریق پیش کش، ماحول آفرینی اور کرداروں کے نفسیاتی ردعمل نے اس مختصر ناول کو خاص درجہ دیا ہے۔''

(معیار و میزان از ڈاکٹر مسیح الزماں، ص 184)

ڈاکٹر محمد اشرف اس ناول کے بارے میں دوسری جگہ کہتے ہیں کہ:

''عصمت نے اس ناول میں سماجی روایات میں بندھے کہنہ قوانین کا بھرپور مضحکہ اڑایا ہے۔''

(اردو فکشن کے ارتقا میں عصمت چغتائی کا حصہ از ڈاکٹر محمد اشرف ص 68)

اس ناولٹ میں بظاہر سماجی اصلاح کے دائرے میں محدود ہو کر بھی ایک عشقیہ اور رومانی اضطرابیت محسوس کی جاتی ہے۔ اگر چہ سماج میں اس وقت ذات پات اعلیٰ ادنیٰ کی تفریق ایک بڑا مسئلہ تو تھا ہی تاہم اس کے برے نتائج سماج پر خراب اثر بھی ڈال رہے تھے۔ مگر اس کو ختم کرنے کے لیے منظم طور پر تحریک کام کر رہی تھی۔ اسی وجہ سے ناولٹ میں جگہ جگہ عصمت کا ترقی پسندانہ رویہ اور نظریہ حقیقتوں کی شکل میں ڈھلتا ہوا نظر آتا ہے۔

Dr. Saleha Zarrin, 24/28, Sarojini Naydu Road, Civil Lines, Allahabad - 211001 (UP)

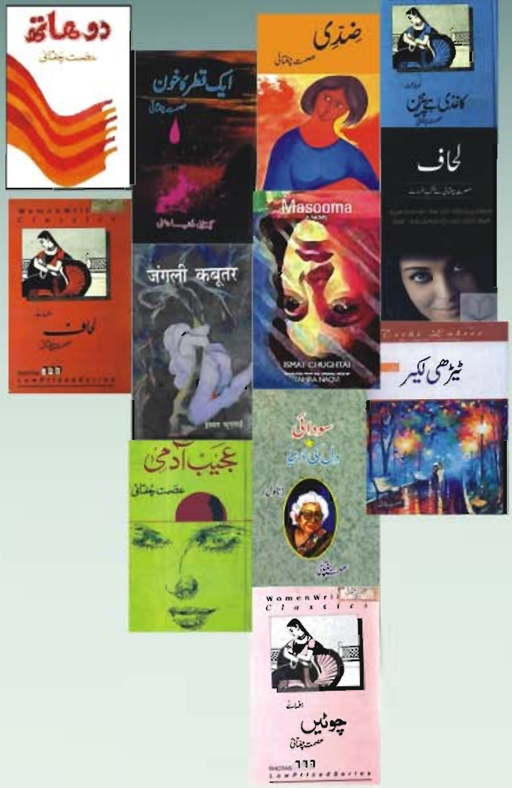

حامد رضا صدیقی

عصمت کی تحریروں میں مسائلِ نسواں

1932 میں 'انگارے' کی اشاعت نے اردو افسانہ نگاری کے موضوعات و مسائل اور ہیئت و اسلوب میں انقلاب پیدا کردیا تھا۔ ایشیا میں آزادی کی تحریکیں زور پکڑ چکی تھیں اور اپنی آزادی کے لیے مسلسل کوشاں تھیں۔ اردو افسانہ نگاری نہ صرف اس جدوجہد کی مختلف جہات کا عکس پیش کر رہی تھی بلکہ اس میں کارل مارکس اور فرائڈ دونوں کے نظریات بھی صاف صاف دکھائی دینے لگے تھے۔ 'انگارے' (دس کہانیوں کا مجموعہ) میں ہندوستانی معاشرے کے کریہہ پہلوؤں کی حقیقی تصویر کشی کی گئی تھی۔ دولت کی غلط تقسیم، جھوٹی مذہبیت اور سب سے بڑھ کر معاشرے میں پھیلی ہوئی ریاکاری، گھٹتے ہوئے ماحول کی نفسیاتی اور جنسی الجھنیں ان کہانیوں کے موضوعات تھے۔

عصمت چغتائی ابتدا میں حجاب اسماعیل سے کافی متاثر تھیں اور انھوں نے اچھے رومانی افسانے بھی لکھے مگر 'انگارے' کی رشید جہاں سے ملاقات (علی گڑھ اسکول) اور پھر علی گڑھ میں 'انگارے' کے مطالعے نے ان کے خیالات و نظریات میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کردی۔ بمبئی جاکر وہ ترقی پسند تحریک میں کلی طور پر شامل ہوگئیں اور وقت آخر تک اس تحریک سے وابستہ رہیں۔ انھوں نے اس تحریک کے سائے میں شاہکار افسانے لکھے۔

عصمت سے پہلے خواتین افسانہ نگاروں میں بیگم حجاب اسماعیل، رشید جہاں، مسز عبدالقادر کے نام لیے جاسکتے ہیں مگر عصمت نے مرد افسانہ نگاروں کی جاگیر میں اپنی تحریروں، تقریروں اور افسانہ نگاری کا لوہا منوایا جس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی ہے۔ ہاجرہ مسرور لکھتی ہیں:

''اب دیکھیے ڈاکٹر رشید جہاں نے جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ 'انگارے' نامی مجموعے میں شرکت کی تو کیا ہوا؟ سب سے زیادہ لعنت و ملامت اور فتوؤں کا نشانہ بنیں حالانکہ رشید جہاں معمولی سی سماجی تنقید سے آگے نہ بڑھی تھیں۔ اب ایسے عالم میں 'انگارے' والے ہنگامے کے تھوڑے عرصے بعد ہی عصمت چغتائی یوں آئیں جیسے جوالا مکھی پھٹ گیا ہو۔''[1]

عصمت چغتائی نے زندگی کے مختلف اور متنوع رنگوں سے اپنی کہانیوں کے بام و در کچھ اس طرح سجائے ہیں کہ انسانی فطرت کے ہزاروں نقوش اور رنگا رنگ کیفیات و جذبات ان میں سمٹ آئے ہیں۔ ان افسانوں میں کہیں جبر و استحصال، خوابوں کے ٹوٹنے بکھرنے کا منظر، تو کہیں رنگین جسموں کی رعنائیاں، شہزادوں کی عیاشیاں، روح کے ہنستے مسکراتے زخم، تو کہیں سارے جہاں کی اداسیاں سمیٹے چہرے، سسکتی چیختی عورتیں مختلف انداز اور روپ میں ہمارے سامنے آتی ہیں اور زندگی کی بے شمار حقیقتوں سے پردے اٹھائے جاتے ہیں۔ عصمت نے اردو افسانوں میں معاشرے کی گندگیوں کو کرید کرید کر نکالنے کی کوشش کی ہے اور غربت، مفلسی، عورتوں کے استحصال، بے جوڑ شادیاں، اوہام پرستی، جنسی عدم مساوات اور دیگر فرسودہ روایات سے پردہ اٹھانے میں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔

عصمت چغتائی نے بطور خاص مسائل نسواں، آزادیِ نسواں، حقوق نسواں اور ان کے مختلف مسائل اور خواہشات کا بیان کثرت سے کیا ہے۔ عورت ان کے تمام موضوعات کا مرکز و محور ہے۔ خود عصمت نے اس کا اظہار بارہا کیا ہے۔ ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

''میں نے زیادہ تر عورتوں کے مسائل پر لکھا ہے۔ عورتیں جو چھابڑی لگاتی ہیں، پیشہ کرتی ہیں، فلم ایکٹرس جب ہم فلم بناتے تھے تو ان میں کام کرنے کے لیے فلم ایکٹرس آتی تھیں، مجھے ان سے ان گنت کہانیاں ملیں۔''[2]

عصمت کے بارے میں یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ ان کی بیشتر کہانیاں گھر کی محدود فضا کے ارد گرد ہی گھومتی ہیں۔ گھر کے اندر کی صورت حال اس میں رہنے والی عورتیں، ان کی جنسی اور نفسیاتی الجھنیں اور دیگر مسائل یہ وہ قطعہ آراضی ہے، جس میں انھوں نے اپنی اکثر کہانیوں کی فصل کاشت کی ہے۔ گھر کی محدود فضا کے باعث ان کی

کہانیوں کا کینوس بھی محدود ہو جاتا ہے۔عصمت نے ان عام اعتراض کا جواب بڑے سلیقے سے دیا ہے کہ گھر ایک قطرہ نہیں دجلہ ہے اور میں نے زیادہ تر عورتوں کے مسائل لیے ہیں اور عورت گھر سے باہر نہیں نکلتی ہے اس جواب میں عصمت نے ہندوستانی معاشرے اور مشرقی کلچر کے وہ سارے مسائل بیان کردیے ہیں کہ کس طرح سے عورت مشرقی کلچر میں ایک محدود دائرہ کار میں رہتی ہے۔ نہ تو اس کو سیاسی آزادی ملتی ہے نہ معاشی، نہ تعلیمی، نہ جنسی۔ کہیں بھی آزادی نہیں ہے۔ وہ تو گھر کی چہاردیواری میں قید ہے اور اس کے حقوق کا ہر جگہ استحصال کیا جاتا ہے۔

'عورت' کو اپنے افسانوں کا سب سے اہم اور نمایاں موضوع بنانے کی تحریک عصمت چغتائی کو اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی سے ملی تھی۔ عظیم بیگ چغتائی نے عورتوں کی حمایت میں تین کتابیں 'عورت اور پردہ'، 'قرآن اور پردہ'، 'اسلام اور پردہ' لکھی ہیں۔ بقول عصمت چغتائی:

''وہ میرا بھائی ہی تھا، جس نے سب سے پہلے عورتوں کی حمایت میں لکھا اپنی تحریروں میں انھوں نے عورت کو جھگڑالو نہیں بنایا بلکہ اسے ایک دلچسپ انسان کی طرح پیش کیا اور بتایا کہ عورت کو قید رکھنے کی بات غلط ہے۔ اسے پردے میں یا قید میں رکھنا ظلم ہے۔ اس کے بعد ان کی جو کہانیاں پڑھیں ان میں انھوں نے عورتوں کو عزت دی۔ میرے بھائی نے صدیوں سے بنے اس تاثر کو توڑا کہ عورت پر صرف رحم کھایا جائے۔

... میرے بھائی نے کہا کہ عورت کی بڑی Importance ہوتی ہے، اس پر صرف رحم نہ کھاؤ، اس سے محبت کرو، پیار کرو۔ عورت بڑی دلچسپ چیز ہے۔ وہ زندگی کو مضبوط بناتی ہے وہ اہم بھی ہے۔ میں اپنے بھائی کی ان تحریروں سے بہت متاثر تھی اور سبھی عورتیں ہوں گی۔ بہت سی اقرار کرنے کی جرأت نہ کرسکیں وہ الگ بات ہے۔''[3]

عصمت کے یہاں عورت بیک وقت کمزور اور طاقت ور بھی ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو عصمت کے یہاں عورت کا نمایاں روپ اس کی زبردست فعالیت ہے۔ ان کے یہاں عورت کے استحصال اور اس پر ہونے والے ظلم کے خلاف شدید احتجاج ملتا ہے۔ عصمت واحد ایسی افسانہ نگار ہیں، جو مسئلہ تانیثیت کو بڑی مضبوطی کے ساتھ پیش کرتی ہیں کیونکہ وہ عورتوں کے تمام رنگوں، احساسات و جذبات، نفسیات و کیفیات سے بحسن وخوبی واقف تھیں۔ انھوں نے عورت کو صرف حسن وعشق اور محبت و رومان کی چیز نہیں سمجھا بلکہ اپنے افسانوں میں عورت کے مسائل کیا ہیں، عورتوں کے حقوق کیا ہیں، عورتوں کے جذبات ونفسیات کیا ہیں، ان تمام معاملات کو ایک عورت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر عصمت جمیل لکھتی ہیں:

''اس (عصمت) سے قبل افسانے کی دنیا میں جن عورتوں کو موضوع بنایا گیا وہ ایسی کہاں ہیں عصمت کے افسانوں میں بیسویں صدی کی عورت پیش ہوئی، جو اپنے دماغ سے سوچتی ہے۔ اپنے جذبوں کو محسوس کرتی ہے اور انھیں بیان بھی کرسکتی ہے۔''[4]

عصمت عورت کے وجود، عورت کے تشخص، سماج میں عورت کی حیثیت اور زندگی کے تمام شعبوں میں اس کے جنسی افتراق اور صنفی امتیازات کیا کیا ہیں، ان تمام مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بناتی ہیں اور عورت کی محکوم و پست حیثیت

عصمت نے ہندوستانی معاشرے اور مشرقی کلچر کے وہ سارے مسائل بیان کردیے ہیں کہ کس طرح سے عورت مشرقی کلچر میں ایک محدود دائرہ کار میں رہتی ہے۔ نہ تو اس کو سیاسی آزادی ملتی ہے نہ معاشی، نہ تعلیمی، نہ جنسی۔ کہیں بھی آزادی نہیں ہے۔ وہ تو گھر کی چہاردیواری میں قید ہے اور اس کے حقوق کا ہر جگہ استحصال کیا جاتا ہے۔

'عورت' کو اپنے افسانوں کا سب سے اہم اور نمایاں موضوع بنانے کی تحریک عصمت چغتائی کو اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی سے ملی تھی۔ عظیم بیگ چغتائی نے عورتوں کی حمایت میں تین کتابیں 'عورت اور پردہ'، 'قرآن اور پردہ'، 'اسلام اور پردہ' لکھی ہیں۔

اور اس پر ہونے والے ظلم واستحصال کے متعلق مختلف پہلوؤں سے سوال اٹھاتی ہیں۔ عورت معاشرے کا ایک کمزور طبقہ ہے، اس لیے سب سے زیادہ جبر واستحصال کی چکی میں وہی پستی ہے۔ عصمت اپنے افسانوں کے ذریعے اس حقیقت کو سامنے لاتی ہیں کہ عورت خواہ کسی معاشرے یا طبقے سے تعلق رکھتی ہو، وہ مرد کے جبر واستحصال کا شکار ہے۔ عورت کے حق میں عصمت کے اس شدید جذبے اور ان کے احتجاج کے باعث انھیں تحریک نسواں کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے عورت کو object کے طور پر دیکھنے کے بجائے عورت کو subject کے طور پر دیکھا ہے اور عورت کے استحصال کے مختلف عوامل اور محرکات کو پیش کیا ہے۔ عصمت نے کہیں کہیں پر خود عورت کو بھی اس جبر واستحصال کا باعث بنایا ہے۔ کہیں اس کی غربت اسے ذلت کے غار میں دھکیلتی ہے، کہیں اس کا پیشہ یا طبقہ اس کو معاشرے کے لیے ناقابل قبول بناتا ہے اور کہیں اس کی جسمانی کمزوری اور کہیں اس کی ناسمجھی اور کم عمری اس کو پامال کرنے کا باعث بنتی ہے۔

عصمت نے بالخصوص نوابوں اور امرا کی طرز زندگی اور عورتوں کے حوالے سے ان کے رویوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم مثال ان کا شاہکار افسانہ 'لحاف' ہے، جس نے عصمت کو بیک وقت شہرت بھی دی اور بدنامی بھی مگر لحاف کے اندر جو کچھ ہوتا ہے، اسے بتانے سے زیادہ عصمت کی دلچسپی اس بات میں نظر آتی ہے کہ اس کے پیچھے کون سے محرکات یا عوامل تھے۔

'لحاف' میں اگرچہ lesbians فیمنزم کو موضوع بنایا گیا ہے، جس کی وجہ سے عصمت کو باعث ملامت ٹھہرایا گیا۔ حتیٰ کہ انھیں مقدمے کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن درحقیقت عصمت نے نوابوں کی Elite Culture اور معتبر طبقے کے پردے کے پیچھے چھپی غلاظت بھری زندگی کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عورت چاہے کسی طبقے کی ہو اس کے حقوق جنس Sexual Injustice کا استحصال کیا جاتا ہے اور اس کے Sexual Right کو بھی بری طرح پامال کیا جاتا ہے۔ نواب ہم جنسی کے مرض میں مبتلا ہیں مگر ان کی بیویاں اپنے جنسی تقاضے Sexula needs پورا کرنے کے لیے ناچار یہی راستہ اختیار کرلیتی ہیں کیونکہ عورت کا بھی اپنا وجود ہے، اس کے بھی ویسے ہی جنسی تقاضے ہیں جیسے مرد کے۔ اس کی جوانی کی بھی کچھ امنگیں ہوتی ہیں، وہ محض گھر میں سجایا جانے والا گلدستہ اور شوپیس نہیں ہے۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی عورتوں کے دیگر حقوق کی طرح ان کے جنسی اور ازدواجی حقوق کا بھی استحصال کیا جاتا ہے اور پھر وہ عورتیں آخرکار اپنے جنسی، جسمانی اور نفسیاتی تقاضوں سے مجبور ہوکر ہم جنسی جیسا غیر فطری راستہ اختیار کرلیتی ہیں۔

عصمت چغتائی نے بلاشبہ بڑی بہادری سے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے لیکن ہم جنسی کے فعل اور اس کے مسائل کتنے ہی قابل مذمت کیوں نہ ٹھہرائے جائیں اس کے محرکات اس سے زیادہ لائق ملامت ہیں کیونکہ ایسے مسائل کے پید اہونے میں ہمارا معاشرہ بہت حد تک ذمے دار ہے۔ عصمت چغتائی درحقیقت انہی محرکات وعوامل تک قاری کی رسائی کرانا چاہتی ہیں۔

عصمت کا افسانہ 'باندی' بھی نوابوں اور طبقۂ اشرافیہ کی ظاہری عزت اور پارسائی کا سارا راز کھول دیتا ہے۔ ان کی ظاہری ریاکاری کی قلعی اتار کر ان کی اندرونی کراہتوں اور

گھناؤنے خود ساختہ رسم و رواج کی اصل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ نوابوں کی زندگی کی عیاشیاں، باندیوں کے جنسی استحصال، نوابوں کے ان سے ناجائز تعلقات اور پھر ان باندیوں کے حاملہ ہونے کے بعد ان کی طرف بے حسی بے توجہی کے معاملات کی بڑی مہارت سے تصویر کشی کی گئی ہے اور ساتھ ہی نواب کی بیگموں اور نواب زادیوں کے کردار کی بھی تصویر پیش کی گئی ہے، جو اپنے بیٹوں کے جوان ہوتے ہی انہیں برے شوق سے بچانے کے لیے کمسن اور کم عمر باندیوں کو خود سجا سنوار کر ان کے ساتھ لگا دیتی ہیں اور اگر ان کے نواب شوہر باندیوں کے پیچھے لگ کر ان سے بے التفاتی برتتے ہیں یا ان کے حقوق زوجیت ادا کرنے کے قابل نہیں رہتے ہیں پھر خود بھی خلیرے ممیرے بھائیوں سے تعلقات قائم کرکے اپنی جوانی کو گھٹنے سے بچاتی ہیں مگر مسئلہ ان بے گناہ باندیوں کا پھنستا ہے جن کا بار بار اسقاط حمل کرانے سے وہ ہمیشہ کے لیے بچہ پیدا کرنے سے محروم ہوجاتی ہیں اور دوسری طرف ان کے جنسی تقاضے ختم ہوجاتے ہیں اور پھر ان کی شادی کا مسئلہ آتا ہے کہ ہر کوئی کنواری سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب نہ ان باندیوں میں خوبصورتی ہے نہ جوانی ہے، نہ صحت ہے نہ Sexual Desire ہیں، ان کے سارے جذبات واحساسات تباہ ہوجاتے ہیں اور ان کی ساری زندگی ان کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔

اس طبقے کے نزدیک جو کچھ ان کے لیے فائدے مند ہے وہ جائز اور حلال ہے اور جو کچھ ان کے مفادات کے برعکس ہے وہ ناجائز اور حرام ہے۔ باندیوں پر ڈھائے جانے والے طرح طرح کے جنسی جرائم کا نقشہ عصمت نے اس افسانے میں بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ غربت کی چکی میں پسنے والی نچلے طبقے کی عورتیں ان کی مجبوریاں اور محرومیاں عصمت کے افسانوں کے خاص موضوع رہے ہیں۔ ایک غریب عورت کس طرح مختلف سطح پر جنسی، نفسیاتی، معاشرتی، جبر واستحصال کا شکار ہوتی ہے، اس سلسلے میں عصمت نے بہترین افسانے لکھے ہیں۔

'بھیڑیں' عصمت کا ایک مشہور افسانہ ہے، اس میں عصمت نے اس روح فرسا حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں عورت کو کس حد تک حقیر اور ذلیل سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ جانوروں کو عورتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ میگی ایک نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی کرشچین لڑکی ہے، جسے ماں باپ کی غربت کی وجہ سے دیگر بچوں کی طرح بچپن ہی میں کام پر لگا دیتے ہیں اور اسے ساری زندگی اپنا بوجھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اپنا دولہا خریدنے کے لیے 'ڈاؤری' (جہیز) بھی اکٹھا کرنا پڑتا ہے اور دولہا اکثر ڈاؤری کے پیسے لے کر اسے دھوکہ دے کر بھاگ جاتے ہیں۔ یا پھر اس کی ساری کمائی جوئے اور دارو میں لگا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی کوکھ میں پلنے والی جائز اولاد کو اس دنیا میں آنے سے پہلے مار دیا جاتا ہے کہ اگر وہ حاملہ ہوجائے گی تو کام پر نہ جاسکے گی اور اگر بچہ دنیا میں آگیا تو پھر بچے کا پیٹ بھرنے کی وجہ سے اس کے دولھے کو پوری کمائی نہ مل سکے گی۔

دو مشہور افسانوں 'مقدس فرض' اور 'چھوٹی آپا' میں عصمت نے ہندوستانی معاشرے اور سماج میں بسنے والے ان لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ وہ لڑکے لڑکیاں جو مختلف مذاہب کے ہوتے ہیں، ایک ساتھ پلتے بڑھتے ہیں، ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ذات پات کی شادیوں کو گناہ نہیں مانتے اکثر سول میرج کر لیتے ہیں۔ مگر یہ کام اگر لڑکے کرتے ہیں تو اتنا واویلا نہیں ہوتا ہے جتنا کہ لڑکیوں کے کرنے پر ہوتا ہے اور بعض دفعہ تو لڑکیوں کو اس جرم کے لیے زندہ جلادیا جاتا ہے۔ زہر دے دیا جاتا ہے۔ عاجز آکر وہ لڑکیاں خودکشی کر لیتی ہیں۔ ان کو ہمارے معاشرے میں وہ آزادی نہیں حاصل ہے کہ وہ اپنے پاک رشتے کے لیے بھی آزاد ہوں۔ اس میں بھی مذہب آڑے آجاتا ہے اور کبھی کبھی تو اسی مقدس بندھن کے لیے مذہب کی آڑ میں بڑے بڑے فسادات ہوجاتے ہیں۔

'بھیڑیں' عصمت کا ایک مشہور افسانہ ہے، اس میں عصمت نے اس روح فرساحقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرے میں عورت کو کس حد تک حقیر اور ذلیل سمجھا جاتاہے یہاں تک کہ جانوروں کو عورتوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ میگی ایک نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی کرشچین لڑکی ہے، جسے ماں باپ کی غربت کی وجہ سے دیگر بچوں کی طرح بچپن ہی میں کام پر لگادیتے ہیں اور اسے ساری زندگی اپنا بوجھ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اپنا دولہا خریدنے کے لیے 'ڈاؤری' (جہیز) بھی اکٹھا کرنا پڑتا ہے اور دولہا اکثر ڈاؤری کے پیسے لے کر اسے دھوکہ دے کر بھاگ جاتے ہیں۔ یا پھر اس کی ساری کمائی جوئے اور دارو میں لگادیتے ہیں۔

'چھوٹی آپا' میں عورت کے تعلق سے اس حقیقت کو موضوع بنایا گیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کو ایک بے جان مٹی کی مورت سمجھا جاتا ہے، جس کے پاس نہ دل ہے اور نہ کوئی جذبہ، عشق ومحبت کے جذبے صرف مرد کے پاس ہوتے ہیں اور اسی کو اختیار حاصل ہے جتنا چاہے پیار کرے، عشق لڑائے، شادی کرے۔ ہمارے معاشرے میں مرد تو محبتیں کھلے عام کرتا ہے لیکن عورت کے لیے محبت کرنا اتنا معیوب سمجھا جاتا ہے کہ اسے اپنی محبت کی قربانی دینی پڑتی ہے اور ان کو معاشرے میں بہت گری ہوئی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

عصمت چغتائی نے اردو ادب کے سرمایے میں اپنی تخلیقات سے بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ ان کے یہاں نہ صرف مواد خاطر خواہ اور بیش بہا ہے بلکہ انھوں نے اپنی تخلیقی ریاضت سے واقعات اور کرداروں کو متنوع سطحوں پر دیکھا اور بیان کیا ہے۔ انھوں نے مرد اور عورتوں کے انوکھے اور ان چھوئے مسئلوں کو قاری کے سامنے رکھ کر نہ صرف اپنے دور کے قاری کو چونکایا بلکہ آنے والے دور کے قاری کو بھی ان کی تحریروں میں اپنے معاشرے کا عکس نظر آتا ہے۔ ترنم ریاض لکھتی ہیں:

''ان (عصمت) کی تحریریں بلاشبہ موضوعات، اسلوب، کردار اور لب و لہجے کے اعتبار سے تانیثی حسیت Feminist Sensibility اور تانیثی شعور Feminist Conciousness کے اظہار کا پہلا معتبر تجربہ ہیں ان کی تحریریں (اردو ادب میں) تانیثیت کی پہلی اور مستند دستاویز ہیں۔''[5]

عصمت کے افسانوں کا سب سے نمایاں اور اہم موضوع تانیثیت اور عورت کے مسائل ہیں اور خود عصمت نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے ایک انٹرویو میں کہتی ہیں:

''میرا ہمیشہ سے یہ شوق تھا کہ اپنے افسانوں کے ذریعے نچلے متوسط طبقے کی عورتوں تک پہنچوں۔ کیونکہ میں لکھتی ہی ان کے لیے تھی۔ اس لیے ہمیشہ اپنے افسانے ایسے میگزین میں بھیجتی تھی جو فلمی ہوں اور عورتوں تک پہنچتے ہوں۔''[6]

حواشی

(1) 'عصمت چغتائی ایک تاثر' از ہاجرہ مسرور 'عصمت چغتائی اور فن' مرتبہ: ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش ص 96-595

(2) عصمت چغتائی انٹرویواز: طاہر مسعود 'عصمت چغتائی شخصیت اور فن' مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش ص 450،645

(3) شکیلہ رفیق عصمت آپا (اس ایک شام کی گفتگو) ایس آر پبلی کیشنز کراچی دسمبر 2001ص 25

(4) عصمت جمیل ڈاکٹر 'اردو افسانہ اور عورت' ملتان مارچ 2001، ص 224

(5) اردو میں نسائی ادب کا منظر نامہ، مرتبہ: قیصر جہاں، شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جولائی 2004ص 83

(6) عصمت چغتائی انٹرویو، از: طاہر مسعود ص 439

■
Hamid Raza Siddiqui, Research Scholar, Dept of Urdu, AMU, Aligarh (UP)

محمد شمس الدین

عصمت چغتائی کے موضوعات

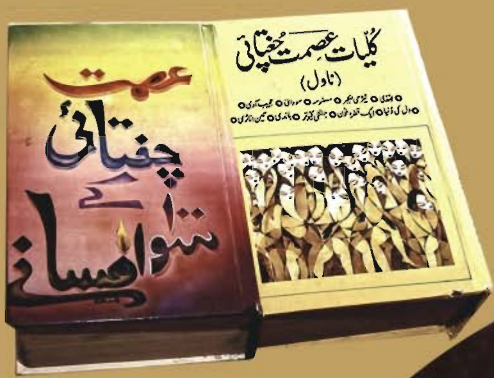

عورتوں کے مسائل پیش کرنے والے افسانوں پر نظر ڈالی جائے تو عصمت چغتائی کے افسانے سرفہرست نظر آئیں گے۔ عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں عورت کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر توجہ دیتے ہوئے اسے درپیش مختلف مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ ایک طرح سے 'عورت' ان کے تمام افسانوں کے موضوعات کا محور ہے۔ عورت کے مسائل کو سامنے لاتے ہوئے انھوں نے جنسیات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ کہیں کہیں تو اس سلسلے میں انھوں نے بڑی بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے جس کی مثال ان کا افسانہ 'لحاف' ہے۔ 'لحاف' میں جب انھوں نے عورتوں کے ہم جنس پہلو کو اجاگر کیا تو اس کے سبب ان کو مخالفت اور مقدمہ کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اس افسانے کی وجہ سے جہاں انھیں ایک طبقے نے بدنام کیا وہیں دوسرے طبقے میں مقبولیت بھی ملی۔ کہیں انھیں فحش نگار کہہ کر ناپسند کیا گیا تو کہیں حقیقت نگار کہہ کر ان کے اقدام کو سراہا گیا۔ جب عصمت چغتائی سے ان پر لگے فحش نگاری کے الزام پر صفائی مانگی گئی تو انھوں نے بڑی بے باکی سے کہہ ڈالا کہ 'دنیا میں کچھ بھی گندا نہیں۔ اگر بدن گندا نہیں ہے تو اس کا ذکر بھی گندا نہیں۔'

ویسے منٹو اور دوسرے افسانہ نگاروں نے بھی جنسیات اور عورت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے مگر عصمت چغتائی نے جس طرح سے جنسیات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا اور جس طرح عورتوں کے مسائل کا ذکر کیا وہ دوسرے کے یہاں ملنا مشکل ہے۔ عصمت چغتائی عورت کو ہر رنگ اور روپ میں بیان کرنے میں کامیاب ہی رہیں۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود ایک حساس اور دردمند عورت تھیں۔ عصمت چغتائی نے ہر طبقے کی عورتوں کے مسائل کو پیش کیا خواہ وہ امیر طبقہ ہو یا متوسط، اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ ہوں یا نچلی دنیا کے افراد۔ فلمی دنیا، سیاسی دنیا اور ہر طبقے کی دکھتی رگ پر انھوں

نے انگلی رکھا۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں کے دکھ درد، طرز زندگی، نفسیاتی، جنسی، معاشی غرض زندگی کے تمام پہلوؤں کو عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔

عصمت چغتائی نے صرف نوجوان لڑکیوں کے مسائل کے بارے میں ہی نہیں لکھا بلکہ نوجوان لڑکوں کے جنسِ مخالف کی جانب کشش کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ افسانہ 'ہیرو' کا نوجوان نوکر 'سکھا' جو حمیدہ بی بی کی طرف مائل ہے۔ وہ اس کے لیے اپنی محبت کو پوری طرح نہیں سمجھ پاتا۔ لیکن حمیدہ بی بی کے لیے اسے ہر کام کرنے میں راحت ملتی ہے۔ اسی طرح 'خدمت گار' گھر میں پلا بڑھا ایک نوجوان نوکر اپنی نوجوان مالکن کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے۔ مگر کم عمری کی وجہ سے اسے محبت کے جذبے کا احساس نہیں ہوتا۔ محبت کا احساس اسے اس وقت ہوتا ہے جب مالکن کا رشتہ امیر آدمی سے ہوجاتا ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے بعض افسانوں میں جنسیات کے بغیر بھی رومانوی جذبات کو موضوع بنایا ہے۔ افسانہ 'تنہا تنہا' میں کالج کے دو اسٹوڈنٹس کی محبت کو پیش کیا ہے جو ایک دوسرے سے محبت تو کرتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کر پاتے۔ تقسیم ہند کے بعد دونوں جدا ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کی محبت میں تنہا تنہا زندگی گزار دیتے ہیں۔ گویا جدائی اور دوری ہونے کے بعد بھی ان کی محبت ختم نہیں ہوتی۔ اسی طرح 'پنکچر' بھی ان کا رومانوی افسانہ ہے۔ جس میں دو کردار 'میں' اور 'وہ' اتفاقی طور پر ملتے ہیں اور ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ مگر 'انا' کی وجہ سے کوئی بھی اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتا۔ آخر کار جب 'میں' کی منگنی کسی اور سے ہوجاتی ہے تو 'وہ' ہار مان جاتا ہے اور اظہار محبت کے بعد شادی کی درخواست کرتا ہے جسے 'میں' قبول کرلیتی ہے۔

عصمت چغتائی نے غربت کی چکی میں پستی عورتوں کی مجبوریوں اور محرومیوں کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی۔ 'بھیڑیں' میں اس حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ اس معاشرے میں کہیں کہیں عورتوں کو جانور سے بھی زیادہ حقیر سمجھا جاتا ہے۔ 'میگی' ایک نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی کرسچین لڑکی ہے جسے غربت کی وجہ سے بچپن ہی سے کام پر لگادیا گیا اور جو ساری زندگی اپنا پیٹ پالنے کے ساتھ ساتھ اپنا شوہر خریدنے کے لیے جہیز اکٹھا کرنے پر مجبور ہے۔ شوہر اکثر شادی کا جھانسا دے کر جہیز کے پیسے لے کر بھاگ جاتے ہیں یا پھر اس کی ساری کمائی شراب اور جوئے میں لٹادیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی کوکھ میں پل رہی جائز اولاد کو اس وجہ سے مارنے پر مجبور ہوگئی کہ اگر بچہ دنیا میں آگیا تو اس کا پیٹ بھرنے کی وجہ سے اس کے شوہر کو پوری کمائی نہ مل سکے گی۔

انھوں نے اپنے افسانوں میں بیوہ عورتوں کے مسائل اور معاشرے میں ان کے ساتھ قابل افسوس سلوک کو بھی موضوع بنایا ہے۔ 'عشق پر زور نہیں' میں عصمت چغتائی نے 'خلیفن بوا' کے کردار کے ذریعے ہمارے معاشرے میں ایسی عورت کی حالت زار کو پیش کیا ہے جو بیوگی کی وجہ سے اپنوں میں بھی بے گانگی کی زندگی گزارتی ہے۔ نہ سماج ہی اسے عزت دیتا ہے اور نہ ہی اولاد۔ یہاں تک کہ اولاد جس پر اپنی ممتا نچھاور کرکے پرورش کرتی ہے، وہ خود تو عیش وآرام کی زندگی گزارتی ہے مگر بوڑھی ماں کے لیے ان کے پاس کوئی گنجائش نہیں۔

انھوں نے لڑکیوں کی شادی کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا۔ افسانہ 'چوتھی کا جوڑا' اس سلسلے کا اہم افسانہ ہے جسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ بعض لڑکیاں ہر لحاظ سے شادی کے قابل ہوتی ہیں، اور ایک اچھی بیوی بننے کی تمام خوبیاں ان میں موجود ہوتی ہیں مگر غربت کی وجہ سے ان کی شادی نہیں ہو پاتی۔ آخر کار وہ گھر بسانے کی آرزو اپنے دل ہی میں دفن کرکے اس دنیا سے رخصت ہوجاتی ہیں۔ یہ عام سی کہانی اس افسانے میں بیان کی گئی ہے جسے اپنے چست اور موثر انداز بیان اور بہترین کردار نگاری کے ذریعے عصمت نے بلندیوں پر پہنچادیا ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں کے موضوعات، واقعات اور کردار اپنی حقیقی زندگی سے لیے ہیں۔ بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے افسانوں کو حقیقت ثابت کرنے کے لیے مختلف طریقوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً اپنے افسانے 'موکھا' میں یہ مکالمے کہلوائے : ''پتہ ہے، مجھ پر بادشاہ سلامت نے مقدمہ چلایا تھا۔ لاہور پکڑ کر بلایا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ جیل ، پھانسی کی نوبت نہیں آئی۔'' یقیناً ان مکالمات کے ذریعے عصمت نے اپنے اوپر ہونے والے 'لحاف' کے مقدمے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عصمت چغتائی نے معاشرے کے خود ساختہ نام نہاد اعلیٰ اور شریف طبقے کی حقیقت کو بھی بے نقاب کیا۔ اعلیٰ طبقہ جس کے پاس دولت کی فراوانی ہے پھر بھی وہ دلی سکون وطمانیت سے محروم ہے۔ ان کی اعلیٰ تہذیب کے نام پر کی جانے والی بے حیائی کو پیش کرتے ہوئے اس طبقے کی زندگی پر طنز کیا ہے۔ افسانہ 'پہلی لڑکی' میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح نام نہاد شرفا کے گھرانوں میں شرافت کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ وہاں لڑکوں کو شادی سے پہلے ہی لونڈیاں فراہم کردی جاتی ہیں۔ جن کے ساتھ وہ ناجائز تعلقات بھی قائم کرسکتے ہیں اور اسے اس طبقے میں برا بھی نہیں مانا جاتا۔ ان گھرانوں میں شادی ہونے سے قبل ہی ان کے لڑکے لڑکیاں آپس میں تعلقات قائم کرلیتے ہیں۔ ان کی شادیاں محض ایک رسم ہے۔ 'نیند' میں اعلیٰ سوسائٹی کی حقیقت کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا ہے کہ ایسے لوگ اعلیٰ سوسائٹی کے معیار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے کبھی اپنی بیویوں کو استعمال کرکے مالی مفاد پورا کرتے ہیں اور کبھی اس سوسائٹی کے بازار میں خود کو قابل فروخت جنس کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس بے راہ روی اور بے حیائی کو اس اعلیٰ سوسائٹی میں زندہ دلی اور اعلیٰ معیار زندگی کا نام دیا جاتا ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں کے موضوعات، واقعات اور کردار اپنی حقیقی زندگی سے لیے ہیں۔ بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے افسانوں کو حقیقت ثابت کرنے کے لیے مختلف طریقوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً اپنے افسانے 'موکھا' میں یہ مکالمے کہلوائے : ''پتہ ہے، مجھ پر بادشاہ سلامت نے مقدمہ چلایا تھا۔ لاہور پکڑ کر بلایا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ جیل، پھانسی کی نوبت نہیں آئی۔'' یقیناً ان مکالمات کے ذریعے عصمت نے اپنے اوپر ہونے والے 'لحاف' کے مقدمے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ 'زہر' کے ایک مکالمے 'مجھے یاد ہے میری دس بچوں والی اماں مسز نعمان سے بہت ڈرا کرتی تھیں'، میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عصمت بھی دس بھائی بہنوں میں ایک تھیں۔

کل ملاکر دیکھیں تو عصمت چغتائی نے اپنے باغیانہ رجحان کے سبب معاشرے میں پھیلے عورتوں کے مسائل کو اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہوئے فرسودہ روایات، معاشرتی تضادات اور جبر واستحصال پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ان کی کہانیاں اپنے مواد، تکنیک اور پلاٹ کی وجہ سے چونکا دینے والی ہیں۔ اپنے زبان وبیان اور طنزیاتی لب ولہجے کے اعتبار سے بھی وہ لائق مطالعہ ہیں۔ ان کی زبان متوسط طبقے کی معیاری زبان ہے۔ بلکہ عورتوں کے مخصوص محاورات اور لب ولہجے کا استعمال عصمت چغتائی کی کہانیوں سے بہتر کہیں اور نظر نہیں آتا۔ انھوں نے نفیس مکالموں کو ادب میں جگہ دی۔ لفظی مصوری سے ان کی کہانی کا ہر کردار اور ہر واقعہ ہماری نگاہوں کے سامنے روشن ہوجاتا ہے۔

■

Mohd Shamsuddin, Research Scholar, Dept of Urdu, Delhi University, Delhi - 110007

رضوان بن علاء الدین

عصمت کے نسوانی کردار

عصمت چغتائی کا طرز احساس اور طرز تحریر دونوں ہی ان کے ہم عصر فکشن نگاروں سے مختلف ہیں۔ عصمت چغتائی کی مقبولیت اور شہرت کی وجہ وہ انفرادی صفت (Indivisual Treat) بھی ہے جو ان کے احساس اور اظہار میں نمایاں ہے۔ عصمت نے موضوعی اور اسلوبی دونوں سطحوں پر نارمس Norms سے انحراف کیا ہے اور اسی انحراف میں ان کا انفراد مضمر ہے۔ عورتوں کے مسائل ان کے افسانوں کا بنیادی محور ہیں اور یہاں بھی ان کا تانیثی نظریہ دوسروں سے مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی تانیثی فکر کی بنیاد اپنے مشاہدوں اور تجربوں پر رکھی ہے اس لیے ان کے یہاں عورتوں کے وہ مسائل بھی ملتے ہیں جن کو بیان کرنے میں مرد ندامت محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے واشگاف انداز میں عورتوں کے داخلی اور خارجی مسائل اور متعلقات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ خاص کر انھوں نے متوسط طبقے کے مسلم گھرانوں کی ہر عمر کی عورتوں کے بارے میں لکھا ہے۔ ان میں نانی، دادی، پھوپھی، خالہ، ساس اور ادھیڑ عمر کی عورتیں بھی شامل ہیں اور اس کے علاوہ کنواری کمسن چھوٹی نابالغ بچیوں اور پردہ نشین عورتوں کو بھی عصمت نے اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ نوجوانی کی دہلیز سے گزرتی ہوئی لڑکیوں کی نفسیات اور جنسی پیچیدگیوں کو بڑی چابکدستی کے ساتھ فکشن کے قالب میں ڈھالا ہے۔

منٹو کی طرح عصمت چغتائی کے افسانے پر بھی سفاکانہ حقیقت نگاری کی وجہ سے فحاشی کے فتوے لگائے گئے جبکہ فنکارانہ خلوص، رشتوں کا احترام، حقیقت کے اظہار کی جرأت اور انسان دوستی کے جذبے ان پر غالب رہے ہیں اور اسی جذبے

کے تحت ان کی حقیقت نگاری سفاکیت میں بدل گئی ہے۔

عصمت کے افسانوں میں دونوں صنف کے کردار موجود ہیں۔ ان کے افسانوں کی دنیا گھر کی چہار دیواری کے اندر کی دنیا ہے۔ عصمت چغتائی ایک عورت تھیں اس لیے ان کی نظر انتخاب نسوانی کرداروں کے جنسی مسائل، ان کی طرز رہائش اور معاشرتی حیثیت پر ہی پڑتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کوئی غیر معمولی اور نا قابل فراموش مردانہ کردار سامنے نہیں آتا ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانوں میں چوتھی کا جوڑا، چھوٹی آپا، پنکچر، گیندا، گھر والی، بہو، بیٹیاں، لحاف، دو ہاتھ، سونے کا انڈا، ساس، ننھی کی نانی، ڈائن، پتھر دل، کافر، بیشہ اور جھوٹی تھالی خاص طور سے قابل ذکر ہیں، جن میں نسوانی کرداروں کی مختلف سماجی حیثیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'چوتھی کا جوڑا' میں کبریٰ کی کردار نگاری ایسی خوبصورتی سے کی کہ کبریٰ کی پوری شخصیت اور داخلی کشمکش سامنے آجاتی ہے۔

منٹو کی طرح عصمت کے یہاں بھی جنس کو اہمیت حاصل ہے۔ جنسی تعلقات کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں ان پر عصمت کے افسانے موجود ہیں۔ شادی بیاہ سے پہلے کی جنسی بے راہ روی کی بدنما تصویریں 'گیندا' اور 'تاریکی' میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ان میں اونچے اور اشرافیہ طبقے کے صاحبزادوں کی بے راہ روی اور عیش پسندی کھل کر سامنے آتی ہے۔ عصمت نے اونچے گھرانوں کی فیشن زدہ عورتوں کی جنسی بے راہ روی کو 'خدمت گار' میں بیان کیا ہے۔ عصمت کے نسوانی کردار جنسی اور معاشی طور پر استحصال زدہ ہیں، جن کی وجہ سے ان کی سماجی حیثیت بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

عصمت چغتائی کے کردار اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ زیادہ تر کردار گھروں میں رہنے والی اور خصوصاً پردہ نشین عورتیں اور نوجوان لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی لکھتے ہیں:

''عصمت چغتائی کے افسانوں کا خاص موضوع نوجوان لڑکیوں کے کردار ہیں۔ اس عمر کی لڑکیوں کے ذہنی اور نفسیاتی مسائل ان کے ارمان اور الجھن، ان کے جنسی جذبات سب ہی کچھ ان افسانوں میں بڑی بے باکی سے بیان ہوئے ہیں۔ ان میں ہر طرح کی لڑکیاں ہیں۔ شوخ و شریر اور تیز طرار بھی، جنسی اور ذہنی طور پر بیمار بھی، اس گھر کی چہار دیواری میں بعض بڑی عمر کی بیگمات بھی ہیں جن کی اپنی نفسیات اور اپنے جنسی مسائل ہیں۔'' (آج کا اردو ادب)

عصمت کے یہاں عورت اپنی تمام تر نرمی، نزاکت، لطافت شوخی اور بانکپن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ لیکن ان کے نسائی کرداروں کا اصل وصف ضد اور بغاوت ہے۔ ان کے بیشتر کرداروں کا تعلق متوسط طبقے کی گھریلو مسلم خواتین سے ہے جو خاتون خانہ ہیں۔ عصمت کو ہر عمر کی پردہ نشین خواتین کی اندرونی زندگی کی پیش کش میں ید طولیٰ حاصل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عصمت کا تعلق نہ صرف طبقہ نسواں سے ہے مگر ان کے اندر بھی تمام تر بغاوتوں کے باوجود نسائی جبلت موجود ہے۔ چنانچہ منٹو نے عصمت چغتائی پر لکھے خاکے میں اسی جہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''عصمت اگر عورت نہ ہوتی تو اس کے مجموعوں میں 'بھول بھلیاں'، 'تل'، 'لحاف'، 'گیندا' جیسے نازک اور ملائم افسانے کبھی نظر نہیں آتے۔ یہ افسانے عورت کی مختلف ادائیں ہیں، صاف شفاف، ہر قسم کے تصنع سے پاک یہ ادائیں وہ عشوے اور غمزے نہیں ہیں جن کو تیر بنا کر مردوں کے دل اور کلیجے چھلنی کیے جاتے ہیں۔ جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان اداؤں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی امتیازوں کی منزل مقصود انسان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی انجانی، ان بوجھی مگر مخملیں فطرت سے بغل گیر ہوئے ہیں۔''

عصمت کے یہاں عورت اپنی تمام تر نرمی، نزاکت، لطافت شوخی اور بانکپن کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ لیکن ان کے نسائی کرداروں کا اصل وصف ضد اور بغاوت ہے۔ ان کے بیشتر کرداروں کا تعلق متوسط طبقے کی گھریلو مسلم خواتین سے ہے جو خاتون خانہ ہیں۔ عصمت کو ہر عمر کی پردہ نشین خواتین کی اندرونی زندگی کی پیش کش میں یدطولیٰ حاصل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عصمت کا تعلق نہ صرف طبقہ نسواں سے ہے مگر ان کے اندر بھی تمام تر بغاوتوں کے باوجود نسائی جبلت موجود ہے۔ چنانچہ منٹو نے عصمت چغتائی پر لکھے خاکے میں اسی جہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عصمت نے ان پڑھ اور گنوار لڑکیوں کی جوانی کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان نسوانی کرداروں میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جن کی حیثیت کال گرلز کی ہے۔ لیکن عصمت نے ان پر بہت کم لکھا ہے۔ 'پتھر دل' کی ہیروئن اور 'بیشہ' کی سیٹھانی کو اس زمرے میں رکھا جاسکتا ہے۔ عصمت کے یہاں عام طور پر زمیندار گھرانے میں صاحب زادوں کے لیے کوئی نہ کوئی غریب یا نچلی ذات کی لڑکی ضرور موجود ہوتی ہے جو اُن کے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس طرح کے افسانوں کی مثال 'دو ہاتھ'، 'گیندا'، 'ننھی کی نانی' اور 'تاریکی' ہے۔

عصمت کے یہاں عورت محبت کی ازلی بھوکی ہوتی ہے۔ اس کے اندر چاہے جانے کا احساس بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے لیکن اکثر و بیشتر اس کا اظہار انکار اور نفرت سے شروع ہوتا ہے۔ 'پنکچر' کی ہیروئن ایک ایسی کنواری جوان لڑکی ہے جو شادی کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔

''میں نے اپنے اوپر ایک قسم کی ڈھٹائی سی لادلی تھی جلدی تیاریاں کرنا شروع کیں ارادہ ہوا کہ فوراً ہی کشمیر چل دیں گے۔ منظور کی غیر موجودگی میں مجھ پر جنونی کیفیت طاری ہوجاتی ہے دل بغاوت پر تُل جاتا۔ اور یہ محسوس ہوتا کہ اگر فوراً شادی نہ ہوئی تو ضرور پاگل ہوجاؤں گی۔ مجھے خود پر ذرا بھی بھروسہ نہ رہا تھا۔ بعض وقت تو ان باغیانہ خیالات پر خود کو سزا دینے کے لیے منظور پر ضرورت سے زیادہ عنایات کی بارش کی جاتی۔ پر کون جانے وہ سارا اظہار اور لگاوٹ دل میں کسی کا خیال لے کر کہاں جاتا۔ خدا ستار العیوب ہے منظور کو کیا معلوم کہ اس کی حیثیت ایک ڈمی کی سی تھی۔ جب کہ دل کہیں اور ہوتا تھا۔ نہ جانے ہندوستان میں کتنی عورتیں اپنے شوہر کے گلے میں بانہیں ڈالتے وقت کس کے خیال میں کھوئی ہوئی ہیں۔ کہتے ہیں سچی محبت بھلائے نہیں بھولتی زخم بھر جاتا ہے پر جہاں پوربیہ ہوا چلی اور ٹیسیں اٹھنا شروع ہوئیں۔ پر آج کل تعجب ہے مصنوعی ناک اور کان مل جاتے ہیں تو سکون قلب کیوں نہیں مل سکتا۔ یہ ممکن ہے ضرور ملتا ہوگا تلاش کرنے والا چاہیے۔'' (پنکچر)

مجموعی طور پر عصمت وہ فنکارہ ہیں جنھوں نے سماج کے گرے ہوئے لوگوں کے اندرون میں نہ صرف جھانکنے کی کوشش کی بلکہ ان کے سینے اور دل کی کراہ کو محسوس کر کے اسے افسانوی قالب میں ڈھالا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کردار صدیوں سے ہندوستانی سماج کی نفرت اور حقارت کے عتاب سہتے آئے تھے۔ عصمت نے سماجی، سیاسی اور معاشی استحصال کی طرح جنسی استحصال کے خلاف خاص طور پر صدائیں بلند کی ہیں۔ ان کی انسانی دردمندی کی باتوں کے مدنظر یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے مذہب اور اخلاق کی فرسودہ دیواروں کو منہدم کیا اور زندگی کی نئی سرحدیں دریافت کی ہیں۔ اس اعتبار سے عصمت چغتائی کی افسانوی کائنات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ احساس ہوگا کہ عصمت نے نہ صرف اردو فکشن کو مالا مال کیا ہے بلکہ بشری صداقتوں اور انسانی جذبات و احساسات کو کائنات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

■

Rizwan Bin Alauddin, Room No 350,
Jhelum Hostel, JNU, New Delhi - 110067

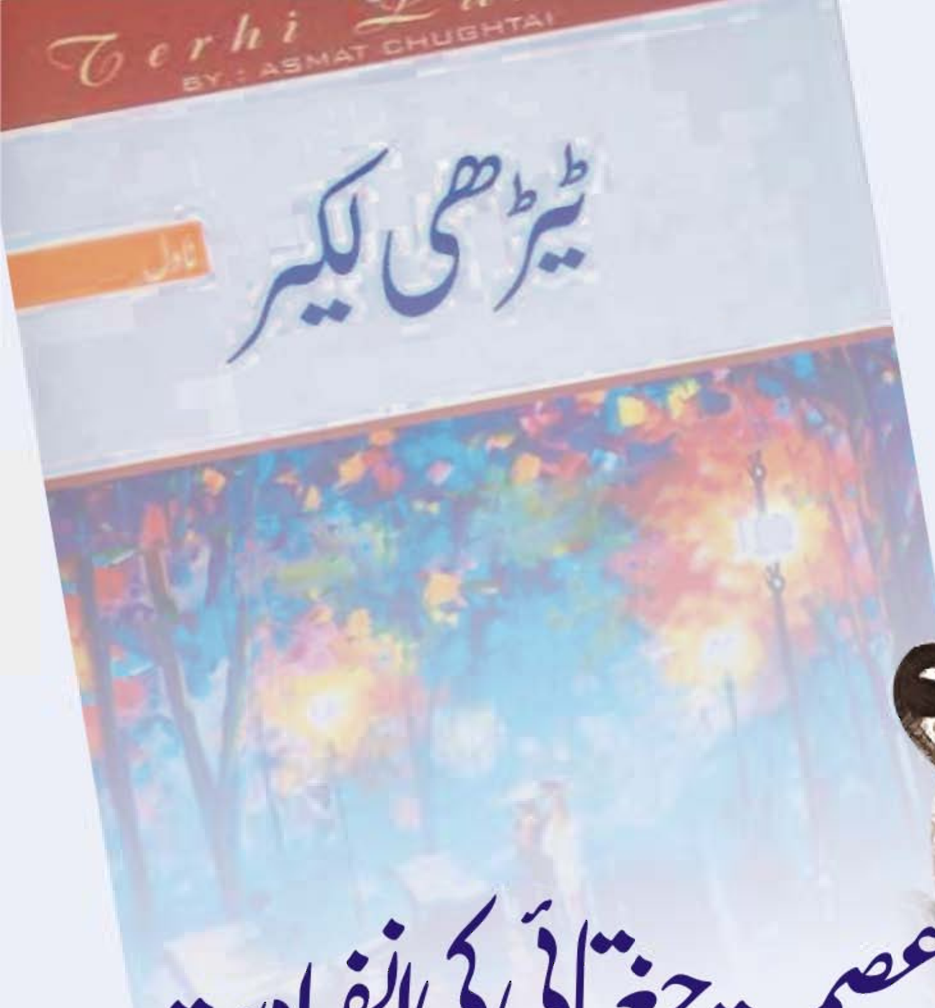

نوشین عثمانی

عصمت چغتائی کی انفرادیت

عصمت چغتائی افسانوی ادب کی تاریخ کا ایک اہم نام ہے۔ یوں بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار ہیں لیکن انھوں نے کئی ناول بھی لکھے ہیں جن میں 'ٹیڑھی لکیر' کو سب سے زیادہ اولیت حاصل ہے۔ اس ناول میں عصمت چغتائی نے مسلم گھرانوں کی پردہ نشین لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں سے پیدا شدہ مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کی نفسیاتی اور جذباتی زندگی کو کہانی کا موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ عصمت چغتائی نے بہت کم عمر سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جس کا ذکر وہ خود اس طرح کرتی ہیں۔

''میں نے چودہ پندرہ برس کی عمر میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا اوٹ پٹانگ اور رومانٹنگ کہانیاں لکھا کرتی تھی جن میں عشق و محبت اور چومنے چاٹنے کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے ان کہانیوں کو ضائع کر دیا۔ بہر حال لکھنے کا شوق مجھ کو پہلے سے تھا۔''[1]

عصمت چغتائی نے افسانہ نگاری کے میدان میں اس وقت قدم بڑھایا جب معاشرہ جہالت اور قدامت پرستی کے پھندے میں جکڑا ہوا تھا۔ خاص کر نسوانی طبقہ معاشرے کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ ان کو کسی طرح کی کوئی آزادی نہ تھی۔ یہ دور نئی نسل کی جنسی اور معاشی الجھنوں کا دور تھا۔ ایسے حالات کو دیکھتے ہوئے عصمت چغتائی نے یہ سوچ کر اپنا قلم اٹھایا کہ نسوانی طبقہ کو بھی صحیح زندگی گزارنے کا پورا حق ملنا چاہیے۔ وہ معاشرے میں عورت کا جائز مقام چاہتی تھی۔ ان کے حساس دل نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں وہ عورت نظر آتی ہے جو مروجہ نظام کے خلاف بغاوت پسند کرتی ہے۔ سماجی رہنماؤں اور ٹھیکے داروں کے ذریعے کیے گئے استحصال کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ جس بے باکی کے ساتھ انھوں نے ہندوستانی معاشرے کی حقیقت کو بیان کیا ہے وہ ان ہی کے بس کی بات تھی۔ افسانوی تکنیک میں ان کا اپنا ایک الگ انداز ہے۔ جس میں طنز ہے، تیکھا پن ہے، باغیانہ لب و لہجہ ہے۔ لیکن یہ بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ننھی کی نانی، چوتھی کا جوڑا، لحاف اور جڑیں جیسے شاہکار افسانے تخلیق کیے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہنے کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ ان ہی خوبیوں کی وجہ سے افسانہ نگاری کے میدان میں انھیں ایک ممتاز اور منفرد مقام حاصل ہوا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی عصمت چغتائی کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ :

''عصمت چغتائی نے مختصر افسانے کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھا اور اسے توازن اور ہم آہنگی سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کا انداز خاصے کی چیز ہے۔ انھیں زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ وہ تصویریں جو انھوں نے پیش کی ہیں بڑی واضح ہیں۔ ان میں معنویت اور مقصدیت بھی ہے اور وہ بڑی دل آویز اور دلنشین بھی ہیں۔ لیکن ان کی یہ شدت تیزی، جارحانہ کیفیت اور بے باکی کہیں کہیں حد سے گزر جاتی ہے اور متوازن قسم کے انسان پر اچھا اثر نہیں ڈالتی۔''[2]

اس اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عصمت چغتائی افسانوی تکنیک سے بھرپور واقفیت رکھتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ موضوع اور مواد کو کس طرح سے پیش کرنا چاہیے۔ بقول وقار عظیم:

''عصمت چغتائی کا فن اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ صرف ایک عورت ہی اسے پیش کر سکتی ہے۔ عصمت کا بڑا اضافہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ عورت کے بھی اپنے مسائل ہیں۔''[3]

عصمت چغتائی کا مطالعہ بڑا عمیق اور مشاہدہ دقیق ہے۔

شروع سے ہی اپنے افسانوں کے کرداروں کو حقیقی روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عورت اور مرد کے رشتوں کو زیادہ موضوع بنایا ہے۔ یا یوں کہیے کہ عورت اور مرد کے مابین رشتوں کی گتھیاں سلجھانا عصمت کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ مردوں کے اس سماج میں عورت کے ساتھ ناانصافی اور اس کی تحقیر پر وہ خون کے آنسو بہاتی ہیں۔ وہ قاری کے سامنے ایسی دبی کچلی نچلے طبقے کی عورت کے جنسی استحصال پر افسانے کا پلاٹ تیار کرتی ہیں۔ اور جاگیردارانہ سماج کی مروجہ رسم ورواج میں عورت کی حالت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''شاید افسانوں اور کہانیوں میں عریاں دیکھ کر لوگوں کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوجاتا ہے۔ ایک صاحب کو زہرہ کا مرمریں جسم دیکھ کر مرگی کا دورہ پڑجاتا ہے۔ اب اس کا علاج کسی ادیب کے پاس تونہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ واقعہ کو واقعہ سمجھ کر پڑھتے جائیں صاحب یہ تو زندگی کی تصویر ہے۔ کھلی بھی ہے اور ڈھکی بھی ہے اگر عریانی ہے بھی تو کیا ضرور کہ مرگی کا دورہ ڈالا جائے۔ ضبط اور جذبات پر قابو بھی تو کوئی چیز ہے اور ایسی عریانی میں عیب ہی کیا ہے۔ جو آپ ادب کی عریانی سے لرزتے جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ادیب خود دنیا کی عریانی سے لرزاٹھا ہے اور دہشت کے مارے کانپ رہا ہے۔ اس نے صرف حروف میں اپنی باتوں کو منتقل کردیا ہے جو دنیا میں ہورہی ہیں۔''4

انسانی رشتوں اور پیچیدگیوں کے علاوہ عصمت چغتائی نے زندگی کے مختلف النوع پہلوؤں کو بغور دیکھا اور اسے متوازن ومنفرد انداز بیان میں پیش کردیا۔ وہ معمولی سے معمولی واقعات وکردار کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ غیر معمولی بن کر قاری کے سامنے آتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں معمولی بات میں غیر معمولی پہلو کو تلاش کرنے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔ عصمت چغتائی نے عورت کے سماجی، جنسی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ جس میں جنسی اور سماجی حقیقت نگاری کو اولیت حاصل ہے۔ ان کے افسانے اس وقت منظر عام پر آئے جب جنسی اور معاشی الجھنوں کا دور تھا۔ استحصال نے عورت کو مجروح کرکے رکھ دیا تھا۔ ایسے حالات میں عصمت چغتائی سماج کے ہر پہلو کے خلاف احتجاج کررہی تھیں۔ معاشرے میں عورتوں پر ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کی اور بے کسوں اور غریبوں کی زندگی کو روشن کیا۔ چنانچہ گیندا، لحاف جیسے شاہکار افسانے جنس کے متعلق ہیں۔ لیکن 'گیندا' ایک بیوہ عورت کی دبی دبی جنسی خواہش پر لکھا گیا افسانہ ہے۔ گیندا کو مالک کا لڑکا اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور گیندا اس کے ناجائز بچے کی ماں بن جاتی ہے۔ لیکن سارا الزام صرف اور صرف گیندا پر عائد کردیا جاتا ہے۔

''اے ہے وہ تو مارے ڈالتا تھا۔ بڑی آفتیں اٹھیں بیوی نے کہا: میں نے فوراً اسے دہلی چلتا کیا۔ پڑھنے والا بچہ یہ نیچ ذات کمینیاں، شریفوں کو یونہی... پھر باوجود سانس روک کے۔ سننے کے میں آگے نہ سمجھ سکی۔'5'

عصمت چغتائی کا دوسرا اہم موضوع سماجی حقیقت نگاری ہے۔ ان کو سماجی حقیقت نگاری پر عبور حاصل ہے۔ انھوں نے معاشرے میں بکھری زندگی کا بھرپور جائزہ لیا تھا ان کے وہ

عصمت چغتائی نے عورتوں کے مسائل، عورتوں کی زندگی، انسان دوستی، مسلم معاشرے کی اصلاح، مسلمان متوسط طبقے کی گھریلو معاشرت اور زندگی کے المیے کو پیش کرنے میں خاص امتیاز رکھتی ھیں۔ انھوں نے چوتھی کا جوڑا، ننھی کی نانی، دوھاتھ، چھوئی موئی، بے کار، نیرا، کلو کی ماں، بچھو پھوپھی، ڈائن چٹان، کنواری، کاروبار، سونے کا انڈا جیسے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کا تجزیہ کیاھے۔

افسانے جو انھوں نے اشتراکیت کی تبلیغ میں لکھے وہ جذباتی ہوتے ہوئے بھی معاشرے کے دائرے کے حدود میں ہی رہے ہیں۔ جنھوں نے سماجی ومعاشرتی نقائص کو بہ حسن وخوبی بے نقاب کیا۔ عصمت چغتائی نے عورتوں کے مسائل، عورتوں کی زندگی، انسان دوستی، مسلم معاشرے کی اصلاح، مسلمان متوسط طبقے کی گھریلو معاشرت اور زندگی کے المیے کو پیش کرنے میں خاص امتیاز رکھتی ہیں۔ انھوں نے چوتھی کا جوڑا، ننھی کی نانی، دوہاتھ، چھوئی موئی، بے کار، نیرا، کلو کی ماں، بچھو پھوپھی، ڈائن چٹان، کنواری، کاروبار، سونے کا انڈا جیسے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کا تجزیہ کیا ہے۔ چوتھی کا جوڑا عصمت چغتائی کا شاہکار افسانہ ہے۔ جس میں عصمت چغتائی نے مسلمانوں کے متوسط طبقے کے مسلمان گھرانوں کے مسئلے کو بخوبی پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن رقم طراز ہیں:

''عصمت نے اس دور میں ایک عظیم کہانی لکھی ہے۔ چوتھی کا جوڑا بڑے سلیقے سے لکھا ہوا ایک مرثیہ ہے ایک عظیم تمدن کا مرثیہ جس میں مسلمانوں کے متوسط طبقے کا ایک نمائندہ مسئلہ بڑے خوبصورت تجزیے کے ساتھ سامنے آتا ہے۔''6

عصمت چغتائی کی کردار نگاری کے مطالعے سے ان کی اپنی زندگی سے متعلق نظریات کا علم ہوتا ہے۔ دراصل ان کی اپنی فکر زندگی کی جذباتی قدروں کی گہرائیوں سے ہے لہٰذا احساس کا خزانہ جس زندگی جس جہاں میں ملتا ہے اسے اپنے کرداروں کے ذریعے فوراً پیش کردیتی ہیں۔ ہاں کرداروں کا مشاہدہ اتنا گہرا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر ان کو پیش کرتی ہیں۔ وہ موضوع کے اعتبار سے اپنے کرداروں کا انتخاب کرتی ہیں جو ہر اعتبار سے اپنے ماحول میں رچے بسے ہیں۔ اس لیے ان کے زیادہ تر کردار حقیقی ہوتے ہیں۔ مجھے ان کی کہانیوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان کا ہر کردار زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہے۔

دیگر خواتین افسانہ نگاروں کی طرح انھوں نے بھی اپنے افسانوں میں مکالمہ نگاری کی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عصمت کے اسٹائل اور ان کے اسلوب کو ان کی مکالمہ نویسی سے بڑی حد تک تقویت نصیب ہوئی ہے۔ زبان وبیان کے اعتبار سے بھی عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں میں حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں خیال اور موضوع کی مناسبت سے زبان کا استعمال کیا ہے۔ ان کی زبان تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے۔ تشبیہ واستعارے کے باوجود زبان کی سادگی اور روانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عصمت چغتائی کی زبان کردار کے جذبات واحساسات کی ترجمان ہے۔

بحیثیت افسانہ نگار انھوں نے فکشن کو بے باکی عطا کی اور جنسی مسائل پر مختلف زاویوں سے بحث کی۔ ان کے افسانے ایک پورے سماج اور فرد کی ذہنی سطح کو نمایاں طور پر پیش کرتے ہیں۔ جس سے اس وقت کی سماجی زندگی کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کو عہد ساز افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔

حواشی:

(1) شاعر، بمبئی، شمارہ، عصمت چغتائی سے ایک ملاقات، از یونس اگاسکر، ص 13

(2) عبادت بریلوی، نقوش افسانہ نمبر، ص 479، لاہور، 1955

(3) وقار عظیم، نقوش افسانہ نمبر، ص 479، لاہور، 1955

(4) ایک بات، عصمت چغتائی، ص 10-11

(5) افسانہ گیندا، عصمت چغتائی، ص 77-78

(6) ادبی تنقید، ڈاکٹر محمد حسن، ص 113

Nausheen Usmani., Room No-26, Pg Hostel, Near Taar Bangla, S.N. Hall, AMU, Aligarh - 202002

عصمت چغتائی

یااللہ یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے؟

یااللہ، یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے؟ یااللہ، یہ فحش نگاری کیا ہوتی ہے؟ ہماری ایک خالہ تھیں جو کمسن لڑکیوں کو ہر وقت ڈھنگ سے دوپٹہ اوڑھنے کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ ذرا شانے سے دوپٹہ ڈھلکا اوران کی آنکھوں میں خون اترا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس خاص حصہ جسم سے کیوں جلتی تھیں۔ معلوم ہوا کہ محترمہ خود چونکہ نہایت مرجھائی ہوئی، کھٹائی کی شکل کی تھیں، اورلڑکیوں کے جسم کو دیکھ کر کوئلہ ہوجاتی تھیں۔ بے چاری خالہ! نہ جانے کتنی خالائیں، نانیاں جوانی کھو کر لڑکیوں کی سوتیں بن جاتی ہیں۔ یہی حال نئے ادب نے پرانے ادب کا کردیا ہے اوروہ اس کے شباب کی تپش سے پگھلا جارہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، آخراگر عریانی نظر آتی ہے تو لوگ بلبلا کیوں اٹھتے ہیں۔ یہ مانا کہ یورپ کے لڑکیوں اورلڑکوں کی تعلیم وتربیت سے بچپنے سے ہی کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک صنفی چیزوں کی کچھ اہمیت نہیں رہ جاتی۔ وہ جب اس کے متعلق کچھ پڑھتے ہیں تو ان کے کانوں پر جوں تک بھی نہیں رینگتی اور یہاں تو سانپ پھنپھنانے لگتا ہے۔ کیوں صاحب، کیا ضروری ہے کہ اس مقدس سانپ کو ہم اپنی آئندہ نسل کا خون چوسنے کے لیے زندہ چھوڑدیں! کیوں نہ اس کا پھن جلد ازجلد کچل کر قصہ پاک کردیا جائے۔ نئے ادیب جو چن چن کر سانپوں کو کچلنے کی فکر میں ہیں، دشمن دین ودنیا کیوں سمجھے جا رہے ہیں؟ مگر یہ بھی تو غلط ہے کہ نئے ادب میں صرف عریانی ہی ہے۔ وہ مثل ہے نا کہ جیسی روح ویسے فرشتے۔ چند اصحاب نے صرف عریانی کو پڑھا اوران کے دل ودماغ پر نقش کرگئی باقی باتیں مطلب کی معلوم نہ ہوئیں، لہٰذا نظرانداز کردیں۔ مگر عریاں جملے یقینا سوسو بار رٹے۔ ذرا غور کیجیے، عریانی پڑھنے کے شوقین تو معصوم بن کر چھوٹ جائیں، اور لکھنے والا برا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر گندگی فضول میں دکھائی جائے اور سڑکوں پر بے کار ننگے گھومنے لگیں، لیکن غسل آفتابی کے لیے کسی ضروری حصہ جسم کو کھولنے کا موقع آئے تو اس میں کیا شرم؟ اگر پٹی کھولنے سے زخم خشک ہوجائے تو یہ عریانی نہیں ہوتی بلکہ اسے علاج کہتے ہیں اور وہ بزرگ جو اس سے چڑ جائیں، قابل رحم ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ عریانی تکلیف دہ ہوتی ہے، اوراس عریاں ادب کے آئینے میں نہ جانے لوگوں کو کیا نظر آتا ہے کہ وہ اینٹ لے کر غریب آئینے پر دانت پیس کر دوڑتے ہیں۔ بھلا سوچیے تو اس میں آئینے کا قصور ہی کیا؟ شاید افسانوں اور کہانیوں میں عریانی دیکھ کر لوگوں کے رکیک جذبات میں ہیجان پیدا ہوجاتا ہے۔ ایک صاحب کو زہرہ کا مرمریں مجسمہ دیکھ کر مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے، اب اس کا علاج کسی ادیب کے پاس تو نہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ واقعے کو واقعہ سمجھ کر پڑھیے۔ ارے صاحب، یہ تو زندگی کی تصویر ہے، کھلی بھی ہے، ڈھکی بھی ہے۔ اگر عریانی ہے بھی تو کیا ضرور کہ مرگی کا دورہ ضرور ڈالا جائے، ضبط اور جذبات پر قابو بھی تو کوئی چیز ہے۔ اور ایسا عریانی میں عیب ہی کیا ہے جو آپ ادب کی عریانی سے لرزے جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ادیب خود دنیا کی عریانی سے لرزاٹھا ہے، اور دہشت کے مارے کانپ رہا ہے۔ وہ تو صرف حروف میں انھی باتوں کو منتقل کر رہا ہے جو دنیا میں ہورہی ہیں۔ نیا ادب موجودہ زمانہ کی تاریخ ہے۔ برسوں بعد جب یہ نیا ادب نیا نہ رہے گا، تب بھی اسی طرح سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کے متعلق تاریخی مواد پہنچاتا رہے گا۔ یہی کہانیاں اور نظمیں تاریخ کے صفحات میں تبدیل ہوجائیں گی۔ اگر نیا ادب گندہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا گندی ہے جس کی یہ تصویر ہے، مصور کا کیا قصور؟ تاریخ اور ادب ساتھ ساتھ رہیں ہیں اور رہیں گے۔ اقتصادیات جدا نہیں کی جاسکتی، خواہ سیاسی مجبوریاں ادب کو سیاست سے دور رکھیں، پھر بھی چھپا رنگ پھوٹ ہی نکلے گا۔ اس نئے ادب سے پہلے، رومان اور مزاح کا زور تھا۔ پطرس، عظیم بیگ، رشید احمد، شوکت تھانوی، امتیاز علی تاج، فرحت اللہ بیگ سب ہی تو کم وبیش ایک ہی سا لکھتے تھے۔ ذرا غور سے پڑھیے، وہی بیویوں کے مظالم، دوستوں کی خوش مزاقیاں، گھریلو جھگڑے سب کے سب ایک ہی بات لکھتے تھے، ہاں یہ بات اور تھی کہ سب کا رنگ جدا تھا۔ اوراب نئے ادیب کیا لکھ رہے ہیں، جنسی الجھنیں، امیر وغریب کے جھگڑے، زندگی سے جنگ اور جملہ دنیا کی تلخیاں، یہ تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے، پھر نئے ادیبوں سے کیوں شکایت ہے کہ وہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ کس قدر فضول نقص ہے؟ ارے صاحب، ملیریا پھیلنا ہے تو سب کو 'کونین' ہی دیتے ہیں، دکھ درد میں سب انسان ایک ہی طرح روتے پیٹتے ہیں، کوئی گانا تو ہو نہیں رہا جو سر، تال میں ہو، پرانا ادب بھی زندگی کی تصویر تھی اور نیا ادب بھی۔ یہ مانا کہ جب پرانا ادب

لکھا گیا تو یہ دنیا اتنی گندی اور عریاں نہیں تھی، اور اب آپ جدھر نظر اٹھا کر دیکھیے، دنیا ننگی، بھوکی، چور، اچکی اور مکار نظر آتی ہے۔ نئے ادیب کیا کریں، کیسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر گل بکاؤلی اور مثنوی گلزار نسیم لکھنے لگیں۔ 'فسانۂ آزاد' اور مذاقیہ کہانی لکھتے چلے جائیں، نئے ادیب زیادہ تر ننگے بھوکے اور حساس ہیں۔ ان کے دل و دماغ زیادہ تیزی سے کام کر رہے ہیں اور ذرا سی چوٹ سے بھنا اٹھتے ہیں۔ ان کے بھیانک خواب جن کی اور بھی بھیانک تعبیریں، یہ ہماری دنیا کا نقشہ ہے۔ برا ہے یا اچھا، یہ فیصلہ آئندہ پود کے ہاتھوں میں ہوگا کہ وہ اسے سینے سے لگائے یا ٹھکرائے۔ ہم اور آپ کبھی انصاف سے کچھ نہیں کہہ سکتے اور آپ کا فیصلہ بے کار ہے، جو چوٹ کھایا ہوا سانپ ہے وہ دب نہیں سکتا، آپ کے اعتراض اور طعنے اسے خاموش دبک جانے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ وہ چیخے گا۔ دکھ ہوگا تو روئے گا۔ یہ جنسی بھوک ہے جس پر مہذب لوگوں کو اعتراض ہے، اسی طرح کہانیوں میں جھلکے جائے گی جب بھوک ہی ٹھہری تو پھر ہائے ہائے کیوں نہ ہو۔ نئے ادیب اتنے شرمیلے اور بزدل نہیں جو طعنوں تشنوں سے ڈر جائیں گے۔ یہ جنسی پکار جو افسانوں میں نظر آ رہی ہے، کیا ان کا تعلق اقتصادی اور معاشرتی حالت سے کچھ بھی نہیں۔ کیا اس میں آپ کو سیاست کی چاشنی نظر نہیں آتی آپ نے ڈیمانڈ اور سپلائی کے متعلق اکنامکس میں پڑھا ہوگا۔ ذرا اس نکتے کو ہماری موجودہ زندگی پر پرکھیے، جنس ڈیمانڈ بھی ہے اور سپلائی بھی۔ مگر مارکیٹ نہیں، یعنی عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی اور خواہشات بھی، مگر ان کا ذکر بے شرمی۔ ہندوستان کے لوگ غریب ہیں، اکثر نادار ہیں۔ ناداری میں شادی مصیبت، ناداری میں عیاشی گناہ، ناداری میں جینا منع، کیوں؟ ہمارے نوجوان باوجود تعلیم اور جسمانی قابلیت رکھنے کے دنیا کی دلچسپیوں سے محروم۔ علم تو الٹا ہمارے لیے مصیبت ہو گیا کہ نہ پڑھتے نہ یہ معلوم ہوتا کہ دنیا کے دوسرے انسان کیا مزے اڑا رہے ہیں۔ مزے سے اپنی چمڑی میں مگن رہتے ہیں مگر اب ہم جانتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اور ملکوں میں زندہ رہنا جرم نہیں اور یہاں کے نوجوانوں کو کچھ بھی نصیب نہیں۔ یہاں ہر بات عجیب، ہر بات گندگی، عریاں اور مخرب الاخلاق، وہاں کے عیش کے ہزاروں اسباب، یہاں زندگی کے خواب دیکھنا جرم، خیر اگر یہ مصیبتیں تھیں تو کم از کم احساس ہی کند ہوتا۔ کاش مٹی کے تودے ہوتے جو نہ سنتے، نہ دیکھتے، نہ دیکھ کے چلاتے، زمانے کی ٹھوکروں میں لڑھکتے، فنا کی طرف چلے جاتے۔ مگر نئی دنیا کا نیا بنیا، ضدی، بدمزاج اور اکھڑ ہے۔ وہ موجودہ نظام کو پسند نہیں کرتا، وہ ایک نظام کے لیے بے کل ہے، وہ اسے بدل ڈالنا چاہتا ہے۔ مگر ابھی تو بدنظمی سے متنفر، غصہ ہو ہو کر اپنی بوٹیاں چبا رہا ہے، خود اپنا ہی جسم اور روح چیر کر پھنک رہا ہے اور کل وہ اس نظام کو توڑ پھوڑ کر دوسرا نظام بنائے گا۔ مگر نظام کو توڑنے سے پہلے اسے نہ جانے کس کس کو کچلنا پڑے گا، کس کس کے پیروں سے روندا جائے گا، اور جو باقی رہے گا وہ نئے نظام کی تکمیل کرے گا، یہ نظام کیا ہوگا، یہ ابھی کسی کو نہیں معلوم۔ نئے ادب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نئے نظام میں دکھ، بھوک اور افلاس تو نہ ہوگا۔ فاقے، جنسی اور روحانی نہ ہوں گے، بدمعاشی نہ ہو گی، طوائفوں کے اڈے نہ ہوں گے۔ اگر ہوں گے تو صرف انسانوں کے گھر ہوں گے، جہاں انسان رہے گا۔ عورتوں کو

یہ مانا کہ یورپ کے لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم و تربیت سے بچپنے سے ہی کچھ اس انداز سے ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک صنفی چیزوں کی کچھ اہمیت نہیں رہ جاتی۔ وہ جب اس کے متعلق کچھ پڑھتے ہیں تو ان کے کانوں پر جوں تک بھی نہیں رینگتی اور یہاں تو سانپ پھنپھنانے لگتا ہے۔ کیوں صاحب، کیا ضروری ہے کہ اس مقدس سانپ کو ہم اپنی آئندہ نسل کا خون چوسنے کے لیے زندہ چھوڑ دیں! کیوں نہ اس کا پھن جلد از جلد کچل کر قصہ پاک کر دیا جائے۔ نئے ادیب جو چن چن کر سانپوں کو کچلنے کی فکر میں ہیں، دشمن دین و دنیا کیوں سمجھے جا رہے ہیں؟ مگر یہ بھی تو غلط ہے کہ نئے ادب میں صرف عریانی ہی ہے۔

بھوکی کتیوں کی طرح غلیظ مورچوں میں عذاب دوزخ بن کر نہیں بیٹھنا پڑے گا، مرد حیوانیت سے دور ہوں گے۔ قدرت کے اصول کے مطابق جو انسان پیدا ہوں گے، وہ انسان مانے جائیں گے، اور شادی بیاہ صرف پیسے ہی والوں کے نہ ہوں گے بلکہ ہر تندرست انسان کو مکمل زندگی گذارنے کا حق ہوگا۔ نیا ادب پکار پکار کر انسان کو جینے کا حق دلانا چاہتا ہے۔ زندگی اور اس کے سارے لوازمات جو باپ دادا کی وراثت بن گئے ہیں، انسان کا حق ہو جائیں گے۔ نئی دنیا کے دکھ بہت بڑھ گئے ہیں اور نیا ادب اسی دنیا کے دکھوں کی آہ ہے جو دنیا کے ہر نوجوان کے چور چور جسم سے نکل رہی ہے۔ طعنے دینے سے کچھ نہیں ہوتا، بڑھیائیں طعنے دیتے مر گئیں، بوڑھے لاحول بھیجتے چل دیے، مگر نوجوان زندگی کی کشمکش میں پھنسا ہوا ہے۔ وہ مٹنے کے لیے تیار نہیں، وہ بزدل نہیں اور اسے بے شرمی کے خطاب سے ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ جب ادب کا سوال آتا ہے تو اس میں زنانے، مردانے ادب کا کیا سوال؟ جو نظام لڑکوں کو پسند نہیں، وہ لڑکیوں کو کب پسند آ سکتا ہے۔ مرد اگر چیخ سکتا ہے تو عورت کو بھی کراہنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ نئے ادب کا مقابلہ ایک بزرگ جنسی کتاب سے کرتے ہیں۔ بالکل ٹھیک، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ہمارے ملک کے لوگ جنسی معلومات پر لکھی ہوئی کتابوں کو صرف لذت کے لیے پڑھتے ہیں، اسی طرح وہ نئے ادب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ جنسی معلومات پر کتابیں طبعی اصول واضح کرنے کو لکھی گئی تھیں لیکن لوگ ان سے 'ادبی ذوق' فرمانے لگے اور اسی طرح نئے ادب کو ناول اور افسانہ سمجھ کر مزہ لینا چاہتے ہیں۔ مگر بجائے اس میں چٹخارے دار مسالے کے جب کونین نکلتی ہے تو غریب ادیب کے جنم پر تھوکتے ہیں۔ آخر میں ایک بات نئے ادیبوں سے۔ ان فضول طعنوں کی پرواہ نہ کیجیے، یہ اعتراض کب نہیں ہوئے۔ کس نے نہیں کیے، سوائے دادی اماں کے لاڈلے بیٹوں کے کون ایسا ہے جس نے کبھی بزرگوں سے شاباشی وصول کی ہو؟ نوجوانی سے بزرگوں کو ہمیشہ نفرت رہی ہے اور رہے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ جو کچھ لکھتے ہیں، یہ بزرگوں کے لیے ہے بھی نہیں، کچھ کہیں تو ادب سے سر جھکا کر مسکرا دیجیے، لکھیے ضرور۔ جو کچھ آپ دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، سوچتے ہیں، وہ ضرور لکھیے۔ نہ زبان کی غلطیوں سے ڈریے، نہ اس بات سے ڈریے کہ کوئی آپ کو ادیب نہیں مانتا۔ اگر آپ جس دنیا میں رہتے ہیں، اس میں کچھ مسموم کانٹے ہیں، کچھ بھیانک درندے ہیں، کچھ خوف ناک کیڑے مکوڑے ہیں تو آئندہ نسل کے لیے اسے لکھ جائیے، اس کا سبق آپ ہی کے تجربے ہوں گے، آپ کے ہی مشاہدے ان کے ذہنی مشاہدات ہوں گے۔ اچھا، برا، کڑوا، کسیلا، سب کچھ لکھ دیجیے اور وہ خوراکیں جو ہمارے شریر مریض پینے سے انکار کر رہے ہیں اور بے طرح مچلتے ہیں، آئندہ نسلیں انھیں فخر یا احترام سے لیں گی، کیونکہ آئندہ نسل زیادہ سمجھ دار، روشن دماغ اور اچھے برے کو پرکھنے والی ہوگی، اس کے لیے یہ خوراکیں بھاری نہیں ہوں گی۔ وہ نسل واقعے کو واقعہ سمجھ کر پرکھے گی، اس کے جذبات اس قدر بودے نہ ہوں گے جو عریانی اور سچی بات سے پھڑ پھڑا جائیں، جیسے شیر کی بُو پا کر گھوڑا بدکنے لگتا ہے۔ لکھیے اور اتنا لکھیے کہ یہ ان کے لیے بالکل معمولی بات ہو جائے اور ان جراثیم کو اپنے تیزاب جیسے ادبی مادے سے تباہ کر دیجیے اور یہی روئی کے گالے جن میں ایک چنگاری بھی پڑ جائے تو بھک سے اڑ جاتے ہیں، برف کے گالے بنا دیجیے جن سے انگارے بھی سرد پڑ جائیں۔

■

عصمت چغتائی

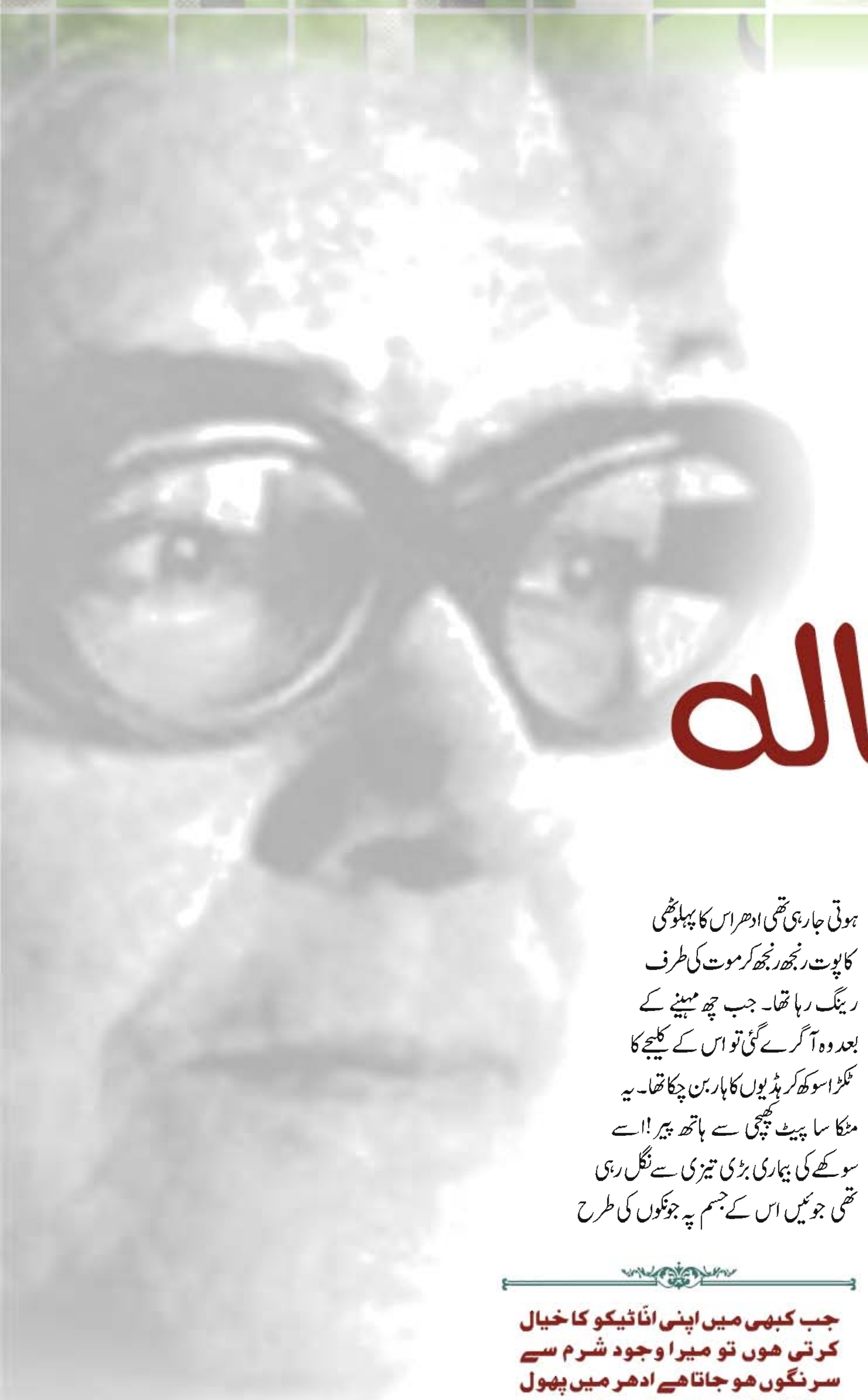

زہر کا پیالہ

یہ افسانہ عصمت چغتائی کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے

میرے پیدا ہونے کی کوئی خاص ضرورت تو نہ تھی۔ مجھ سے پہلے پانچ بھائی اور تین بہنیں وارد ہو چکی تھیں۔

اماں بچوں سے اوب چکی تھیں۔ دو چار بچوں تک تو وہ ماں بننے کی خوشیاں مناتی رہیں پر جب بچوں نے گھر ہی دیکھ لیا تو وہ ماں بننے کو سزا سمجھ کر جھیلنے لگیں۔

میرے ابا میاں کو بچہ بازی کی لت تھی خواہ وہ مرغی کے چوزے ہوں یا کتّے کے پلّے وہ انھیں بڑے انہماک سے پالتے جونہی چوزے انڈا کھٹک کر باہر آتے ابا میاں کی کوشش ہوتی کہ جلد سے جلد انھیں علاحدہ کر دیں تاکہ مرغی کڑکی جھاڑ کر انڈے دینے لگے۔ اسی طرح جوں ہی بچہ پیدا ہوتا وہ آگرے سے ایک دو دھار کولن بلوا کر بچہ اس سے ہلگا دیتے اور اماں نئے جیو کی تیاری میں الجھ جاتیں۔

میری انا کا نام ٹیکو تھا۔ سانولی سلونی کمسن لونڈیا سی تھی پہلوٹھی کا بچہ جَن کر غریبی سے مقابلہ کرنے اسے چاول کی پیچ پر چھوڑ کر مجھے اپنا خون چُسانے آنا پڑا تھا۔

دو چار روز اپنے بچے کی یاد میں روئی پیٹی پھر ذرا مرغن راتب ملا کچھ دھمکیاں ملیں تو ہار جھک مار کر ڈیوٹی پر جٹ گئی۔

جب کبھی میں اپنی انا ٹیکو کا خیال کرتی ہوں تو میرا وجود شرم سے سرنگوں ہو جاتا ہے ادھر میں پھول پھول کر کپا ہوتی جا رہی تھی ادھر اس کا پہلوٹھی کا پوت رنجھ رنجھ کر موت کی طرف رینگ رہا تھا۔ جب چھ مہینے کے بعد وہ آگرے گئی تو اس کے کلیجے کا ٹکڑا سوکھ کر ہڈیوں کا ہار بن چکا تھا۔ یہ مٹکا سا پیٹ کھپچی سے ہاتھ پیر! اسے سوکھے کی بیماری بڑی تیزی سے نگل رہی تھی جوئیں اس کے جسم پہ جونکوں کی طرح

جب کبھی میں اپنی انّا ٹیکو کا خیال کرتی ہوں تو میرا وجود شرم سے سرنگوں ہو جاتا ہے ادھر میں پھول پھول کر کپا ہوتی جا رہی تھی ادھر اس کا پہلو ٹھی کا پوت رنجھ رنجھ کر موت کی طرف رینگ رہا تھا۔ جب چھ مہینے کے بعد وہ آگرے گئی تو اس کے کلیجے کا ٹکڑا سوکھ کر ہڈیوں کا ہار بن چکا تھا۔ یہ مٹکا سا پیٹ کھپچی سے ہاتھ پیر! اسے سوکھے کی بیماری بڑی تیزی سے نگل رہی تھی جوئیں اس کے جسم پہ جونکوں کی طرح لپٹی رہا سہا خون چوس رہی تھیں پلکوں تک میں لیکھیں بھر گئیں تھیں۔

لپٹی رہا سہا خون چوس رہی تھیں پلکوں تک میں لیکھیں بھر گئیں تھیں۔ میں ہمک ہمک کر گھٹنیوں چلنے لگی تھی اور وہ چھپکلی کے پیٹ کی طرح زرد مردار پسلی کے مرض میں مبتلا کھرّی کھاٹ پر پڑا سانس کی دھونکنی چلایا کرتا تھا اس کے جبڑے دودھ کھینچنے کی طاقت کھو چکے تھے جب انا نے اس کے منہ میں دودھ دیا تو وہ اناڑیوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگا اور میں نے رشک و حسد کی آگ میں بھسم ہو کر اسے کھسوٹ کر دور پھینک دیا اور خود جٹ گئی۔

انا سال میں دو بار اپنے گھر جاتی تھی اس کے ساتھ مغلانی بی اور بی داروغہ جی مزید احتیاط کے لیے جاتے تھے میں مغلانی کے ساتھ فرسٹ کلاس میں رکھی جاتی تھی اور اسٹیشنوں پر انا بھاگم بھاگ مجھے دودھ پلانے آیا کرتی تھی کوئی واڑے میں جب لاؤ لشکر پہنچتا تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ جمعدار کے پاک صاف صحن میں بانس کی نئی کھاٹیں خرید کر ڈالی جاتیں۔ جس پر مغلانی بی اپنا صاف ستھرا بستر بچھا کر ناک سکیڑ کر بیٹھ جاتیں نیا چھینٹ کا لہنگا پہنے انا ادھر اُدھر منڈلاتی پھرتی وہ جتنی کوشش اپنی اہمیت جتانے کی کرتی مغلانی بی بڑی صفائی سے کاٹ جاتیں اور رات کو اس ڈر سے کہ کہیں مردار اپنے خصم سے نہ مل بیٹھے اس کی کھاٹ پٹی سے ملا کر سوتیں۔ باہر کنڈی چڑھا کر داروغہ جی ڈٹ جاتے۔ اگر پھر سے کہیں گابھن ہو بیٹھی تو زہر ہو جائے گا اور میں نگوڑی ہڑک جاؤں گی۔

رات کو انا کا شوہر دارو پی کر آتا اور بہت دند مچاتا۔ اس کی آواز سن کر انا گرم کتیا کی طرح بلبلا اٹھتی۔ مگر مغلانی کی مغلظات سن کر بس سسکیاں بھر کے دبک رہتی۔ شوہر خوب شور مچاتا لوگ باگ اکھٹے ہو جاتے۔ وہ ایک پل کو انا کی صورت دیکھنے کے لیے گڑگڑاتا اٹھارہ انیس برس کا لونڈا ہی تو تھا۔ بڑی منتوں سماجتوں سے داروغہ جی اسے اندر لاتے۔

''رانی''! وہ بھینسے کی طرح پھنکارتا۔

''سوامی''! انا اس کے پیروں کو چھونے بڑھتی اور وہیں سب کے سامنے وہ بورانے کتوں کی ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے لگتے۔

داروغہ جی بی مغلانی اور آٹھ روپے روٹی کپڑے درمیان میں کود پڑتے۔ شوہر کو اس کے بھائی بند گھسیٹتے لے جاتے اور ٹیکو بے وقت ہی مجھے دودھ پلانے پر بضد ہو جاتی۔ مگر دودھ میں جیسے زہر گھل جاتا اور میں واویلا مچانے لگتی۔

صبح کی گاڑی سے لشتم پشتم واپس لوٹ آتا۔

دوسری دفعہ جب انا گھر گئی تو میں پیروں چلنے لگی تھی۔ اس کا بچہ نوا بیٹھنے لگا تھا سوکھے کے ساتھ ہوکے کی بیماری بھی لگ گئی تھی بس کھائے چلا جاتا تھا۔ خاک مٹی، کوڑا کرکٹ، مرغیوں کی بیٹ، پھل، ترکاری کے چھلکے، غرض جو ہاتھ آ جاتا سوکھی سوکھی انگلیوں میں دبوچ کر منہ میں گھسیڑ لیتا۔ اسی وجہ سے اسے مستقل دست آتے رہتے تھے اس کے چاروں طرف پتلی پتلی غلاظت کی ایک جھیل سی بن جاتی جس کے کناروں پر مکھیوں کی گوٹ جُٹی رہتی۔

بیچ میں وہ ایک سنسان بنجر جزیرے کی طرح ڈٹا بسورا کرتا۔ المونیم کا ایک ٹیڑھا کبڑا پیالہ اس کی کل جمع پونجی تھی اس پیالے اس کی کربناک زندگی کی جملہ رعنائیاں وابستہ تھیں یہ پیالہ اس کی ماں کا تھا اور یہی اس کا اَن داتا۔ اگر گھڑی بھر کو پیالہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا تو وہ یتیموں کی طرح ہائے ویلا مچانے لگتا۔ اسے کلیجے سے لگائے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔

جب اُسے بھوک لگتی جو ہر وقت ہی لگتی رہتی تھی تو وہ دونوں ہاتھوں سے پیالہ بجاتا کبھی بندر کی طرح زمین پر گھِسا۔ فقیر کی طرح لوگوں کو دکھا کر اس میں کھانا ڈالنے کی تلقین کرتا۔ کتنا بھی کھلا دو ازلی بھوک قائم رہتی۔ کیونکہ معدہ اور آنتیں ڈھلان کی نال کی طرح تھیں خوراک نہایت تیزی سے بھاگتی دوڑتی اس کے پیٹ میں سے اچھوتی نکل جاتی اور وہ پھر خالی کا خالی رہ جاتا۔

رات کو حسب معمول اس کے شوہر نے دنگا مچایا خوب سی دارو چڑھا کر مستانے سانڈ کی طرح ڈکرانے لگا۔ خوب جی بھر کے گالیاں دیں اس نے میرے ابا میاں کو تک نہ چھوڑا انہیں ٹیکو کا یار بنا ڈالا جب کسی پر بھی بس نہ چلا تو اپنی ماں کو لاتیں ماریں اور باپ کے سر پر لٹھ جما دیا۔ داروغہ نے فوراً ابا میاں کے دوست تھانے دار صاحب کو اطلاع دی وہ جھٹ دو کانسٹبل لے کر موقعۂ واردات پر پہنچے اور شوہر نامدار کو دنگا فساد برپا کرنے کی پاداش میں پکڑ کر لے گئے۔ وہاں اس کی ایسی تاج پوشی ہوئی کہ بیوی کا عشق ناک کے رستے نکل گیا۔

یہ پیالہ اس کا کھلونا بھی تھا ہمدم ودمساز بھی۔ گھنٹوں بیٹھا اسے سوکھے سوکھے ہاتھوں سے ٹٹولا کرتا۔ جیسے بچے بسکٹ چباتے ہیں اسے دودھ کے ننھے ننھے دانتوں سے اس کے کنارے چبایا کرتا۔ پھر وہیں غلاظت کی جھیل میں کٹورے پر منہ رکھ کے سو جاتا۔

ٹیکو کو دیکھ وہ بری طرح سہم گیا کہ کہیں وہ اس کا پیالہ تو نہیں چھیننے آگئی ہے۔ ذرا بھی خون نے جوش نہ مارا اور ٹیکو کا خون اب اس کے جسم میں رہا بھی نہ تھا کب کا جھیل میں بہہ چکا تھا۔

ٹیکو کو بھی اس پر ممتا نہ آئی بلکہ شاید اس کے وجود سے شرم اور گھن آئی ہو گی۔ میں سفید ولایتی جوتیاں پہنے سارے صحن میں پٹر پٹر بھاگتی پھرتی۔ محلّہ ٹولے کی عورتیں یہ عجوبۂ روزگار دیکھنے جوق در جوق آ رہی تھیں اور ٹیکو حق ملکیت جتانے کے لیے بار بار شلوکے کے بٹن کھول کر مجھے لبھا رہی تھی۔ اس کا جسم میری سب سے بڑی کمزوری تھا کبھی بھولے سے بھی اس کے شلوکے، کا بٹن کھل جاتا تو میں اس پر ٹوٹ پڑتی۔ وہ مجھے چڑھانے کے لیے جسم کھولتی اور جب میں ہمک کر آتی تو شرارت سے اوندھی ہو جاتی اور میں بلک بلک کر اس کے نیچے گھسنے کی کوشش کرتی۔ وہ یہ تماشے لوگوں کو دکھاتی پھر مجھے کلیجے سے لگا کر چومنے لگتی۔ دور اس کا بچہ جھیل کے بیچوں بیچ بیٹھا لوہے کے چنے چبایا کرتا۔

رات کو حسبِ معمول اس کے شوہر نے دنگا مچایا خوب سی دارو چڑھا کر مستانے سانڈ کی طرح ڈکرانے لگا۔ خوب جی بھر کے گالیاں دیں اس نے میرے ابا میاں کو تک نہ چھوڑا انہیں ٹیکو کا یار بنا ڈالا جب کسی پر بھی بس نہ چلا تو اپنی ماں کو لاتیں ماریں اور باپ کے سر پر لٹھ جما دیا۔ داروغہ نے فوراً ابا میاں کے دوست تھانے دار صاحب کو اطلاع دی وہ جھٹ دو کانسٹبل لے کر موقعۂ واردات پر پہنچے اور شوہر نامدار کو دنگا فساد برپا کرنے کی پاداش میں پکڑ کر لے گئے۔ وہاں اس کی ایسی تاج پوشی ہوئی کہ بیوی کا عشق ناک کے رستے نکل گیا۔

ادھر ٹیکو گھگھیا رہی تھی رو رہی تھی اور اس کے ساتھ میں بھی ہلکان ہو رہی تھی۔

مغلانی بی درود پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔

اور نوا پیالہ پیٹ رہا تھا جیسے وہ طبلِ جنگ ہو۔

میں کوئی ڈیڑھ برس کی تھی۔ اماں نئے جیو کو جنم دینے کے لیے بھری بیٹھی تھیں۔ اب کے چھ ماہی پر ٹیکو نے گھر جانے کی بات سُنی ان سُنی کر دی تھی وہاں اس کے لیے سوائے کوفت کے اور کچھ نہیں رہ گیا تھا گھر جاتے کتراتی تھی پونے دو سال کی عمر میں میرا دودھ چھوٹ جائے تو پھر انا کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔

کچھ دن سے انا بے حد چونچال ہو گئی تھی بات بات پہ ہنستی کھِل کھلاتی۔ راہ چلتوں کو چھیڑتی۔ مجھے لیے لیے گھومتی۔ کبھی باورچی سے ٹھٹھول ہو رہی ہے کبھی دھوبی

سے الجھ رہی ہے کہ للّی کے کپڑے ٹھیک سے نہیں دھوتا۔

مگر میں دن بدن چڑچڑی ہوتی جارہی تھی راتوں کو گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی اس کی بوٹیاں چباتی۔ ہر وقت اس کے شلوکے کے گرد منڈلاتی رہتی۔ دوپہر کو عموماً بھوسے والی کوٹھری میں ٹھنڈ ہوا کرتی اور اپنی اوڑھنی بچھا کر مجھے اس پر سلا دیتی اور خود بیٹھے بیٹھے سروں میں کجریاں الاپتی رہتی۔ شاید بھوسے کا کوئی تنکا چبھ گیا یا میری چھٹی حس نے جاگ کر مجھے جگا دیا۔

اگر کوئی کتا بلی کھانے کے خوان پر جٹا نظر آئے تو اِنسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے وہ ہی خاکسار کی ہوئی ہوگی۔ میری لاڈلی انّی کے شلوکے کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور داروغہ جی۔

میری چیخوں کی آواز سن کر تمام نوکر دوڑ پڑے۔ شاید بیٹا کو سانپ نے ڈس لیا۔

مگر سانپ کی اژدہاد دیکھ کر لوگ بھونچکے رہ گئے۔ جب ہی میری انا کا دودھ زہر ہو رہا تھا۔

دودھ کی بوتل ٹوٹ جائے یا اسے کتا نجس کردے تو کوڑے کے ڈبہ میں پھینک دیتے ہیں۔ ٹیکو کو پہلی گاڑی سے آگرہ روانہ کر دیا گیا اس نے بہت ہاتھ پیر جوڑے اماں کے قدموں پر ناک گھسی کہ اب وہ کسی کرم کی نہیں رہی اسے برادری میں کون گھسنے دے گا اور پھر داروغہ جی کا تحفہ وہ کس کے منہ پر مارے گی۔ مگر سنوائی نہ ہوئی۔

میرے ابا میاں جو مجسٹریٹ تھے اپنے انصاف اور حق پرستی کے لیے مشہور تھے سوچتی ہوں تو عقل کام نہیں کرتی کہ انھوں نے میری انّا کو کیسے نکال دیا۔

اس وقت وہ ساڑھے سترہ برس کی تھی اس کی یاد میں میں نے اپنا کلیجہ نکال ڈالا۔ ب بہنیں مجھے کندھے سے لگائے رات رات بھر ٹہلتیں مگر میری انا کی یاد اس کے شلوکے کی گرم گرم مہک ہوک بن کر اٹھتی رہی اور میں روتی رہی۔

یادداشت کا پہلا صفحہ الٹتی ہوں تو دھند ہی دھند ہے کوئی میلا میلا بھورا سا ہیولہ سل پر کوئی سفید سفید چیز پیس رہا ہے شاید کھیر کے لیے چاول ہیں دور کہیں کوئی تھکی ہاری عورت بین کر رہی ہے۔

''ہائے مورا پوت''

میرے پاس تونتوا کا پیالہ بھی نہیں ہے جسے ٹٹول کر دل کی بھڑاس نکال لوں۔ بس میں روتی ہوں۔ کس کا پوت؟ کہاں چلا گیا؟ میں کچھ نہیں جانتی بس روتی ہوں۔

میں اپنی منجھلی بہن کے سینے سے لگی صدیوں سے رو رہی ہوں۔ میں اس کے گریبان کے بٹن ٹٹولتی ہوں۔ شرم سے سرخ ہو کر وہ مجھے دور پھینک دیتی ہے۔ میری اماں نظر بچا جاتی ہیں۔ میری باجی مجھے پھر اٹھا لیتی ہے۔

''نہیں! توبہ۔ توبہ!'' وہ مجھے گریبان کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر تنبیہ کرتی ہے۔

''نہیں۔ توبہ۔'' میں تائید کرتی ہوں۔ وہ ہنس پڑتی ہے نظروں کے سامنے سے رنگ برنگے قمقموں کی قطاریں بنتی گذر جاتی ہیں باریک باریک روشن سلاخیں جال سا بنتی ہیں۔ میں بڑی ہو جاتی ہوں اب حلق پھاڑ کر چلانے کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیر بھی چلاتی ہوں بھائیوں کی پلٹن کے ساتھ باغوں اور کھیتوں پر دھاوے بھی مارتی ہوں کبھی خربوزوں کی فالیز پر تو کبھی کچی کیریوں کی دھن میں گھنی امریوں میں سرگرداں پھرتی ہوں زندگی ایک شور ہے ایک سریلا ہنگامہ ہے جس کا ماحصل نوچ کھسوٹ اور گتھم گتھا۔ ایک چنگھاڑتے چیختے ماحول کا ایک پرساز پُرآواز حصہ میں بھی ہوں۔

خوب غل مچتا ہے برتن کھڑکھڑاتے ہیں ڈھول پیٹتے ہیں گھنگرو بجتے ہیں اور باجی بیاہ کر چلی جاتی ہیں۔

دودھ کی بوتل ٹوٹ جائے یا اسے کتا نجس کردے تو کوڑے کے ڈبہ میں پھینک دیتے ہیں۔ ٹیکو کو پہلی گاڑی سے آگرہ روانہ کر دیا گیا اس نے بہت ہاتھ پیر جوڑے اماں کے قدموں پر ناک گھسی کہ اب وہ کسی کرم کی نہیں رہی اسے برادری میں کون گھسنے دے گا اور پھر داروغہ جی کا تحفہ وہ کس کے منہ پر مارے گی۔ مگر سنوائی نہ ہوئی۔

میرے ابا میاں جو مجسٹریٹ تھے اپنے انصاف اور حق پرستی کے لیے مشہور تھے سوچتی ہوں تو عقل کام نہیں کرتی کہ انھوں نے میری انّا کو کیسے نکال دیا۔

میں پھر یتیم رہ جاتی ہوں جنگلوں جنگلوں ویران گھوم رہی ہوں۔ روح اور جسم پر میل کی پپڑیاں جمتی جاتی ہیں میں کسی کی لاڈلی نہیں۔ کسی کا بوجھ نہیں۔ میری دادا گیری سے لوگ عاجز ہیں۔ مرغیوں کو کھریدنا کتوں کے ڈھیلے مارنا ہر ذی روح کو تنگ کرنا میرا مقصدِ حیات ہے اماں جب پکڑ پاتی ہیں جی بھر کے میری دھول جھاڑتی ہیں اور اپنے جی کا غبار۔

آج کل کے والدین تو بچوں کی تربیت پر کتابیں پڑھتے ہیں میرے زمانے میں کتابوں سے بچوں کو ٹھوکا جاتا تھا بشرطیکہ وہ نہایت موٹی ہوں۔

سب عاجز آ کر کہتے۔ یہ کولن کی لونڈیا ہے اس کا خون رنگ لا رہا ہے۔

ہائے کولن مجھے پھینک کر کہاں چلی گئی ہے۔ مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔ بس سانولی سلونی ٹھوڑی پر گودنے کے تین سیاہ نکتے مجھے یاد رہ گئے۔ اب بھی جب مجھے یاد رہ گئے۔ اب بھی جب کبھی میں تین نکتے گدی ہوئی ٹھوڑی دیکھتی ہوں تو جی گھبرانے لگتا ہے تنہائی کا احساس امڈ آتا ہے۔

ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ میں بھینس والی بڑی اماں کی مرغیوں کو ستا رہی تھی وہ ظہر کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی تھیں اور قوں قوں کے بولنے سے معذور تھیں۔ ایک دم میرے نام کی پکار پڑی۔ اماں کو بیٹھے بیٹھے مجھ پر پیار تو آیا نہ ہوگا پھر یہ کون سی سزا کی ادائگی ہوگی۔

دالان میں اماں اپنی مخصوص جگہ بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں۔

اور ان کے پیر پکڑے وہ بیٹھی تھی۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ میرے دل پر دھائیں سے موگری پڑی پیر پگھلنے لگے۔ ٹھوڑی کے تین نکتے! تین سنسناتی گولیاں میرے حواس جاتے رہے۔ پلٹ کر بگٹٹ بھاگی۔

پر اس نے چیل کی طرح جھپٹ کر مجھے دبوچ لیا۔

''ہائے میری چڑیا!''

وہ مجھے ننھی سی چڑیا کی طرح ہانپتی ہوئی چھوڑ کے گئی تھی۔ اس نے مجھے گود میں اٹھانے کی کوشش کی وہ چت گری اور اوپر میں۔ میں جو گیارہ برس کی عمر میں اس سے لمبی اور چوڑی تھی۔

میں نے اس کے نیچے سے چھوٹنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے، نوچا کھسوٹا دھکے دیے مگر نہ جانے میرے ہاتھوں میں ست کیوں نہ رہا۔ وہ مجھے دبوچ کر گلا پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔

اور میں بھی رونے لگی۔

میں نے لمحہ بھر کے لیے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ یا خدا وہ مجبور لمحہ! وہ اس کے شلو کے کی بھولی بھسری مہک۔ جیسے میں ماں کے پیٹ میں سو رہی ہوں وہ مجھے گائے کی طرح چاٹ رہی تھی۔ دکھاوے کو میں اب بھی کسمسا رہی تھی۔ مگر میری ساری طاقت اس کی گود میں پگھل چکی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ ایک دم اس نے اپنے شلوکے کے بٹن کھول دیے۔

"للی دودھ پیے گی؟" اس نے میرے منہ میں دودھ ٹھونس دیا۔

جم غفیر جو مجھے گھیرے میں لیے تماشہ دیکھ رہا تھا۔ قہقہے مارنے لگا۔ میں نے اسے زور کا دھکا دیا اور سرپٹ بھاگی۔

"بی بی جی۔ للی دودھ نا پیتی؟" اس نے اماں سے شکایت کی اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ میں نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔

میں غسل خانے میں چھپ کر خوب روئی۔ ٹیکو نے بھرے مجمع میں مجھے ذلیل کر کے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا تھا۔ سب نے مجھے اتنا چھیڑا کہ سسک سسک کر دعائیں مانگنے لگی۔ اللہ ٹیکو مر جائے۔ مر جائے۔ ٹیکو اماں تو مر جائے۔ ہائے ٹیکو اماں۔ ٹیکو میری چڑھ بن گئی۔

مگر ٹیکو نہیں مری۔ وہ سال چھٹے مہینے میرے لیے المونیم کے پیالے میں چنے، مُرمُرے، شکر کے کِھلونے، بھونڈی مٹی کی گجریاں اور ہاتھی گھوڑے لایا کرتی۔ وہ میری رگ پہچان گئی تھی۔ سب چھیڑتے ہیں۔ اس لیے اکیلے میں دیا کرتی۔

پھر بڑی راز داری سے پوچھتی۔

"للی دودھ پیے گی؟"

میں روٹھ جاتی تو وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو جاتی۔

تب ہولے ہولے مجھے ابا اور اماں کی باتوں سے پتہ چلا کہ ٹیکو کے میاں کو جب اس کے کرتوتوں کا پتہ چلا تو اس نے اتنا مارا کہ بغیر دائی کی مدد کے اسے داروغہ جی کے تحفے سے نجات مل گئی۔ میاں نے ایک نٹنی ڈال لی تھی۔ ٹیکو بال بچہ بھی نہیں پیدا کر سکتی تھی اس لیے اسے مار کر نکال دیا۔

ٹیکو نے ننوا کو بہت رجھانے کی کوشش کی اسے دودھ بھی دینا چاہا مگر عورت کی چھاتیاں اس کے لیے اجنبی تھیں وہ اپنا پیالہ بجاتا رہا اور پھر اس پر منہ رکھ کر سو گیا اور ایسا سویا کہ پھر جاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

ٹیکو اس پیالے سے سر پھوڑ پھوڑ کر روتی رہی بین کرتی رہی سسکتی رہی۔ یہ وہی زہر میں بجھا ہوا پیالہ تھا جس میں وہ میرے لیے کھیلیں بتاشے لایا کرتی تھی۔ جس سے مجھے شدید گھن آتی تھی۔ جیسے ننوا کے مردہ نیلے ہونٹ اب بھی اس کے کناروں پر رینگ رہے ہوں۔

پھر کئی سال کے لیے ٹیکو غائب ہو گئی۔ اب مجھے اس سے چڑھ بھی آنا بند ہو گئی۔ اس بات پر بھی شرم نہیں آتی تھی کہ میں نے کولن کا دودھ پیا تھا کولن جس نے مجھے دودھ پلانے کے جرم میں اپنی زندگی کا سب کچھ ہار دیا تھا۔ کولن جو میری ماں تھی۔

تب ہولے ہولے مجھے ابا اور اماں کی باتوں سے پتہ چلا کہ ٹیکو کے میاں کو جب اس کے کرتوتوں کا پتہ چلا تو اس نے اتنا مارا کہ بغیر دائی کی مدد کے اسے داروغہ جی کے تحفے سے نجات مل گئی۔ میاں نے ایک نٹنی ڈال لی تھی۔ ٹیکو بال بچہ بھی نہیں پیدا کر سکتی تھی اس لیے اسے مار کر نکال دیا۔ ٹیکو نے ننوا کو بہت رجھانے کی کوشش کی اسے دودھ بھی دینا چاہا مگر عورت کی چھاتیاں اس کے لیے اجنبی تھیں وہ اپنا پیالہ بجاتا رہا اور پھر اس پر منہ رکھ کر سو گیا اور ایسا سویا کہ پھر جاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

پھر وہی چلچلاتی دھوپ بھری دوپہر تھی کہ گلی میں لونڈوں کا غل سنائی دیا باولے کتّے سے پیچھا چھڑانے کے لیے گرتی پڑتی دروازے دھڑدھڑاتی ایک جھرکٹ سی بڑھیا گھر میں داخل ہوئی۔

رام کسن کھڑے ہمرے دوار، ہم لجا سے جھکی جھکی جائیں۔" اس نے بیچ صحن میں ہلکا سا گھونگھٹ کاڑھ کر تھرکنا شروع کر دیا۔

میں نے کتنی کہانیاں لکھیں! ہنستی کِھل کھلاتی، روتی، بسورتی اور کاٹتی بھنبھوڑتی۔ انھیں لکھتے وقت ہنسی بھی ہوں اور روئی بھی۔ اپنا خون بھی کھولایا ہے مگر ٹیکو ماں کا ذکر لکھتے وقت جو کرب اور جھلاہٹ میں محسوس کر رہی ہوں اسے لکھتے ہوئے میرا قلم دم چھوڑ دیتا ہے۔ چاہتی ہوں کہ وہ ٹیسوں کے بگولے جو میرے دماغ میں اُٹھ رہے ہیں انھیں بانٹ کر ذرا اس بوجھ کو ہلکا کر دوں جو ہمیشہ ٹیکو کے تصور سے میرا دم گھونٹنے لگتا ہے۔ مگر نہیں یہ میرے امکان میں نہیں۔

سب ہنس رہے تھے! وہ پاگلوں کی طرح ناچ رہی تھی۔ اس کا دودھ میری رگوں میں لاوا بن کر کھول رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھی سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

ہمیشہ وہ مجھے دیکھ کر بہہ جایا کرتی تھی۔ آنکھوں میں مٹھاس بھر جاتی ممتا سے جسم نڈھال ہو جاتا۔

"میری چڑیا!" کہہ کر وہ میری طرف لپکتی اور میں چڑھ کر بھاگا کرتی۔

مگر اس دن اس کی آنکھوں میں زہر میں ڈوبی اجنبیت کے سوا کچھ نہ تھا۔ لال لال آنکھوں میں ممتا کی چتا دہک رہی تھی۔

اس کا گریبان ناف تک چاک تھا۔ نرم گرم سانولے سینے کے بجائے لیترے جھول رہے تھے۔

"للی دودھ نہ پیے گی؟" اس نے پوچھا۔

اس کی بغل میں وہی المونیم کا پیالہ تھا جس کے کناروں پر ننوا کے دانتوں کے نشان تھے اور جس میں وہ میرے لیے شکر کے کھلونے اور کھیلیں لایا کرتی تھی۔ وہ پیالہ زہر سے چھلک رہا تھا۔

"جے بوئی جہر بس پیالہ جو میں نے ننوا کو دینا۔" پیالہ زمین پر اوندھا کر وہ ایک پیر سے کھڑی ہو کر گھوم گئی۔

ٹھوڑی پر گدے ہوئے تین سیاہ نکتے ترشول بن کر میرے کلیجے میں اتر گئے اور وہ تمام کا تمام زہر جو اس کے وجود میں پھنکار رہا تھا ہولے ہولے وجود میں رسنے لگا۔

لوگ تماشے سے اکتا کر اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے دور تک اس کے بین گونجتے رہے۔

"جے بوئی جہر بس پیالہ۔"

پھر وہ کبھی نہیں آئی۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے۔ وہ زہر میں بجھا ہوا پیالہ کہاں ہے؟ جس کے کنارے پر ننوا کے اودے اودے مردہ ہونٹ جنم جنم کی پیاس لیے اب بھی سسک رہے ہوں گے۔

نقش کراچی، شمارہ 6، 1964

بشکریہ: جمیل اختر

■

رؤف صادق

اصناف سخن
سرسری مطالعہ

کلام دو قسم کا ہوتا ہے ایک نثر دوسرا نظم۔

نظم کے معنی موتی پرونا، آراستہ کرنا، سنوارنا ہے۔ شعری اصطلاح میں موزوں کلام کو کہتے ہیں۔ اردو میں نظم کی دس قسمیں ہیں:

(1) فرد، (2) قطعہ، (3) رباعی، (4) غزل، (5) قصیدہ، (6) مثنوی، (7) ترکیب بند، (8) ترجیع بند، (9) مستزاد، (10) مسمط۔

(1) **فرد:** واحد شعر کو کہتے ہیں۔ جس کے دونوں مصرعے ہم وزن ہوتے ہیں۔ قافیہ ردیف کی پابندی نہیں ہوتی۔ شعر کے اصلی معنی دریافت کرنا، موزوں ہوتا ہے۔ شعر کو بیت بھی کہا جاتا ہے۔ مصرع کے لغوی معنی 'کواڑ' کے ہوتے ہیں۔ جو شعر کا نصف حصہ ہوتا ہے۔ جس طرح دروازے کے دو پٹ ہوتے ہیں۔ اسی طرح شعر دو مصرعوں کا ہوتا ہے۔

(2) **قطعہ:** بمعنی کاٹنا یا ٹکڑے کرنا۔ قطعہ میں مطلع ہو یا نہ ہو مگر آخری تمام مصرعوں میں قافیے ضرور ہوتے ہیں۔ قطعہ میں کم سے کم دو شعر اور زیادہ کی قید نہیں ہوتی۔

(3) **رباعی:** رباعی کے لیے بحر ہزج مخصوص ہے۔ رباعی ہر وزن میں نہیں کہی جاسکتی۔ رباعی کے کل چوبیس اوزان ہوتے ہیں۔ رباعی کا آسان وزن لاحول ولاقوۃ الا باللہ ہے۔ رباعی کے چار مصرعے مقررہ اوزان پر ہوتے ہیں۔ پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ چوتھا مصرع برجستہ، چست اور پراثر ہوتا ہے۔

(4) **غزل:** غزل کے لغوی معنیٰ عورتوں سے باتیں کرنا، عموماً عشق ومحبت، حسرت و یاس، اُمید و بیم اور انسانی جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ آج کل سماجی موضوعات غزل کا حصہ بن گئے ہیں۔ غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ باقی ثانی مصرعے میں قافیہ ردیف ہوتے ہیں۔ غزل کے سب سے اچھے شعر کو حاصل غزل یا بیت الغزل بھی کہتے ہیں۔ غزل میں اگر یکے بعد دیگرے کئی مطالعے ہوں تو دوسرے شعر کو زیب مطلع اور تیسرے شعر کو حسن مطلع کہتے ہیں۔ غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ مقطع کہلاتا ہے۔

(5) **قصیدہ:** کسی خاص مقصد یا موضوع کو بیان کیا جاتا ہے اس میں نظم میں کسی کی تعریف یا برائی ہوتی ہے۔ پہلے شعر کے دونوں مصرعے باقی ثانی مصرعوں سے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ردیف کے توسط سے قصیدے کو موسوم کیا جاتا ہے۔ قصیدے کی تشکیل کچھ اس طرح ہوتی ہے: تشبیب یا تمہید، گریز، غیبت خطاب مدعا، دعا خاتمہ۔

(6) **مثنوی:** ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ ایک ہی وزن پر تمام اشعار ہوتے ہیں۔ تمہید، توحید و مناجات سے مثنوی کی ابتدا ہوتی ہے۔ مثنوی مولانا روم، مہر عشق، سحرالبیان، سکندر نامہ، مثنوی گلزار نسیم، مشہور مثنویاں ہیں۔

(7) **ترکیب بند:** جس میں ہر بند کے بعد مختلف شعر مختلف قافیوں میں ہوتے ہیں۔

(8) **ترجیع بند:** غزل کے ہر بند کے بعد ایک مخصوص شعر بار بار استعمال ہوتا ہے اور ہر بند کے اشعار کے قافیہ ردیف مختلف ہوتے ہیں۔

(9) **مستزاد:** رباعی کے ہر مصرعے کے آخر میں مضمون سے جڑا ایک با معنی کلمہ وزن سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

(10) **مسمط:** چند مصرعے ایک ہی بند میں ایک ہی وزن و قافیہ میں ہوتے ہیں۔ دوسرے بند کا آخری مصرعہ پہلے قافیہ پر لکھا جاتا ہے۔ باقی بند بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ اس نظم کی آٹھ قسمیں ہیں:

مثلث: تین مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے دو مصرعے ہم قافیہ اور تیسرا کسی اور قافیہ میں ہوتا ہے۔ آج کل پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ لکھا جانے لگا ہے۔ جسے ثلاثی یا تثلیث بھی کہتے ہیں۔ قمر اقبال کا مجموعہ 'تتلیاں' اس کی مثال ہے۔

مربع: جس کے چار مصرعے ہم وزن اور ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

مخمس: جس کے ہر بند کا پانچواں مصرعہ پہلے بند کے

آخری مصرعے کا ہم قافیہ ہوتا ہے۔

مسدس: چھ مصرعے والی نظم ہوتی ہے۔ آخری دو مصرعوں کا قافیہ چاروں مصرعوں سے الگ ہوتا ہے۔ مسدس حالی دیکھیے۔

اسی طرح، مسبع، مثمن، متسع اور معشر کو بھی اسی ترتیب سے نظم کیا جاتا ہے۔

نظم معریٰ: قافیہ ردیف سے آزاد نظم ہوتی ہے۔ ایک ہی بحر میں لکھی جاتی ہے۔ ارکان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

نثری نظم: قافیہ ردیف اور بحر سے آزاد ہوتی ہے۔

سانیٹ، ماہیے، ہائیکو وغیرہ دوسری زبانوں کی اصناف ہیں۔ جو اردو میں مستعمل ہیں۔

علم بدیع: جس میں کلام کی خوبیوں کو صنعت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ لفظی و معنوی، دو قسمیں ہوتی ہیں۔

صنائع لفظی:

تجنیس کی چار قسمیں ہوتی ہے:

(1) تجنیس تام (2) تجنیس مرکب (3) تجنیس محرف (4) تجنیس خطی۔

تجنیس تام: کپڑے کی ایک قسم کو کہتے ہیں۔ بہتر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

تجنیس مرکب: ایک ہی لفظ سے دو معنی نکالنا۔ دستک۔ دس۔ تک۔

تجنیس محرف: حروف ایک جیسے ہوں مگر تلفظ میں فرق ہو۔ عَلم۔ عِلم

تجنیس خطی: نقطے لگانے سے معنی میں فرق آ جائے۔ رحمت زحمت، عین غین۔

لزوم: کسی لفظ یا فقرے کا بار بار شعر میں استعمال کرنا۔

اشتقاق: جیسے۔ برق۔ براق۔

معاد: ایک مصرع کے آخر میں جو لفظ آئے دوسرے مصرع کے شروع میں آتا جائے۔ یہ سلسلہ نظم کے آخر تک جاری رہے۔

قطع الحروف: جس میں کوئی حرف آپس میں ملتے نہ ہوں۔ وارد، درد۔ ادراک۔

منقوطہ: با نقطہ حروف، پیچ، تشبیب، شب

مہملہ: بے نقطہ حروف، محروم، حمام، سحری

رقطا: ایک حرف با نقطہ ایک حرف بے نقطہ۔ صنوبر، عنکبوت

خیفا: ایک لفظ نقطہ دوسرا بے نقطہ۔ فق ہوا۔ شب سحر

ترصیع: ہم قافیوں کی طرح شعر میں ہر لفظ کا استعمال۔

توشیح: مصرعوں یا اشعار کے اولین حروف سے عبارت بنانا۔

بین القوافی: غزل میں ایک شعر چھوڑ کر بار بار اُسی قافیے کا استعمال کرنا۔

ذوالبحرین: ایک مصرع یا غزل دو بحروں میں پڑھی جائے۔ سالم اور ناقص۔ دو قسمیں ہیں:

سالم: شروع سے آخر تک کچھ حذف نہ ہو۔

ناقص: جس میں کمی بیشی ہو مگر معنی صحیح طور پر ادا ہو۔

صنائع معنوی:

تضاد: دو ایسے لفظ جو آپس میں ضد رکھتے ہوں۔ میٹھا، کڑوا، شور، سکون

ایہام: دو معنی لفظ، جس کے دوسرے معنی بھی فوراً سمجھ میں آ جائے۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایہام مرشح، ایہام مجرد

رجوع: ایک بات کہنا، پھر ناقص سمجھ کر اسی بات کو آگے بڑھانا۔

لف و نشر: چیزوں کی ترتیب کو ملحوظ رکھنا۔ ورنہ غیر مرتب کہلاتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں مرتب اور غیر مرتب۔

مبالغہ: کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔ تبلیغ، اغراق، غلو، تین قسمیں ہیں۔

حسن تعلیل: کسی بات میں حسن پیدا کرنا، پر لطف کرنا۔

توجیہ: ہجو و تعریف، دونوں کا مفہوم ایک ساتھ ظاہر ہونا۔

تلمیح: کسی مشہور قصے کی طرف اشارے کنایے میں بات کہنا۔

سیاق الاعداد: اعداد کو بالترتیب یا بے ترتیب شعر میں استعمال کرنا۔

ترجمہ: ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا۔ یہ عیب نہیں صنعت ہے۔

تشبیہ: ایک چیز کا دوسری چیز کے وصف سے مشابہ کرنا جس کو تشبیہ دی جائے اُسے مشبہ اور اس کے وصف کو مشبہ بہ کہتے ہیں۔ اس کی سات قسمیں ہیں۔ مطلق، کنایہ، مشروط، عکس، تسویہ، اضمار، تفصیل۔

استعارہ: ایک لفظ کے معنی بہ رعایت استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

تضاد موجبہ: دو حرف، دو اسم یا دو فعل کی ضد ہوں۔

سالبہ: منفی یا مثبت قسم کا تضاد۔

براعت استہلال: ایسے اشعار جن سے آئندہ کا حال ظاہر ہو۔

مراعاۃ النظیر: مناسبات سے چند امور کا ایک ساتھ جمع کرنا۔ اس کی دو قسمیں ہیں: تشابہ الاطراف، ایہام التناسب۔

عیوب فصاحت:

اخلال: شعر میں کسی لفظ کے رہ جانے سے مضمون نامکمل رہ جائے۔

ابتذال: بے ہودہ، غیر اخلاقی، الفاظ و اسلوب کا استعمال۔

تعقید: موزونیت کے لحاظ سے الفاظ اس طرح آگے پیچھے ہو جائیں کہ شعر مبہم اور سمجھنے میں دقت پیدا ہو جائے۔

تاخیر: جو بات پہلے کہنا چاہیے تھی۔ بعد میں کہہ دی جائے۔

شتر گربہ: پہلے مصرع میں 'آپ' دوسرے مصرع میں 'تم' یا 'تو' کا استعمال۔

تناقض: ایک ہی شے کی دو صفتوں میں فرق پیدا کرنا۔

تنزل: کسی بڑی صفت بیان کر کے پھر کوئی چھوٹی صفت بیان کرنا۔

حشو: شعر میں زائد لفظ کا استعمال، جس کے نہ ہونے سے معنی میں کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ اس کی چار قسمیں ہیں۔ مع التکرار، مع المتجانس، مع الاشتقاق، مع شبہ الاشتقاق۔

تکلف: بے فائدہ الفاظ گھڑنا۔

تکرار: بلا ضرورت کسی لفظ کا بار بار استعمال کرنا۔

تخلیع: متروک بحروں میں شعر کہنا۔

غرابت: غیر مانوس لفظوں کا استعمال۔ جن کو لغت دیکھے بغیر معنی سمجھ میں نہ آئیں۔

تخالف: کسی لفظ کو اہل لغت کے خلاف لکھنا۔

ضعف تالیف: نئی ترکیبیں پیدا کرنا۔ ہندی مضاف یا مضاف الیہ یا ہندی معطوف یا معطوب الیہ تراشنا۔

تتابع: شعر میں کئی اضافتوں کا استعمال۔ دو یا تین اضافتوں کا لانا جائز ہے۔

تنافر معنوی: شعر میں اصلی مفہوم کے علاوہ ذلیل معنی بھی پیدا ہو جائے۔

تنافر حروف: ایسے لفظوں کا استعمال جس سے بولنے میں مشکل پیدا ہو۔

جزر حروف: حرف علت کا گرا دینا۔ مگر الف وصل کا گرنا یا دبنا جائز ہے۔

تقابل ردیفین: غزل کے مصرعۂ اولیٰ میں ردیف کا استعمال۔

ایطا: ایطائے جلی یا ایطائے خفی۔ جو غزل کے مطلع میں واقع ہوتا ہے۔

ایطائے جلی: مطلع میں قافیوں کا لفظ و معنی کے لحاظ سے مکرر آ جانا۔ دو قافیے لفظاً ایک ہوں مگر معنی جدا ہوں تو صنعت تجنیس میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک قافیہ فارسی کا ایک ہندی کا ہو تو ایطا نہیں آ سکتا۔

ایطائے خفی: حرف روی قافیے سے نکال لیا جائے اور جو با معنی حروف باقی رہیں تو ہم قافیہ نہیں ہو سکتے۔

Rauf Sadiq, 10/11, Gate No.5, O.C.C. Malwani, Malad (w) Mumbai - 400095

اردو نظم میں مغربی اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں

حنیف کیفی

محمد حسین آزاد نے انگریزی ادب کے اثرات کے تحت جس جدید نظم کا سنگِ بنیاد رکھا تھا اور ان کی تائید میں یا ان کے اثر سے مولانا حالی اور اسماعیل میرٹھی نے جس انداز کی نظم نگاری کی اس کا بنیادی مقصد اردو شاعری کی اصلاح اور اس کی موضوعاتی وسعت تھا۔ کچھ اس اصلاحی مقصد کے تحت اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ جدید اردو نظم کے یہ اولین معمار انگریزی زبان اور اس کے شعر و ادب سے براہِ راست واقف نہیں تھے، انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اردو شاعری میں مروج ہیئتوں کو وسیلہ بنایا اور بالخصوص مثنوی، مسدس اور ترکیب بند کے سانچوں کو نئے امکانات اور وسعتوں سے روشناس کرایا۔ انگریزی کی شعری ہیئتوں کا استعمال نہ ان بزرگوں کا مقصود تھا اور نہ وہ اس کے اہل تھے۔ لیکن آزاد اور حالی نے اپنی نثر اور نظم کے ذریعے اردو شعرا میں تبدیلی کا جو شعور پیدا کر دیا تھا اس نے آگے چل کر نئے تجربوں کے لیے زمین ہموار کر دی۔ اردو شاعری کے رنگ و آہنگ اور شکل و صورت میں بعد میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا سلسلہ آزاد اور حالی کی قائم کردہ اسی روایت سے ملتا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں اردو پر انگریزی شعر و ادب کے راست اثرات کا آغاز ہوتا ہے۔ نئی نسل کے شعرا جو انگریزی زبان کے تعلیم یافتہ ہونے کے باعث انگریزی شاعری سے براہِ راست واقف اور لطف اندوز ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجموں اور انگریزی نظموں کی طرز پر طبع زاد نظموں کے ذریعے اردو شاعری کو نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔ اردو نظم کے پرانے سانچوں کے ساتھ ساتھ اب نئے سانچے بھی وجود میں آنے لگے۔ اردو نظم میں باضابطہ طور پر اور شعوری کوشش کے تحت انگریزی کی جس شعری ہیئت نے نفوذ پایا اور جس نے آگے چل کر بہت زیادہ اہمیت اور مقبولیت حاصل کی وہ متبادل قوافی (Alternate Rhymes) کے مصرعوں پر مشتمل انگریزی بند کی ایک مخصوص ہیئت Quatrain (مربع) تھی۔ بند کی یہ ہیئت، جس کی ترتیبِ قوافی اب اب ہے، یعنی پہلا مصرع تیسرے مصرعے کا اور دوسرا مصرع چوتھے مصرع کا ہم قافیہ ہوتا ہے، اسے اردو میں سب سے پہلے پنڈت برج

موہن دتاتریہ کیفی نے 1887 میں اپنی نظم 'ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی پر' میں استعمال کیا۔ دس سال بعد نظم طباطبائی نے اپنی مشہور و معروف نظم 'گورِ غریباں' میں اس ہیئت کا استعمال کیا۔ یہ نظم، جو ٹامس گرے کی Elegy Written in the Country Churchyard کا ترجمہ ہے، 'دلگداز' جولائی 1897 میں شائع ہوئی۔ 'گورِ غریباں'، جس میں ترجمہ تخلیقی شان کا مرتبہ رکھتا ہے، اس نئے اسٹینزا فارم کے ماہرانہ استعمال کی کامیاب مثال ہے۔ اس نظم نے اپنے شاعرانہ محاسن اور فنکارانہ خوبیوں کی بدولت آناً فاناً قبولِ عام کا درجہ حاصل کرلیا۔ نئے شعرا پر اس کا دوطرفہ اثر ہوا۔ ایک طرف تو منظوم ترجمے رواج پانے لگے، دوسری طرف یہ اسٹینزا فارم تیزی کے ساتھ مقبول ہونے لگی۔ یہ مقبولیت اس حد تک بڑھی کہ آگے چل کر اردو میں بند کی اس ہیئت کا نام ہی اسٹینزا، اسٹانزا، اسٹینزا اور استانزا پڑ گیا۔ اُس وقت کے شعرا، ضامن کنتوری، نادر کاکوروی، بدرالزماں وغیرہ نے اپنے منظوم ترجموں اور طبع زاد نظموں میں اس فارم کا استعمال کیا۔ ایسی مثالیں بھی نظر آتی ہیں کہ اس ہیئت کو بنیاد بنا کر نئے تجربے بھی کیے گئے۔ مثلاً وحیدالدین سلیم اور محمد شاہ دین ہمایوں کے مسدس جن کے پہلے چار مصرعے مسدس کی مروجہ ہیئت کے خلاف اب اب کی ترتیب قوافی میں تھے۔ اسٹینزا فارم کی اس ہیئت میں تجربے کی ایک دلچسپ مثال سجاد حیدر یلدرم کی نظم 'انتہائے یاس' ہے جو دسمبر 1897 کے 'دلگداز' میں شائع ہوئی۔ پانچ بندوں پر مشتمل اس نظم میں بیک وقت تین تجربے کیے گئے تھے۔ ہر بند کی ترتیب قوافی اب اب تھی۔ اسی کے ساتھ بند کے چاروں مصرعے متبادل قوافی پر مشتمل ہوتے ہوئے صوتی اعتبار سے ہم قافیہ تھے۔ ہر بند کے آخر میں مستزاد کے طور پر ایک ٹکڑا رکھا گیا تھا جس کا قافیہ بندوں کے قافیے سے مختلف تھا مگر مستزاد کے تمام فقرے آپس میں ہم قافیہ تھے۔ ایک بند مثال کے طور پر پیش ہے:

مجھ کو قسامِ ازل نے نہ دیا کچھ جز یاس
نا امیدی کے لیے میں ہی تو ہوں خاص الخاص
دل شکستہ ہوں سیہ بخت ہوں اور ہوں بے آس
مجھ پہ ہی پڑتے ہیں تیرِ ستم و تیغ قصاص
یہ بھی ہوتا ہے کہیں

پانچوں بندوں میں فقرۂ مستزاد کے قافیہ کہیں کے ہم قافیہ الفاظ نہیں، یقیں، حزیں استعمال کیے گئے ہیں۔ اواخر انیسویں صدی میں فروغ پانے والے اس اسٹینزا کی مقبولیت بیسویں صدی میں جاری رہی اور شعرا نے کلی یا جزوی طور پر اس ہیئت کا استعمال اپنی نظموں میں کیا۔ فیض احمد فیض کی متعدد نظموں میں اس ہیئت کے جزوی طور پر استعمال کی صورت نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر 'صبح آزادی' کو پیش کیا جاسکتا ہے جس کے بندوں کے پہلے چار مصرعے اسی ہیئت کے مطابق ہیں۔

انگریزی شاعری کے براہِ راست مطالعے کا ایک بڑا خوشگوار اور بارآور اثر یہ ہوا کہ اردو شعرا پہلی بار انگریزی شاعری کے صنفی امتیازات، تکنیکی خصوصیات، اظہار کے پیرایوں، اسلوب کی صورتوں اور اسی طرح کی دیگر فنی نزاکتوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں اور اس سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف منظوم ترجموں میں بلکہ طبع زاد نظموں میں بھی انگریزی نظموں کی طرز اختیار کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں اردو شاعری نہ صرف معنوی اعتبار سے بلکہ خارجی سطح پر بھی بڑھتی اور پھیلتی نظر آتی ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزی شاعری سے اثر پذیری کے جس رجحان کی ابتدا ہوئی تھی وہ روز بروز بڑھتا گیا

شرر کے زمانے میں نظم معرا کے سلسلے میں بحث کا جو انداز رہا اس کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا۔ بعد کے زمانے میں شرر کے ڈرامے کی ہیئت پر سوال اٹھایا گیا اور بقول خلیل الرحمن اعظمی اسے 'آج کی اصطلاح میں آزاد نظم' کہا گیا۔ یہ خیال بھی دراصل غلط فہمی پر مبنی ہے، کیونکہ کرداروں کے مختلف مکالموں کی بنیاد پر، جو ظاہر ہے کہ چھوٹے بڑے ہوں گے، اسے آزاد نظم قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ مختلف مکالموں کو ملاکر مکمل مصرع بن جاتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو شرر کا ڈراما آزاد نظم میں نہیں بلکہ معرا نظم میں ہے اور جس چیز کو اس کی ہیئت سمجھ کر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ آزاد نظم میں ہے وہ دراصل اس کی ہیئت نہیں بلکہ تکنیک ہے۔

اور اس کے نتیجے میں اردو شاعری کو نئی وسعتوں سے آشنا کرنے کی تمنا اور اس میں نئی نئی تبدیلیاں لانے کی لہر تیز ہوتی گئی۔ بیسویں صدی کے ثلث اول میں یہ لہر ایک سیلاب کی شکل اختیار کرگئی، ادبی ہنگامہ خیزی کے اس دور میں نظم معرا کی تحریک اٹھی، سانٹ کا چلن ہوا، بندوں کی ساخت میں نت نئی تبدیلیاں ظہور میں آئیں، آزاد نظم کا وجود ہوا اور اظہار کے گوناگوں پیرایوں سے اردو شاعری کا دامن بھرنے لگا۔

اردو شاعری میں اظہار کے ان نئے پیرایوں کو فروغ دینے میں عبدالحلیم شرر اور سر عبدالقادر کی خدمات کو بڑا دخل ہے، جنھوں نے اپنے رسالوں، بالترتیب 'دلگداز' اور 'مخزن'، میں قدیم شعری اصناف کے ساتھ ساتھ نئے انداز کی نظمیں بھی شائع کیں اور انگریزی نظموں کی طرز پر لکھی جانے والی نظموں کے شعرا کی اپنی تعارفی تحریروں سے ہمت افزائی بھی کی۔ شرر نے سب سے پہلے اردو شاعری کی 'صدہا قیدوں' اور 'ہزار ہا پابندیوں' کے خلاف آواز اٹھائی۔ 'دلگداز' کے اجرا کے دو ہی سال بعد اور 'مقدمہ شعرو شاعری' کی اشاعت سے چار سال قبل ستمبر 1889 کے 'دلگداز' میں مضمون 'ہمارا لٹریچر' کے ذریعے ان قیدوں اور پابندیوں سے آزادی کی خواہش ظاہر کی۔ اس خواہش کا عملی نتیجہ نظم معرا کی اس تحریک کی شکل میں نمودار ہوا جس کی ابتدا انھوں نے جون 1900 کے 'دلگداز' کے صفحات پر ایک ڈرامے کی صورت میں کی۔ اس ڈرامے کے چھ سین مئی 1901 میں شائع ہوئے۔ اس ڈرامے کے شائع ہونے کے بعد جہاں کچھ نئی نسل کے شعرا نے اس سے متاثر ہوکر معرا نظمیں اور مختصر ڈرامے اس ہیئت میں لکھے وہیں پرانی نسل کے لوگوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ احسن مارہروی نے اپنے رسالہ 'فصیح الملک' میں یہ نکتہ اٹھایا کہ شرر نے جس چیز کو نظم معرا کہا ہے وہ نثر مُرجز ہے اور پھر اسی دائرے میں بحث کا یہ سلسلہ دراز ہوتا رہا۔ یہ بحث دراصل نثر مرجز کے غلط تصور کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی کیونکہ نثر مرجز کے فقروں میں وزن عروضی ہوتا ہے وزنِ بحور نہیں، جو نظم کی خصوصیت ہے اور جو نظم معرا میں بھی پایا جاتا ہے۔ نثر مرجز کے الفاظ میں وزن عروضی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے دو فقروں کے متبادل الفاظ ہم وزن ہوتے ہیں، یعنی ایک فقرے کا پہلا لفظ دوسرے فقرے کے پہلے لفظ کا ہم وزن ہوگا، اسی طرح ترتیب سے ایک فقرے کا ہر لفظ دوسرے فقرے کے ہر لفظ کا ہم وزن ہوگا۔

شرر کے زمانے میں نظم معرا کے سلسلے میں بحث کا جو انداز رہا اس کی طرف سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا۔ بعد کے زمانے میں شرر کے ڈرامے کی ہیئت پر سوال اٹھایا گیا اور بقول خلیل الرحمن اعظمی اسے 'آج کی اصطلاح میں آزاد نظم' کہا گیا۔ یہ خیال بھی دراصل غلط فہمی پر مبنی ہے، کیونکہ کرداروں کے مختلف مکالموں کی بنیاد پر، جو ظاہر ہے کہ چھوٹے بڑے ہوں گے، اسے آزاد نظم قرار دے دیا جاتا ہے جبکہ مختلف مکالموں کو ملاکر مکمل مصرع بن جاتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو شرر کا ڈراما آزاد نظم میں نہیں بلکہ معرا نظم میں ہے اور جس چیز کو اس کی ہیئت سمجھ کر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ آزاد نظم میں ہے وہ دراصل اس کی ہیئت نہیں بلکہ تکنیک ہے۔

نظم معرا کو فروغ دینے کے لیے شرر کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ ان کے زمانے میں پھل پھول نہ سکی اور اسے اردو

شاعری میں اپنی جگہ بنانے کے لیے 1935 کے بعد کے زمانے کا انتظار کرنا پڑا جبکہ حلقۂ ارباب ذوق نے اسے اپنے اظہار کا کامیاب وسیلہ بنا کر پیش کیا۔ اس زمانے تک آزاد نظم بھی اپنے قدم جما چکی تھی۔ آزاد نظم کی اس کامیابی نے بھی نظم معرا کے آگے بڑھنے اور مقبولیت حاصل کرنے کی راہ ہموار کردی۔

اردو میں آزاد نظم کا ورود اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ یہ اردو شاعری میں سب سے زیادہ انقلاب انگیز اور ہنگامہ خیز تجربہ تھا جس نے اردو شاعری کے دونوں اہم ستونوں قافیہ اور وزن پر کاری ضرب لگائی۔ اسے نہ صرف قافیے کی قید سے آزاد کیا بلکہ وزن کی جکڑ بندیوں سے بھی آزاد کیا۔ اسی کے ساتھ اس تجربے کی یہ اہمیت بھی قابل ذکر ہے کہ اردو شاعری کا یہ پہلا تجربہ ہے جو ہم عصر مغربی ادب کے کسی تجربے کے زیر اثر وجود میں آیا اور آئندہ اس قسم کے تجربوں کے لیے راہیں کھول دیں ورنہ اس سے پہلے کے تجربوں تک تو اردو کی رسائی اُس وقت ہوسکی تھی جب وہ اصل زبان میں فرسودہ و پامال اور بہت سی صورتوں میں مردہ ہوچکے تھے۔ اردو آزاد نظم کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ وہ آزاد ہونے کے باوجود بڑی حد تک پابند ہے کیونکہ اس نے اپنے آہنگ کے لیے اسی عروض کا سہارا لیا جس میں اردو کی پابند شاعری ہے، البتہ اس نے اس روایتی عروض کے مروجہ قوانین میں تبدیلی کردی۔ اردو کی آزاد نظم کا آہنگ ارکانِ بحر کی مقررہ تعداد میں کمی بیشی کے ذریعے تشکیل پایا اور ارکان کی اس کمی بیشی میں بھی مستزاد کے اصول کو پیشِ نظر رکھا گیا جس کے مطابق بحر کے صرف درمیانی ارکان کو کم یا زیادہ کیا جاسکتا تھا۔ اس اصول کی روشنی میں آخری رکن کی دو مصرعوں میں تقسیم غلط قرار پائی۔ اس لحاظ سے ہر مصرعے کی ابتدا کا انداز ایک ہی رہا۔ اس طرح اردو کی آزاد نظم نے صرف اتنا کیا کہ مروجہ اردو شاعری کے آہنگ کی قطعیت کو ختم کرکے اس میں وسعت پیدا کردی لیکن وزن کی پابندی سے آزاد نہ ہوسکی۔ اردو آزاد نظم کے برعکس انگریزی آزاد نظم کے شاعر کو یہ آزادی حاصل رہی ہے کہ وہ بحر کا استعمال مروجہ اصولوں کے خلاف بھی کرسکتا تھا، مختلف اوزان کا امتزاج بھی کرسکتا تھا اور بغیر وزن کے بھی نظم لکھ سکتا تھا۔ بہر حال اُس وقت اردو شاعری کے لیے آزاد نظم کی یہ آزادی بھی بہت تھی۔ آگے چل کر یعنی 1947 کے بعد آزاد نظم کو مزید آزاد کرتے ہوئے مستزاد کے اس اصول کو ترک کردیا گیا جس پر اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔

اردو آزاد نظم نے اپنی ترقی کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کیں۔ اس کی خوش نصیبی تھی کہ زمانہ سازگار ہونے کے ساتھ ساتھ اسے شروع ہی سے اچھے شعرا کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ تصدق حسین خالد، جنھوں نے آزاد نظم کو اردو سے روشناس کرایا، اور ن۔ م۔ راشد اور میرا جی جنھوں نے اسے فنکارانہ پختگی اور مقبولیت عطا کی، ان سب کا مطالعہ وسیع تھا، مشرقی ادب کے ساتھ ساتھ مغربی ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی، انگریزی اور اردو دونوں کی شاعری کے رموز و نکات کا انھیں ادراک تھا، بدلتے ہوئے زمانے کے گونا گوں تجربات کا انھیں شعور حاصل تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ یہ تخلیقی فنکار تھے نیز یہ بات کہنے کا ڈھنگ، اسے فن بنانے کا طریقہ اور اس میں اثر پیدا کرنے کا گر جانتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ چیز، جو ایک بے تکی تک بندی سمجھی جاتی تھی، بہت جلد شاعری کا درجہ پاگئی اور اس نے اردو شاعری کی بنیادی روایات توڑنے کے باوجود اسی شاعری میں اپنی بنیادیں مضبوط کرلیں۔ اقلیمِ نظر میں آج آزاد نظم کو سکۂ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے اور اس نے اردو شاعری سے پابند نظم کی بالادستی کو ختم کردیا ہے۔

اردو آزاد نظم کے سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ وہ آزاد ہونے کے باوجود بڑی حد تک پابند ہے کیونکہ اس نے اپنے آہنگ کے لیے اسی عروض کا سہارا لیا جس میں اردو کی پابند شاعری ہے، البتہ اس نے اس روایتی عروض کے مروجہ قوانین میں تبدیلی کردی۔ اردو کی آزاد نظم کا آہنگ ارکانِ بحر کی مقررہ تعداد میں کمی بیشی کے ذریعے تشکیل پایا اور ارکان کی اس کمی بیشی میں بھی مستزاد کے اصول کو پیشِ نظر رکھا گیا جس کے مطابق بحر کے صرف درمیانی ارکان کو کم یا زیادہ کیا جاسکتا تھا۔ اس اصول کی روشنی میں آخری رکن کی دو مصرعوں میں تقسیم غلط قرار پائی۔ اس لحاظ سے ہر مصرعے کی ابتدا کا انداز ایک ہی رہا۔ اس طرح اردو کی آزاد نظم نے صرف اتنا کیا کہ مروجہ اردو شاعری کے آہنگ کی قطعیت کو ختم کرکے اس میں وسعت پیدا کردی لیکن وزن کی پابندی سے آزاد نہ ہوسکی۔

اردو میں مغربی ادب کی ان شعری ہیئتوں کے ذکر کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو ایسی مغربی شعری اصناف پر بھی ہلکی سی نظر ڈال لی جائے جو مکمل صنفِ سخن کی حیثیت سے اردو میں داخل ہوئیں۔ یہ اصناف سانٹ اور ترائیلے ہیں۔ اردو میں سانٹ 1903 میں عظیم الدین احمد کے ہاتھوں وجود میں آیا اور اسے اختر شیرانی کے زمانے میں، انھیں کے اثر سے، مقبولیت حاصل ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مقبولیت کے زمانے میں سانٹوں کا صرف ایک مجموعہ، وہ بھی ایک غیر معروف شاعر شائق وارثی کا وجود میں آیا، جبکہ 1947 کے بعد، جبکہ آزاد نظم کا سکہ چلنے کی وجہ سے اس کا بڑی حد تک زوال ہوچکا تھا، کئی مجموعے منظر عام پر آگئے۔ عزیز تمنائی کا 'برگِ نوخیز'، ناظم جعفری کا 'تنویر خیال'، خلیل الرحمن راز کا 'ایک سو پچیس سانٹ'، نادم بلخی کا نعتیہ سانٹوں کا مجموعہ 'چودہ طبق' سب اسی دور کی پیداوار ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ شعرا کے شعری مجموعوں میں بھی سانٹوں کی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں محمد عرفان اور نثار ایلوی کے نام مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جہاں تک اردو سانٹوں کی تکنیکی خصوصیات کا سوال ہے، میں دوسری تمام باتوں سے گریز کرتے ہوئے صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ اردو میں ان کا لحاظ بہت کم رکھا گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ اردو میں سانٹوں کے اچھے نمونے نہیں ہیں لیکن زیادہ تر شاعروں نے اس کے اصولوں کا خیال نہیں رکھا ہے اور محض چودہ مصرعوں کی نظم سمجھ کر اسے تختۂ مشق بنایا ہے۔

فرانسیسی صنفِ شاعری ترائیلے، جسے اردو میں عطا محمد شعلہ نے، ان کے دعوے کے مطابق، 1946 کے آس پاس روشناس کرایا، اتنی بھی مقبولیت حاصل نہ کرپایا جتنی سانٹ نے حاصل کی۔ وجہ اس کا محدود پیمانہ اور پیچیدہ ترتیب ہے۔ آٹھ مصرعوں پر مشتمل اس صنف سخن میں اصلاً پانچ مصرعے ہوتے ہیں جن کی مخصوص ترتیب سے یہ صنف تشکیل پاتی ہے۔ اس کی ترتیب قوافی اب اا اب اب ہوتی ہے۔ اس ترتیب قوافی کے تحت پہلا مصرع تیسرے، چوتھے، پانچویں اور ساتویں مصرعے کا ہم قافیہ ہوتا ہے اور دوسرا، چھٹا اور آٹھواں مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ نیز پہلے مصرعے کی تکرار چوتھے اور ساتویں مصرعے کے طور پر ہوتی ہے جبکہ دوسرا مصرع آٹھویں مصرعے کے طور پر دہرایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس محدود پیمانے اور اس میں ان پابندیوں کے ساتھ کامیابی کے ساتھ نظم کہنا آسان نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں یہ صنف مقبول نہ ہوسکی۔ اردو شاعری کی تاریخ میں اس کا نام چند شعرا، جیسے نریش کمار شاد، فرحت کیفی اور رؤف خیر کی بدولت زندہ رہے گا۔

اس مختصر مضمون میں اردو نظم میں مغربی اصناف اور ہیئتوں کا اجمالاً ایک سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے، جو ایک طرح سے میری کتابوں 'اردو میں نظمِ معرّا اور آزاد نظم' اور 'اردو شاعری میں سانٹ' کے ماحصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مختصر مضمون کی تشنگی کے ازالے اور مفصل مطالعے کے لیے ان کتابوں نیز 'اردو سانٹ: تعارف و انتخاب' کے مقدمے سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

■

Prof. Haneef Kaifi, A-47, Zakir Bagh, Okhla Road, New Delhi - 110025

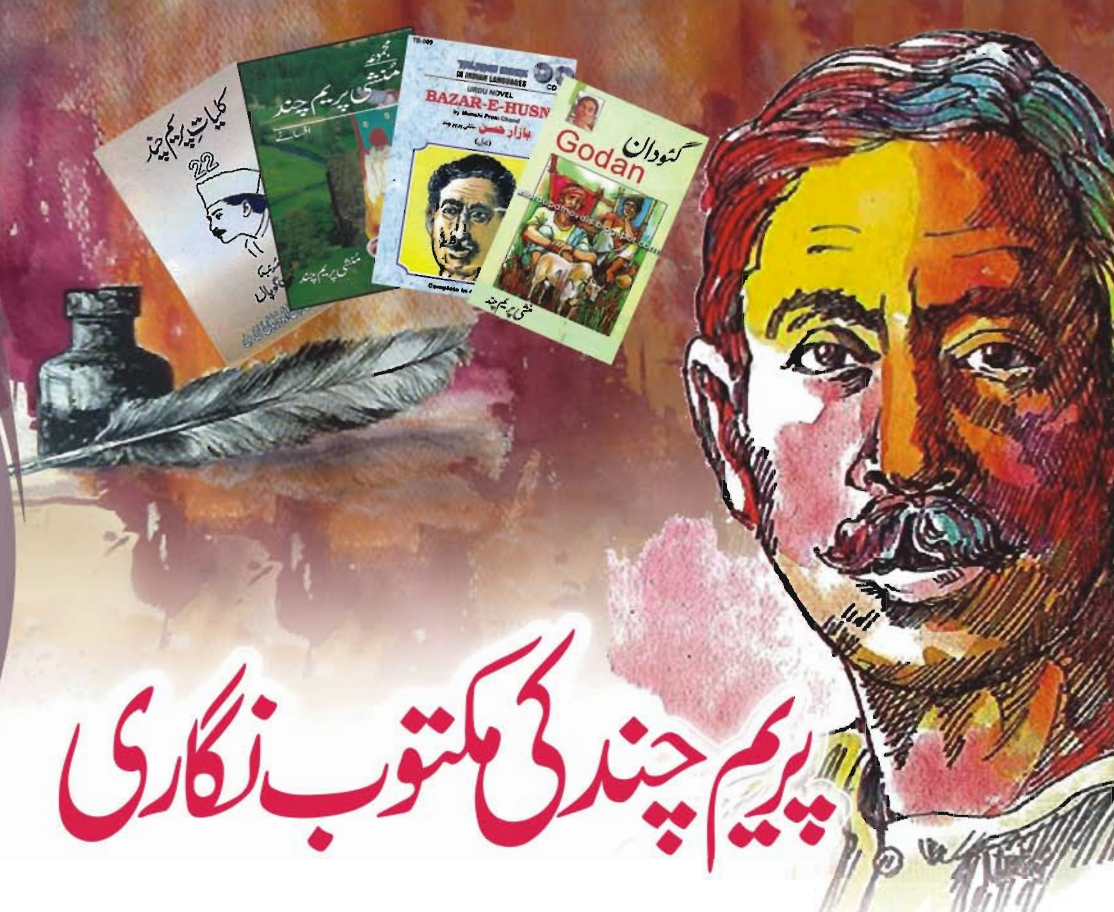

صغیر افراہیم

پریم چند کی مکتوب نگاری

اردو میں پریم چند کے اکثر خطوط شائع ہوتے رہے ہیں، ہندی میں تو کثرت سے۔ لیکن کلیاتِ پریم چند کے منظر عام پر آنے کے بعد وہ باقاعدہ مکتوب نگار اور مقالہ نگار کی حیثیت سے بھی سامنے آئے ہیں اور اُن کی یہ حیثیت بھی اہم ہے بشرطیکہ ان خطوط کا محنت سے تجزیہ کیا جائے۔ پریم چند کی ادبی اہمیت کے اِس نسبتاً کم معروف پہلو کو اُجاگر کرنے کے لیے ہم قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور کلیات کے مرتب مدن گوپال کے مرہونِ منت ہیں جن کی اِس علمی کاوش سے پریم چند کے معروضی مطالعے میں ایک نئی جہت پیدا ہو گی اور اُن کے تخلیقی ادب کو بھی سمجھنے میں یہ معاون ہوں گے۔

مضمون کا مرکزی حوالہ کلیاتِ پریم چند کی جلد نمبر 17 ہے۔ 645 صفحے پر مشتمل اِس حصے میں مدن گوپال نے پریم چند کے 690 خطوط یکجا کر دیے ہیں۔ پہلا خط 30 جنوری 1905 کا اور آخری خط ستمبر 1936 کا ہے۔ بس اس سے زیادہ نہ تو مقدمے میں ذکر ہے اور نہ ہی کوئی فہرست وغیرہ ترتیب دی گئی ہے۔ کتنے خط کس کے نام ہیں، کس زبان میں لکھے گئے ہیں، اُن کی نوعیت کیا ہے، شیرازہ بندی کس طرح کی جا سکتی ہے، یہ سارے کام قاری کے سپرد کر دیے گئے ہیں۔ شکوہ وشکایت اور تنقیص سے قطع نظر میں نے اس جانب توجہ دی تو اردو میں 465، ہندی میں 220 اور انگریزی میں لکھے گئے پانچ خط منظرِ عام پر آتے ہیں۔ شخصیات کے نام 660، ایڈیٹر یا ادارے کے نام 23 اور بغیر نام کے ۷ خط مذکورہ مجموعے میں ہیں۔ 58 لوگوں کے نام لکھے گئے خطوط میں محض دیانرائن نگم کے نام 350 مکاتیب ہیں۔ اس معلوماتی مجموعے کے تفصیلی مطالعے سے جو پہلی بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ پریم چند لفظ 'افسانہ' یا 'کہانی' کے بجائے اپنی کہانیوں کو عموماً قصہ قرار دیتے ہیں۔ ستمبر 1910 کا ایک خط جو دیانرائن نگم کے نام ہے ملاحظہ کیجیے:

''اب کی میں نے 'وکرمادت کا تیغہ' ایک قصہ لکھنا شروع کیا ہے۔ یہ قصہ ملا کر میرے پانچ قصوں کا مجموعہ نکالنے کا کافی مسالہ ہو جائے گا۔ اگن کنڈ، سیر، سارندھا، بے غرض محسن، اور وکرمادت کا تیغہ۔'' (ص، 12)

6 فروری 1913 کا ایک خط ملاحظہ ہو:

''پریم پچیسی اس پریس کا پہلا کام ہوگا۔ اپنے تئیں مبارک باد دیتا ہوں۔ بیس قصوں سے زائد ہو گئے ہیں۔ دو ابھی ہمدرد کے دفتر میں پڑے ہوئے ہیں۔ دو تین ماہ میں پچیس قصے ضرور ہو جائیں گے۔'' (ص، 21)

''اب پریم بتیسی حصہ اوّل کی کتابت شروع کرانے کا ارادہ ہے۔ اس میں ذیل کے قصص ہوں گے۔'' نیچے 16 افسانوں کے نام درج ہیں۔ (ص، 89)

زیرِ مطالعہ مجموعے کے شروع کے ایک سو ایک (101) خطوط میں کہیں بھی لفظ کہانی یا افسانہ استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ ہر جگہ قصہ لکھا گیا ہے لیکن خط نمبر ایک سو دو ((102 میں پہلی بار قصہ کے ساتھ ساتھ کہانی کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ یہ خط امتیاز علی تاج کے نام ہے:

''........ میں اپنی 32 کہانیوں کو دو حصوں میں نکالنا چاہتا ہوں........ اگر آپ کی معرفت کچھ انتظام ہو سکے تو فرمایئے گا۔ قصے سب زمانہ اور دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔'' (ص، 99)

عربی میں قصہ، فارسی میں فسانہ، ہندی میں کہانی اور اردو میں افسانہ لغوی اعتبار سے بڑی حد تک ہم معنی اور ایک دوسرے کے متبادل الفاظ ہیں لیکن اردو ادب میں یہ سب اصطلاح کے طور پر مستعمل ہیں اور اس معنی میں ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔ کسی وقوعے کا ایسا دلچسپ بیان کہ قاری یا سامع پوری دل جمعی سے پڑھ یا سُن سکے، سب میں مشترک ہے۔ اسی لیے یہ سب اپنے معنی کے لحاظ سے بظاہر ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کے مفہوم میں فرق ہے اور جسے 1857 کے بعد باقاعدہ تسلیم کیا گیا ہے۔ پریم چند قصہ اور کہانی/افسانہ کے باہمی فرق سے بخوبی واقف ہیں اور اس کا اظہار وہ اپنے پہلے افسانوی مجموعہ 'سوزِ وطن' کے دیباچے میں اشارتاً کرتے بھی ہیں:

''ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے............ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے کہ جب قوم کے نئے اور پُرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی، اور اصلاحِ تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاح اور تجدید ہی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیالات نے بلوغت کے زینہ پر ایک اور قدم آگے بڑھایا ہے اور حب الوطنی کے جذبات لوگوں پر سر اُبھارنے

لگے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اسی اثر کا آغاز ہیں۔''

قصہ کہانی کے فرق کی وضاحت وہ اپنے مضامین مثلاً میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں، مختصر افسانہ، مختصر افسانے کا فن، وغیرہ میں بالتفصیل کرتے ہیں، تو پھر وہ خط میں قصہ کی اصطلاح ہی کیوں استعمال کرتے ہیں، یہ فکشن تنقید میں ایک اہم سوال ثابت ہوسکتا ہے۔

(ii)

پریم چند نے درجنوں کتابوں پر تبصرے کیے، ریویو لکھے۔ اُن کی بھی خواہش تھی کہ اُن کی کتابوں پر بھی تبصرے ہوں۔ دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں:

''بازارِ حسن پڑھیے گا۔ میں 'زمانہ' میں ریویو کا منتظر ہوں۔ میرا نیا ناول بھی شائع ہوگیا ہے۔ بڑے اچھے ریویو ہو رہے ہیں۔'' (ص،207)

20 ستمبر 1929 کو کیشو رام سبھر وال کو لکھتے ہیں:

''........ میں نے حال ہی میں دو مختصر ناول 'نرملا' اور 'پرتگیا' کے نام سے لکھے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ادبی شاہکار ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ ان کے ذریعہ صرف سماجی برائیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ کیا آپ انھیں پڑھنا پسند کریں گے؟ مطلع فرمائیے گا۔'' (ص،341)

شری رام شرما کو لکھتے ہیں:

''اگر 'وشال بھارت' میں 'غبن' پر تبصرہ ہو رہا ہے تو آپ اپنا تبصرہ 'مادھوری' کو بھیج دیجیے۔ وہ بخوشی اسے شائع کریں گے۔ اس دفعہ مجھے مایوس نہ کیجیے۔'' (ص،386)

ایک اور خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''میرے کسی ناول کا 'زمانہ' میں ریویو نہیں ہوا۔ حالانکہ پردۂ مجاز کو لے کر چھ ہو چکے اور ساتواں بھی عنقریب تیار ہے۔ نیرنگ خیال نے 'بازارِ حسن' کا ریویو کر دیا تھا اور کتابیں پڑی ہوئی ہیں۔ خیر اور کتابیں تو پرانی ہو گئیں۔ 'پردۂ مجاز' تو نئی چیز ہے اور اس کا ایک ایک لفظ میرا ہے۔'' (ص،416)

خط کا آخری جملہ 'اس کا ایک ایک لفظ میرا ہے' بہت بامعنی اور غور طلب ہے۔ تحقیقی کام کرنے والوں کو اس طرح کے جملوں سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ شیو پوجن سہائے سے وہ اپنائیت بھرا شکوہ کرتے ہیں:

'''رنگ بھومی' کی آلوچنا آپ نے اب تک نہ لکھی۔ اس کی مجھے آپ سے شکایت ہے۔ سوا اس کے اور کیا سمجھوں کہ آپ اسے اس یوگیہ نہیں سمجھتے۔ آشا ہے اب 'مادھوری' یا کسی انیہ پتریکا کے لیے اوشیہ لکھیں گے۔'' (ص،253)

دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں:

''........ میرا دوسرا ناول 'ناکام' عنقریب اختتام ہے۔ وہ پورا ہو جائے گا نوبت رائے کی طرف متوجہ ہوں اور قصے بھی لکھوں۔ ہندی میں آج کل بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ ناول بھی ہندی میں چھپے گا۔ اردو میں اِس کا حشر کیا ہوگا، معلوم نہیں۔ بازارِ حُسن البتہ چھپ جائے گا۔'' (ص،341)

20 دسمبر 1933 کو مانک لعل جوشی کے نام لکھے خط سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیقات پر مبصر کے اعتراضات سے پریم چند کو دکھ بھی ہوتا ہے اور وہ اس کے جواز بھی پیش کرتے ہیں مثلاً 'کرم بھومی' کے متعلق کشن سنگھ کے خیالات سے وہ متفق نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے پس منظر میں وہ جینندر کمار کو لکھتے ہیں:

''کرم بھومی تمھیں بہت بُری نہیں لگی۔ اس سے خوشی ہوئی۔ اِس کی کہیں آلو چنا کر دو۔'' (ص431)

انسانی کمزوری یا دبی دبی خواہشوں کی نشاندھی سے قطع نظر مکتوبات پریم چند کے موضوعاتی مطالعے میں سماجی، سیاسی، صحافتی، ادبی، نفسیاتی اور رسمی جیسے عنوانات کے تحت مکتوبات کی شیرازہ بندی کی جا سکتی ھے۔ 138 سماجی، 83 سیاسی، 110 صحافتی، 70 ادبی، 49 نفسیاتی اور 140 رسمی خطوط کے توسط سے انسانی نفسیات، خواھشات، جذبات، احساسات کے مختلف گوشوں تک بخوبی رسائی حاصل کی جاسکتی ھے اور پھر مکتوب نگار کی جو شبیہ اُبھرتی ھے وہ مکمل طور پر ایک انسان کی، ایک ادیب کی، ایک فنکار کی ھوتی ھے جواَن گنت حادثات سے گزرنے کے بعد نکھرتی ھے، سنورتی ھے۔

ایک اور خط پیش خدمت ہے۔ یہ بھی جینندر کمار کے نام ہے:

''آج 'گودان' بھیج رہا ہوں۔ پڑھنا اور اچھا لگے تو کہیں 'ارجن' یا 'وشال بھارت' یا 'ہنس' میں آلو چنا کرنا۔ اچھا نہ لگے تو مجھے لکھ دینا۔ آلو چنا مت لکھنا۔'' (ص،637)

انسانی کمزوری یا دبی دبی خواہشوں کی نشاندہی سے قطع نظر مکتوبات پریم چند کے موضوعاتی مطالعے میں سماجی، سیاسی، صحافتی، ادبی، نفسیاتی اور رسمی جیسے عنوانات کے تحت مکتوبات کی شیرازہ بندی کی جا سکتی ہے۔ 138 سماجی، 83 سیاسی، 110 صحافتی، 70 ادبی، 49 نفسیاتی اور 140 رسمی خطوط کے توسط سے انسانی نفسیات، خواہشات، جذبات، احساسات کے مختلف گوشوں تک بخوبی رسائی حاصل کی جا سکتی ہے اور پھر مکتوب نگار کی جو شبیہ اُبھرتی ہے وہ مکمل طور پر ایک انسان کی، ایک ادیب کی، ایک فنکار کی ہوتی ہے جو اَن گنت حادثات سے گزرنے کے بعد نکھرتی ہے، سنورتی ہے۔ شخصیت کی اس تخلیقی جہت کی تشکیل بڑی دشوار، پُر پیچ اور پُرخار ہوتی ہے۔ ضرورتیں اُسے کمزور بناتی ہیں مگر فولادی عزائم ثابت قدمی کا ثبوت دیتے ہیں اور اس کی تشکیل میں معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ خطوط میں چھوٹی چھوٹی ضرورتیں، دبی دبی، سہمی ہوئی خواہش بھی جھانکتی نظر آتی ہے مثلاً وہ دیانرائن نگم کو لکھتے ہیں:

''مئی کے مہینے میں، میں نے 'آزاد' کے لیے 17 کالم لکھے اور غالباً جون کے پہلے نمبر میں بھی چار کالم سے کم نہ ہوگا۔ کل 21 کالم ہوتے ہیں۔ اگر آپ حسابِ دوستاں کے طور پر مجھے ایک واچ عنایت کر سکیں تو 'آزاد' کی یادگار رہے گی۔ مگر وہ واچ نہیں جس کے تین روپے میں سولہ چیزیں ملتی ہیں۔ مضبوط گھڑی ہو تو زیادہ نہیں تو تین چار سال تک تو ساتھ دے۔'' (ص،41)

امتیاز علی تاج کے نام لکھے ایک خط میں وہ کہتے ہیں:

''رہا معاوضہ وہ قصہ پڑھ لینے پر آپ خود طے کر لیجیے گا۔ ہندی والوں نے مجھے چار سو روپے دیے ہیں۔ اردو سے مجھے اتنی امید نہیں مگر 21 سطری صفحہ کے 12 حساب سے بھی قبول کر لینے میں مجھے تامل نہ ہوگا۔'' (ص،103)

ایک اور خط ملاحظہ ہو:

''بازارِ حسن کے متعلق، آپ اسے اگر ہمیشہ کے لیے چاہتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ میں اردو پبلک سے واقف ہوں۔ یہاں ہمیشہ کے معنی ہیں، زیادہ سے زیادہ تین ایڈیشن اور وہ دس سالوں میں یا اس سے بھی زیادہ۔ اس لیے میں ایسی شرطیں ہرگز نہیں پیش کر سکتا جو نامعقول ہوں۔ میرے خیال میں پہلے ایڈیشن کے لیے آپ 20 فیصدی رکھیں اور بقیہ دو ایڈیشنوں کے لیے 10 فیصدی۔'' (ص،149)

9 جون 1936 کے ایک خط میں وہ اوشا دیوی کو مشورہ دیتے ہیں:

''نول کشور پریس والے تمھیں ایک روپیہ پرشٹ دیتے ہیں تو سویکار کر لو۔ اس کے ساتھ ساتھ دس پرتی شت رائلٹی بھی دے دیں تو اچھا۔ پستکوں کی بکری آج کل بہت کم ہے۔ لیکھک اکڑے تو کس بل پر۔'' (ص،635)

بات خوشامد یا اکڑ کی نہیں، اُجرت کے مطالبے یا معاوضے کی بھی نہیں، ضرورت کی ہے کہ ایک ادیب، فنکار کی اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے اُسے کبھی کبھی عام انسانوں جیسا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ شخصیت کا یہ رُخ قاری پر ادیب کے خطوط سے ہی ظاہر ہوسکتا ہے اسی لیے آج مکتوب کے مطالعے کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ خطوط کے ذریعے ہی کچھ چونکا دینے والے انکشافات

بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر 23 جون 1925 کو دیا نرائن نگم کو لکھا یہ خط کئی زاویوں سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے:

''بابو رگھوپتی سہائے کا یہ خط بھیجتا ہوں، انھوں نے مولانا عبدالحق کے پاس بھیجنے کے لیے میرے پاس بھیجا ہے۔ مجھے ممدوح کا پتہ نہیں معلوم ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں ایک اردو پروفیسر کی جگہ ہے۔ 250 روپے ماہوار، 25 سالانہ ترقی۔ رگھوپتی سہائے اس کے لیے کوشاں ہیں۔ مضمونِ خط سے معلوم ہوگا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ آپ برائے کرم اسی ڈاک سے اس خط کو منشی عبدالحق کی خدمت میں بھیج دیں۔ میں نے رگھوپتی سہائے سے دریافت بھی کیا تھا تو اُن سے معلوم ہوا کہ انھوں نے قریب قریب سب مرحلے طے کرلیے ہیں صرف معترضوں کی زبان بند کرنے کے لیے دو چار خاص مسلمان اصحاب کی سفارش درکار ہے۔'' (ص،60-259)

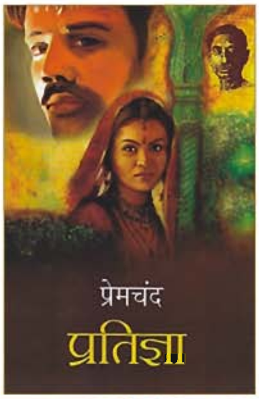

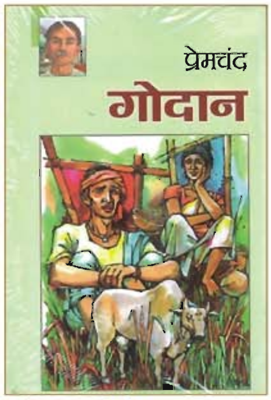

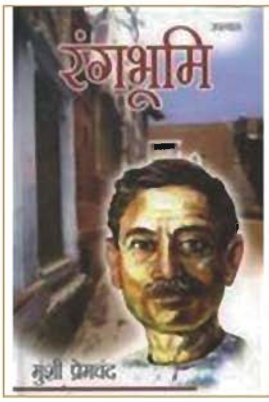

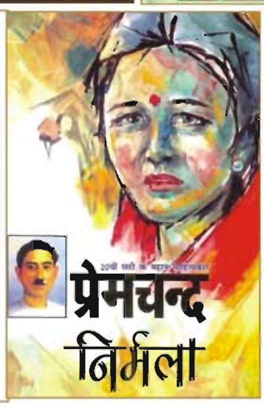

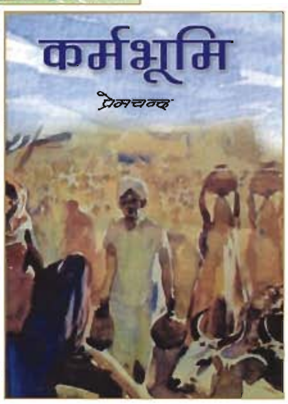

فراق کے تعلق سے اپنے ایک اور خط مورخہ 20 نومبر 1919 میں نگم صاحب کو لکھتے ہیں:

''بابو رگھوپتی سہائے آج کل سِول سروس کی فکر میں پریشان ہیں۔ ان کا نمبر انتخاب میں آٹھواں ہے۔ کبھی الہ آباد کبھی لکھنؤ کا چکر لگا رہے ہیں۔''(ص،131)

پریم چند نہایت فعال شخصیت کے مالک تھے۔ وہ اپنے احباب کو بھی سرگرم عمل دیکھنا چاہتے تھے۔ فراق گورکھپوری کے بارے میں دیا نرائن نگم کو لکھتے ہیں:

''بابو رگھوپتی سہائے عجیب سُست آدمی ہے۔ 'تعشق' پر ایک مضمون لکھا، وہ انگریزی میں۔ میر کا آدھا لکھ کر چھوڑا ہے۔ رویندر ناتھ کا مضمون Message of the Forest جولائی کے ماڈرن رویو میں ہے۔ شاید اسے ترجمہ کریں۔'' (ص،122)

(iii)

پریم چند کو گاؤں گاؤں مدرسوں کے معائینہ کرنے کے لیے لگاتار دورے کرنے پڑتے جس سے روزانہ کے معمولات میں فرق آیا اور اُن کا نظام ہضم خراب رہنے لگا۔ مسلسل بیماری سے عاجز آکر انھوں نے تبادلے کی درخواست دی۔ 'سوزِ وطن' کی اشاعت کے بعد وہ سامراجی حکومت کی نگاہوں میں کھٹکنے لگے تھے۔ اُن کے تبادلے کی درخواست منظور کر لی گئی لیکن سوزِ وطن کا بدلہ اُن سے اس طرح لیا گیا کہ اُن کو ضلع بستی کے نیپال کی ترائی والے علاقے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں مرض نے اور تیزی پکڑ لی۔ مستقل پیچش کی شکایت پیدا ہوگئی۔ علاج کی غرض سے اپنے خسر کے پاس ایک ماہ کی رُخصت لے کر الہ آباد پہنچے۔ تعطیل کے خاتمے پر واپس آگئے لیکن مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ تنگ آکر انھوں نے نصف تنخواہ پر چھ ماہ کی چھٹی لی۔ کانپور اور لکھنؤ میں باقاعدگی سے علاج کرایا۔ کافی حد تک فائدہ ہوا۔ رُخصت ختم ہونے پر وہ اپنے فرائضِ منصبی پر واپس پہنچے تو پیچش کی شکایت پھر پیدا ہوگئی۔ مجبوراً انھوں نے درخواست دے کر بستی کے نارمل اسکول میں بطور اسسٹنٹ ماسٹر اپنے کو تبدیل کرالیا۔ تنخواہ کم ہوئی لیکن ایک جگہ پر قیام سے اُن کو آرام میسر ہوا۔ دیا نرائن نگم اس پوری سچویشن کو سمجھ چکے تھے۔ وہ پریم چند کی صحت کی خرابی، ذہنی انتشار اور سرکاری عتاب جو تبادلوں کی شکل میں ہورہا تھا، سے بچانے کے لیے انھیں صحافتی زندگی سے منسلک کرانا چاہتے تھے لیکن پریم چند اُن کی اس پیش کش کو ایک سرے سے ٹھکراتے ہوئے 22 مئی 1914 کے خط میں لکھتے ہیں:

''اردو کی ہوا آج کل بگڑی ہوئی ہے۔ اخبار نویسی بہت مشکل ہوگئی ہے۔ جتنے موجودہ رسالے ہیں اُن میں کسی کو فروغ نہیں ہے۔ سب کتے کی زندگی جیتے ہیں۔ ان حالات میں کیا حوصلہ ہو۔ ادھر 15 سال کی ملازمت۔ کچھ دن اور زندہ رہوں تو Invalid پنشن کا حقدار ہوجاؤں۔ میرے لیے یہی لائن سب سے اچھی ہے اور مجھے وہیں پڑا رہنے دیجیے۔ یہاں عافیت ہے اور میں گوشہ نشینی میں زیادہ قانع رہوں گا۔ اسی حالت میں کچھ تصنیف کا کام بھی کرسکتا ہوں۔ اخبار یا رسالہ لے کر میں تصنیف کا کام کچھ نہ کرسکوں گا۔'' (ص،40)

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ سات سال بعد وہ صحافتی زندگی سے وابستہ بھی ہوجاتے ہیں مگر اردو صحافت سے نہیں ہندی سے۔ وہ سہ ماہی ''مریادا'' کے مدیر کی حیثیت سے اپنی باضابطہ صحافتی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ اور پھر اگلے سال وارانسی میں سرسوتی پریس قائم کرتے ہیں۔ ماہنامہ 'مادھوری' کے جوائنٹ ایڈیٹر ہوتے ہیں اور کچھ عرصے بعد اپنا ذاتی رسالہ 'ہنس' اور پھر اخبار 'جاگرن' نکالتے ہیں۔ غرض صحافتی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے وہ تمام ادبی کارنامے بھی انجام دیے جو اُن کی شہرت اور مقبولیت کا باعث بنے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ پریم چند نے اردو صحافت قبول کیوں نہیں کی۔ اپنے عزیز ترین دوست کے مشورے کو کیوں ٹھکرا دیا۔ کیا اس وجہ سے کہ اُس وقت اردو کی ہوا بگڑی ہوئی تھی۔ یا اردو کے تمام رسالے بقول اُن کے کتے کی زندگی جی رہے تھے جب کہ بعد کے کئی خطوط میں پریم چند نے اردو صحافت کی اہمیت اور اُس کے فروغ کا اعتراف کیا ہے۔ 25 اگست 1919 کے خط میں امتیاز علی تاج کو لکھتے ہیں:

''اردو میں رسالے اور اخبارات تو بہت نکلتے ہیں شاید ضرورت سے زیادہ۔ اس لیے کہ مسلمان ایک لٹریری قوم ہے اور ہر تعلیم یافتہ شخص اپنے تئیں مصنف ہونے کے قابل سمجھتا ہے۔''(ص،119)

اپنے انتقال سے چند ماہ قبل 18 مارچ 1936 کو وہ بنارسی داس چترویدی کو لکھتے ہیں:

''مجھے یہ جان کر دُکھ ہوا کہ 'وشال بھارت' اب بھی گھاٹے میں جارہا ہے۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ پہلا ہندی اخبار، جسے ہندی کا سب سے اعلیٰ ماہنامہ تسلیم کیا جاتا ہے، اُس کی یہ

حالت ہو۔ کیا یہی ہماری ترقی یافتہ ذہنیت کا معیار ہے؟ اردو کے اخبار بازی لیے جارہے ہیں۔ پچاس سے بھی زیادہ بلند پایہ اردو ماہنامے نکلتے ہیں۔ اوران میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو دو روپیہ یا ڈھائی روپے قیمت کا، پانچ سو صفحوں کا سالنامہ نہ نکالتا ہو۔ یقیناً ان کا ادبی ذوق بہتر ہے۔ وہ حوصلہ افزائی کرنا جانتے ہیں۔'' (ص،21-620)

کئی جملے ذہن میں کھٹکتے ہیں جیسے ''مسلمان ایک لٹریری قوم ہے''، ''اردو کے اخبار بازی لیے جارہے ہیں'' یا یہ کہ 'یقیناً اُن کا ادبی ذوق بہتر ہے۔ وہ حوصلہ افزائی کرنا جانتے ہیں۔'' جیسے کلمات ممکن ہے عام قاری کو غلط فہمی میں مبتلا کر سکتے ہوں لیکن خاص قاری یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ پریم چند اردو زبان وادب جس میں صحافت بھی شامل ہے، کے فروغ سے خوش نہ ہوں؟ لیکن اِس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ کچھ متعصب ذہن اِن خطوط کی روشنی میں پریم چند کے ادبی رویوں اور نظریوں کے ڈھکے چھپے گوشوں کی غلط تعبیریں پیش کریں گے اور ممکن ہے کہ اس جانب بھی اشارہ کریں کہ لاشعوری طور پر ان کے ذہن میں یہ بات اُبھرنے لگی تھی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ ذہن میں کھٹکنے والا یہ سوال محض جملۂ معترضہ نہیں ہے بلکہ مطالعۂ پریم چند کا بھی تشنہ تعبیر پہلو ہے جس سے گُریز کرتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

اِس وقت مکتوبات کا ایک ایسا مجموعہ پیشِ نظر ہے جو بیک وقت حالِ دل بھی بیان کرتا ہے، اپنے عہد سے روشناس بھی کراتا ہے، اور بغیر کسی قافیہ پیمائی کے علم کے اظہار کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جس کا اپنا طرز ہوتا ہے وہ صاحب طرز کہلاتا ہے۔ اور صاحب طرز کسی کی پیروی نہیں کرتا بلکہ الگ راہ اختیار کرتا ہے۔ پریم چند نے بھی غالب کی طرح مکتوب نگاری کا ایک منفرد اور غیر رسمی پیرایۂ اسلوب اختیار کیا۔ عبارت کو تصنع اور تکلف سے پوری طرح پاک کیا۔ سادگی اور روانی کو اہمیت دی۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

''بھائی جان تسلیم!

کیا ایشور کے ساتھ احباب بھی مجھ سے روٹھ جائیں گے۔'' (ص،155)

''مجھے اس تقریبِ سعید میں شریک نہ ہونے کا اور لطف صحبت کھودینے کا افسوس ہے۔'' (ص،552)

''برادرم،

بعد دعا۔ کل ایک کارڈ لکھ چکا ہوں۔ آج پھر پریس کے متعلق تم سے کچھ مشورہ کرنا ہے۔'' (ص،171)

''برادرم، تسلیم!

آپ کی طولانی خموشی نے غضب کیا۔ 'کہکشاں' بھی اب تک نہیں آیا۔ کیا معاملہ ہے۔'' (ص،174)

''بھائی جان،

تصویر ملی۔ بہت ممنون ہوں۔ اس نے ملاقات کی آرزو دو چند کر دی۔ آپ کی میرے ذہن میں جو تصویر تھی وہ کچھ اور ہی تھی۔ میں اگر مصور ہوتا تو 'شعر' اور 'ادب' کی غالباً یہی تصویر بناتا۔'' (ص،188)

مذکورۂ بالا خطوط دیانرائن نگم، مہتاب رائے اور امتیاز علی تاج کے نام ہیں۔ درج ذیل خط کیشو رام سبھر وال کو لکھا گیا ہے جو ٹوکیو میں مقیم تھے۔ راس بہاری بوس کی انقلابی تحریک میں شامل تھے اور رابندر ناتھ ٹیگور کے سکریٹری بھی رہے تھے۔ انھوں نے پریم چند کے کئی افسانوں کے جاپانی میں ترجمہ کر کے شائع کرائے تھے۔ پریم چند انھیں لکھتے ہیں:

پریم چند اردو زبان و ادب جس میں صحافت بھی شامل ھے ، کے فروغ سے خوش نہ ھوں؟ لیکن اِس سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ کچھ متعصب ذھن اِن خطوط کی روشنی میں پریم چند کے ادبی رویوں اور نظریوں کے ڈھکے چھپے گوشوں کی غلط تعبیریں پیش کریں گے اور ممکن ھے کہ اس جانب بھی اشارہ کریں کہ لاشعوری طور پر ان کے ذھن میں یہ بات اُبھرنے لگی تھی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ھے۔ ذھن میں کھٹکنے والا یہ سوال محض جملۂ معترضہ نہیں ھے بلکہ مطالعۂ پریم چند کا بھی تشنہ تعبیر پہلو ھے جس سے گُریز کرتے ھوئے اصل موضوع کی طرف آتا ھوں۔

''عزیز من کیشو رام جی،

.... ہندوستان میں ادبی زندگی، بہت حوصلہ شکن ہے۔ پبلک کی طرف سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ آپ اپنا دل نکال کر رکھ دیجیے لیکن عوام پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میری کسی تصنیف کا شاید ہی تیسرا ایڈیشن چھپا ہو۔ کچھ کتابوں کے تو پہلے ایڈیشن ہی ابھی ختم نہیں ہوئے۔ ہمارے کسان غریب اور اَن پڑھ ہیں۔ پڑھا لکھا اور روشن خیال طبقہ یوروپی ادب پر جان دیتا ہے، گھٹیا کتابیں ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں۔ لیکن میری کتابوں کا حال یہ ہے کہ اُن کی تعریف تو کی جاتی ہے لیکن ان کے لیے خریدار مشکل ہی سے ملتا ہے۔'' (ص،325)

(iv)

زیر مطالعہ مجموعے میں شامل تقریباً تمام خطوط اپنے وقت کے نامور ادیبوں کے نام ہیں جیسے اردو میں دیانرائن نگم، امتیاز علی تاج، مولوی عبدالحق، حُسام الدین غوری، اُپندر ناتھ اشک، محی الدین قادری زور، سجاد ظہیر، منشی درگا سہائے سرور، اختر حسین رائے پوری اور ہندی میں جینندر کمار، بنارسی داس چترویدی، جے شنکر پرساد، سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا، بچن شرما اُگر، ونود شنکر ویاس، شیو پوجن سہائے، مہادیوی پرساد، آنند راؤ جوشی، اوشا دیوی، آچاریہ نریندر دیو وغیرہ۔ اسی لیے الفاظ، عبارت، پیش کردہ خیالات عام سطح سے قدرے بلند ہیں۔ خطوط کے تفصیلی مطالعے سے جو اہم نکات بنتے ہیں، وہ اس طرح ہیں:

1. پریم چند نہ صرف کثیر المطالعہ ادیب تھے بلکہ اپنے عہد کے بیشتر رُجحانات اور تقاضوں سے پوری طرح باخبر اور اُن سے ہم آہنگ بھی تھے۔
2. وہ حالاتِ حاضرہ پر دوٹوک گفتگو کے قائل تھے۔
3. نئی کتابوں پر رسمی طور پر نہیں بلکہ باقاعدگی سے رائے دیتے تھے اور یہ اُمید کرتے تھے کہ دوسرے ادیب بھی اُن کی تخلیقات پر اسی طرح کا تحریری اظہار کریں گے۔
4. ابتداءً اُن میں اپنے لیے ایک نیا راستہ تلاش کرنے کی شدید لگن تھی، ایسا راستہ جو محض اسلوب کا نہیں، نقطۂ نظر کا بھی ہو۔
5. وہ خط کا جواب فوری اور وضاحت سے دیتے تھے۔
6. ادبی سرگرمیوں میں پوری دل چسپی لیتے تھے اور اپنے مشوروں سے احباب کو نوازتے رہتے تھے۔
7. بیماری اور ذہنی اُلجھنوں میں گھِرے رہنے کے باوجود ہشاش بشاش رہنے کی کوشش کرتے تھے۔
8. 'ہنس' اور 'جاگرن' کی بقا اور فروغ کے لیے ممکن جتن کرتے رہتے تھے۔
9. عصرِ حاضر کے شعور اور تقاضوں کے تحت ذاتی تجربے کو ابلاغ مدعا کے لیے بنیادی ضرورت سمجھتے تھے۔
10. ہندوستانی زبان و ادب کو بین الاقوامی سطح پر دیکھنے کے خواہش مند تھے۔

اِن نکات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلیاتِ پریم چند جلد نمبر 17 میں شامل تمام خطوط کسی دیومالائی کردار کی نہیں بلکہ ایک عہد ساز شخصیت کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ پُر وقار شخصیت جس نے اپنا زورِ قلم غلام دیس کو آزاد کرانے، تعلیم کی اہمیت کو اُجاگر کرنے، اردو، ہندی کو قریب لانے، بھائی چارے کو فروغ دینے، جاگیردارانہ نظام اور اُس کے اندر پنپنے والی ذہنیت کا پردہ فاش کرنے، استحصال پسندوں کو بے نقاب کرنے، ذات پات کی تفریق کا انسداد کرنے، قدیم و فرسودہ رسوم کو مٹانے اور عورتوں کو اُن کا سماجی مرتبہ دلانے پر صرف کیا ہے۔

Prof. Saghir Afraheim, Editor 'Tehzeeb-ul- Akhlaq', Dept. of Urdu, Aligarh Muslim University , Aligarh -

رضوانہ ارم

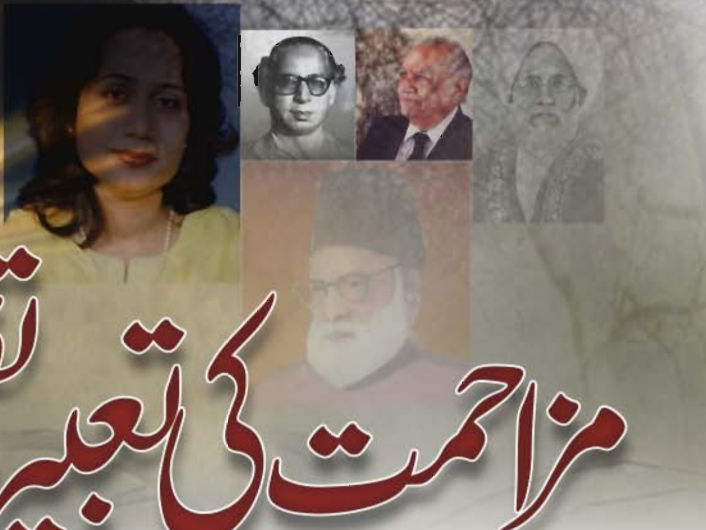

مزاحمت کی تعبیر و تفہیم

کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تو نے؟
ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تو نے؟
وہ یہ کہتے ہیں تو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے
وہ یہ کہتے ہیں ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے!
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟
ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟

— فیض احمد فیض

جبر و استحصال کی یہی وہ مزاحمتی آواز ہے جو انتہاؤں کا اعلان نامہ ہے اور ایک فرد کی مظلومیت کی چیخ بھی ہے، جس میں بے بسی، جبریت اور مظلومیت آلود گھٹی گھٹی سسکیاں موجود ہیں، یہ فریاد جو احتجاج کا بدل ہے کرب مسلسل اور اذیت ناکیوں سے ضبط کی رگیں تڑخنے لگی ہیں اور بے اختیار غالب بھی یہ کہہ اٹھے کہ:

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

حالات کا یہ جبر، برسرِ اقتدار طبقے کے ظلم وستم، گردشِ وقت کی سنگ ساری کہ سارا بدن لہولہان ہو مگر لب پہ حرف شکایت نہ آنے پائے۔ روح مضمحل، انا زخمی، غیرت وحمیت تار تار مگر ناخوشگوار ماحول میں زندگی کرنے کی زبردستی انسان کو بے اختیار جھنجھوڑ دیتی ہے:

لکھا نہ ہم نے قصیدہ مزاج دوراں کا
ہمارے ہاتھ اسی بات پہ قلم ہوں گے   (ارم)

اور صدیق مجیبی کے لہجے میں:

جو تو کہے تو جھکا دوں میں اپنا سر لیکن
مجھے تو راس نہ آیا تجھے خدا کہنا

ویسے بھی انقلاب مزاحمت یا احتجاج انگریزی مفکر کے مطابق:

"Revolutions are not made, they come."

(انقلابات عرقِ گلاب سے نہیں بلکہ خون دل سے رقم ہوتے ہیں۔)

”انقلاب کے اس خونی تصور میں رومانیت جھلکتی ہے، یہ ایک طرح کی ادبی دہشت گردی، یہ ذہنی اور جذباتی بلوہ ہے۔“ — سجاد ظہیر

ہاں مگر یہی وہ وجوہات ہیں جن سے سرکشی سر اٹھاتی ہے اور مظلومیت کو جینے کی کھلی فضاؤں میں آزادی کی سانس لینے کی توفیق عطا ہوتی ہے، ادب وسماج میں نشاۃ الثانیہ کی صورت زندگی کی نئی رمق، نئی جوت اور نئی روشنی پھوٹتی ہے جو سماج اور ادب کی ازسرِ نو تشکیل کی ضامن ہوتی ہے کیونکہ:

Revolutions are not made, they com."

(انقلابات 'قصداً' رونما نہیں ہوتے بلکہ از خود برپا ہوتے ہیں۔)

اور میری خود کی رائے یہ ہے کہ:

جہاں کہیں استحصال ہے وہیں انقلاب ہے۔

کیونکہ سماج میں جب تک غیر جانب داری، مساوات، آزادی اور بنیادی حقوق کی ادائیگی رائج نہیں اس وقت تک تصادم کشمکش، جدوجہد اور انحراف کی آوازیں بلند ہوتی رہیں گی۔

Thomas Jefferson کے لفظوں میں:

"Equal rights for all, special privileges for none."

(سب کے لیے یکساں حقوق، خاص الخاص مراعات کسی کے لیے نہیں۔)

شعر و ادب کی روایتیں یا تاریخیں حیاتِ انسانی کے واقعات و حالات اور سماجی مد و جزر کو نظر انداز کر کے ارتقائی مرحلوں سے نہیں گزر سکتیں، کیونکہ سرسری اس جہاں سے گزرنا ادب اور ادیب کا شیوہ نہیں، حساس ذہن و دل اس شعر کے مصداق ہیں کہ:

بس یہ ہوا کہ اس نے تکلف سے بات کی
اور ہم نے روتے روتے دوپٹے بھگو لیے

(پروین شاکر)

نازک ہے بہت دوست محبت کی آبرو
رسوا نہ ہو نگاہ کا اندازِ گفتگو

کیونکہ میر کے لفظوں میں:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

مزاحمت، احتجاج، انحراف یا بغاوت کی ڈگر بڑی پرخار ہوتی ہے۔ یہ کانٹوں اور شعلوں پہ ننگے پاؤں چلنے کے مترادف ہے، شعری اور ادبی روایتوں کا انحصار حیات آفریں بصیرتوں پر ہوتا ہے جن پر عمل پیرا ہونا لازمی ہے۔ حرکت و عمل پر ہی زندگی اور ادب کا دار و مدار ہے جو تلخیوں، حق تلفیوں اور محرومیوں سے دوچار ہے۔ معاشرتی سرگرمیاں کبھی حد سے تجاوز کر جانے والی اذیتوں کو جنم دیتیں ہیں تو کبھی زک پہنچانے والی قوتوں سے اس قدر ہراساں ہو جاتی ہیں کہ برہمی، تلخی اور احتجاج کا مزاج میں پیدا ہو جانا عین فطری معلوم ہوتا ہے۔

اجتناب وانحراف کا یہی رجحان، برہمی و بیزاری کی یہی کیفیت طوفان شوریدگی کا باعث بنتی ہے، اور احتجاجی شعور کو جنم دیتی ہے۔ بے اطمینانی، ناآسودگی، تشنگی احتجاجی شعور کا محرک ہیں۔ ادبا و شعرا اپنے بخت اور اپنے ضمیر کے قیدی ہوتے ہیں اور ہر وہ انسان جو اخلاقی ضابطوں سے بندھا ہے، وہ صدیقی مجیبی کے اس شعر کا مصداق نظر آتا ہے کہ:

اپنا سر کاٹ کر نیزے پہ اٹھائے رکھا
صرف یہ ضد کہ مرا سر ہے تو اونچا ہوگا

احتجاجی ادب کے موضوعاتی دائرے کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق رقمطراز ہیں:

”انسان زندگی کی خاطر اپنے اردگرد کے کائنات اور حوادث کے ساتھ دائمی کشمکش میں مبتلا ہے اور یہی وہ کشمکش ہے جو انسان کو حوادث کون ومکان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے نجات دلاتی ہے۔ خواہ وہ حوادث کسی حملہ آور کے حملے کی شکل میں ہو یا ظالمانہ حکومت اور سماجی ظلم تشدد کی شکل میں ہو جن کا سامنا انسان کو ہر جگہ اور ہر وقت کرنا پڑتا ہے... لہٰذا عام خیال ہے کہ ادب مقاومت یا احتجاجی ادب صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں جنگ و جدال، قتل و قتال اور خون خرابہ کی کہانیاں اور داستانیں ہیں۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ ہر وہ مقالہ، کہانی، ناول، ڈرامہ، تحریر و تقریر اور قول و فعل ادب و مقاومت میں شامل ہے

شامل ہے جو خارجی اور داخلی سیاسی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حملہ یا تسلط کے خلاف ہو۔

(عصری ادب، دہلی، اپریل تا جولائی، 1982، ص97)

یہ سچ ہے کہ ادب مقاومت یا احتجاجی ادب کی تخلیق سیاسی، سماجی، اخلاقی، اور تہذیبی روایات کے غیر مستحسن جابرانہ تسلط کے ردِ عمل میں ہوتی ہے۔ Newton's Law of motion کے مطابق ہر عمل کا برابر اور برعکس ردِ عمل ہوتا ہے:

Every action has an equal and opposite reaction."

(ہر عمل کا برابر اور الٹا ردِ عمل ہوتا ہے۔)

لیکن ایسی ادبی اور شعری تخلیقات میں شعوری احتجاج اپنی غیر مطمئن اور نا آسودہ کیفیتوں کے اظہار ہی پر اکتفا کرتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ اس کے اظہار کے اسلوب میں کسی تازہ تر امکان کی جستجو بھی نہاں ہو۔ شعر و ادب کی آفاقیت اور تفلسف کے اسی عنصر کی وجہ سے ادب زندہ و پائندہ ہے اور تمام علوم و فنون پر اسے فوقیت حاصل ہے۔ ادیب و شاعر کی حساس ذہانت اور دانشورانہ بصیرت، انسانی دکھ درد کو چپ چاپ گوارا تو کرتی ہے مگر اپنے ردِ عمل کے اظہار پر پابندی قبول نہیں کرتی اسی لیے شعری و نثری تخلیقات کی معنویت، جاذبیت اور جامعیت میں آفاقی مشاہدے کا تازہ اور تہہ دار رنگ نکھرتا ہے۔ ادب کے متعلق ممتاز حسین کی یہ رائے قابلِ قدر ہے:

''نہ تو میں کہتا ہوں کہ ادب تمام تر شخصیت کا اظہار ہے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ ادب تمام تر شخصیت سے گریز ہے بلکہ یہ کہتا ہوں کہ ادب میں شخصیت، تاریخ اور یونیورسلیٹی ان تینوں ہی کا اظہار ایک وحدت میں ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک صنف شاعری کا تعلق ہے میں یہ ماننے کے لیے تیار ہوں کہ اس میں شخصیت کا عنصر بہ نسبت دوسرے اصناف فن سے زیادہ ہوتا ہے۔'' (ادب اور شعور)

ظاہر ہے ان حالات میں ادبا و شعرا کی شخصیت، سماجی ابتلاؤں، معاشرتی کشمکشوں اور اخلاقی اوامر و نواہی سے منقطع نہیں ہو سکتی۔ تلخ تضاداتِ عصر، اس کے جذبہ و احساس کی دنیا میں کھلبلی برپا کرنے لگتے ہیں اور اس کے ضمیر کی نا آسودگی اس کے سامنے سوالات کے ڈھیر لگا دیتی ہے جہاں شعور احتجاجی جوش بداماں رہتا ہے۔ اس کی بے اطمینانی، عصری زندگی کی تلخیوں اور سختیوں سے نجات حاصل کرنے کی متمنی اور متجسس رہتی ہیں، یہی کیفیت اس کے احتجاجی لہجے کو تیکھا، ترش اور زہریلا بنا دیتی ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

''احتجاج پوری طرح یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتا ہے اس کی تکمیل کے لیے کون سے ذرائع اور وسائل اختیار کیے جانے چاہئیں، البتہ وہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس سے نا آسودہ ہے اور اس نا آسودگی کے باعث وہ عام حالات کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کو تیار نہیں ہے، کبھی ان سے ٹکراتا ہے، یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم سماجی ناانصافی کے نظام سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اپنے تخیل کی قلمرو میں دیانت کی خیالی زندگی گزارتا ہے اور اپنی شخصیت کی نجی کائنات میں محو ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے، احتجاج تلاش کا پیش خیمہ ہے۔ بہتر نظام کی تلاش احتجاج کے لگائے ہوئے سوالیہ نشانوں ہی سے فکر سفر کا حوصلہ پاتی ہے۔'' (عصری ادب، دہلی مئی تا اگست 1977، ص28 تا 29)

شعر و ادب کی آفاقیت اور تفلسف کے اسی عنصر کی وجہ سے ادب زندہ و پائندہ ہے اور تمام علوم و فنون پر اسے فوقیت حاصل ہے۔ ادیب و شاعر کی حساس ذہانت اور دانشورانہ بصیرت، انسانی دکھ درد کو چپ چاپ گوارا تو کرتی ہے مگر اپنے ردعمل کے اظہار پر پابندی قبول نہیں کرتی اسی لیے شعری و نثری تخلیقات کی معنویت، جاذبیت اور جامعیت میں آفاقی مشاہدے کا تازہ اور تہہ دار رنگ نکھرتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ احتجاجی شعور یا مزاحمتی رویہ کے سامنے کوئی واضح اور متعین منزل اور پیام نہیں ہوتا مگر سماج کو، نظام کو اقتدار کو اور فرسودہ استحصال پر مبنی معاشرے کو بدل دینے کی دھن ضرور ہوتی ہے، یہ اس وقت پنپتا ہے یا سر اٹھاتا ہے جب فرد و سماج کے فرسودہ قوانین و ضوابط میں اسے گھٹن ہونے لگتی ہے اور اس نظام اقتدار سے وہ اپنی نا آسودگی اور بے اطمینانی کی وجہ سے ٹکراتا ہے۔ نظام معاشرت اور اس کی پابندیوں سے بیزار ہو کر، نالاں ہو کر وہ اس سے گریز برتتا ہے، وہ عصری زندگی کی بے چینیوں اور تلخیوں میں سکون و راحت کا جویا ہوتا ہے، شاعر و ادیب کا یہ شخصی اور ذاتی ردِ عمل گہری معاشرتی اور تہذیبی بصیرت کا حاصل ہوتا۔ اس لیے ان کی تخلیقات میں ہمہ گیر جہت انداز نظر کار فرما ہوتا ہے۔

بہر حال خونِ دل سے لکھی گئی ہر وہ تحریر مزاحمت کے مترادف ہے جس میں حالات کے جبر کا بیان ہے۔ یوں تو یہ سب جانتے ہیں کہ:

Life is not a bed of roses.

(زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے)

لیکن زندگی، نصیب العین، ہر شادمانی اگر کانٹوں سے عبارت ہو تو میرے خیال میں مزاحمت کی تعریف کچھ یوں ہو سکتی ہے:

ہاں اس کے تعاقب سے انکار ہے مجھے
وہ شخص کسی کو بھی ملا ہے نہ ملے گا (پروین شاکر)

ان کے لیے تو روا ہے وہ سب کچھ
ہمارے لیے جو بالکل غلط ہے (ارم)

تاریک ہے وہ جھوٹ کی مانند مگر میں
ایک سچ ہوں تو جو روزِ روشن کی طرح ہوں (ارم)

بہر کیف! انگریزی میں مزاحمت کو Resistance کہتے ہیں۔ جس سے مراد وہ طرزِ عمل ہے جو کسی ناموافق صورت حال کے خلاف اظہار سرکشی یا اُس حرکت و عمل کو ناکارہ بنانے کے درپے ہو۔ انگریزی لغت Collinsco build میں Resistence کے معنی طاقت سے روکنا، مخالفت کرنا یا fonzksg djuk ہے۔ اس طرح Resistence کی تعریف ان جملوں میں کی گئی ہے:

The act of refusing to accept something such as a change and trying to prevent it from happening.

(مزاحمت-ناقابل قبول تبدیلی سے پرہیز یا اس کے خلاف ایک انحرافی عمل ہے۔)

جس کا ذکر میں نے اپنے Proposal میں بھی کیا ہے، Oxfor English Dictionary کے مطابق Rebel کے لغوی معنی باغی کے ہیں اور انگریزی ڈکشنری کے مطابق.....اختلاف کرنا (Disagree) کچلے ہوئے (Down cost)، خلاف ورزی اور (Voilation) کے ہیں، اور انگریزی ڈکشنری کے مطابق:

1. "Fight against an established government or ruler."

(برسرِ اقتدار حکومت کے خلاف بغاوت)

2. Oppose authority or accepted behavior."

(حکمراں کی مخالفت یا ناقابلِ قبول رویہ)

"A person who rebels is called rebellion."

3. Saifee, English, Urdu, Hindi Dictionary

کے مطابق (ری۔بیل کا مفہوم:

Person or thing that resist authority or control

(فرد یا اشیا جو اقتدار مخالف ہو یا اُسے کنٹرول کرے۔)

مزاحمت لفظ مزاحم کا بدل ہے جس کے لغوی معنی روک ممانعت کے ہیں۔ To resist مزاحمت (مونث) روک، مخالفت کرنا، نافرمانی اور انھیں مفہوم میں استعمال ہونے والا لفظ

انقلاب ہے جس کا انگریزی بدل Revolt ہے۔ To revolt کا مطلب ہے انقلاب برپا کرنے والا (ری والٹ) کے معنی ہیں کسی چیز سے گھِن کرنا۔ یا "Do violence, dislike" ہندی میں विद्रोह करना, विप्लव करना کے ہیں۔ یعنی اس کی وضاحت کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے کہ:

1. With stand the action or effect of.

(کسی بھی عمل پہ ڈٹے رہنا یا لا پرواہی برتنا)

2. Try to prevent or oppose.

(پرہیز کرنا یا مخالفت کرنا)

3. Refrain from something tempting.

(نفس پہ قابو رکھنا)

اسی طرح سے Resistence کی تشریح کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے:

1. The act of resisting or the ability to resist.

(مزاحمتی عمل یا مزاحمت کرنے کی صلاحیت)

2. A secret organisation that fights against an accupying enemy.

(ایک خفیہ تنظیم جو قابض دشمن کے خلاف جنگ کرے)

3. The degree to which a meterial or device oppose the passage of an electric current.

(وہ طاقت جو کسی برقی بہاؤ کو روکنے کے لیے لگائی جائے)

"A statement or action expressing disapproval or objection."

(معترض عمل/انحرافی بیان)

Verb: I express an objection.

State, Strongly... means protestation

(سختی سے منع کرنا یا احتجاج کرنا)

Protest: Complaint, Opposition

(مخالفت، شکایت، احتجاج)

ہندی میں "प्रतिवाद या, विरोध–पत्र" کہا جاتا ہے۔

احتجاج... اردو بہ معنی... اعتراض... حجت... انکار

ادب میں بعض اوقات انقلاب اور بغاوت جیسی اصطلاحوں کو بھی احتجاج یا مزاحمت کے ہم پلہ یا ہم وزن قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید ان اصطلاحات کی وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

"..... انقلاب، بغاوت اور احتجاج ایک دوسرے سے قریب تر ضرور ہیں لیکن ان میں بہت فرق ہے۔ جہاں تک انقلاب کا تعلق ہے تو اسے لوگوں نے کئی معنوں میں استعمال کیا ہے، لیکن اگر انقلاب کے سائنٹفک نقطۂ نظر کو دھیان میں رکھا جائے تو انقلاب کے معنی کسی سماج کی معاشیات کے پیداواری رشتے میں مکمل تبدیلی یا دوسرے الفاظ میں کسی سماجی ڈھانچے میں مکمل سماجی، سیاسی، اور معاشی تبدیلی کے ہیں... انقلاب کے لیے عمل پیہم ضروری ہے اور انقلاب کا تعلق کسی باقاعدہ تحریک سے ہوتا ہے جس کے مقاصد پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی انقلاب کے لیے انقلابی شعور کا ہونا بھی لازمی ہے جبکہ احتجاج کسی بھی سماجی نظام یا تحریک سے ناراضگی کا ردعمل ہوسکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی تحریک کا مخالف ہے تو اس کی یہ مخالفت کسی طرح کی حکمت عملی کو جنم نہیں دیتی بلکہ ایک طرح کی ذہنی بغاوت کی موجب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ احتجاج کسی بھی شے کے خلاف اسے ختم کرنے کا راستہ ہموار نہیں کرتا..... جس طرح انقلاب اور احتجاج میں فرق ہے، ویسے ہی بغاوت اور احتجاج بھی معنوی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کسی نظام کے خلاف ٹکراؤ یا کسی بھی رسم یا رواج کے خلاف مہم کو بھی بغاوت کا نام دیا جاسکتا ہے، خواہ اس کی راہ انقلابی ہو یا جذبات کا وقتی ابال جو رومانوی اثرات سے پر ہو، جبکہ احتجاج کسی شے سے لاتعلقی یا ناراضگی کا اظہار ہے، جو مقابلہ کی حد تک نہیں پہنچتا اور نہ کسی ناپسندیدہ شے سے نجات پانے کا راستہ ہموار کرتا ہے۔"

(مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری، 2007،ص 20)

غرض کہ مسلمہ قانون، اصول وضابطے اور رسم و رواج میں بڑی تبدیلی لانے کا عمل بغاوت کے زمرے میں آتا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ مزاحمت بغاوت اور احتجاج کا سلسلہ ازل تا ابد جاری و ساری ہے اور تینوں ہی لفظوں کو یعنی احتجاج، انقلاب مزاحمت یا بغاوت کی اصطلاحیں ایک دوسرے کے بدل کے طور پر برتی جاتی رہی ہیں، اور اس کی توجیحات بھی غالباً وہی ہیں۔ گویا مزاحمتی ادب کی تین خوبیاں ہیں:

(1) تنظیم نو کی خواہش (2) فرسودہ نظام کی نفی ((3 نو بیداری یا نشاۃ الثانیہ

مذکورہ بالا خوبیوں کی روشنی میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اردو کے مزاحمتی ادب کی تشکیل میں اعتراض، بغاوت، انقلاب اور مزاحمت اہم عنصر ہیں جن کے بغیر مزاحمتی ادب پروان نہیں چڑھ سکتا۔ اس لحاظ سے اردو ادب میں یا عالمی ادب میں مزاحمت کی مندرجہ ذیل قسمیں موجود ہیں:

(1) خاموش احتجاج (2) مدھم لہجے کا احتجاج (3) بلند و بانگ احتجاج یا نعرے بازی

کسی بات پہ اظہارِ ناراضگی جتانے کا ایک عمدہ طریقہ خاموش مزاحمت بھی ہے۔ خاموشی جو اقرار کے بھی مماثل ہے اور انکار سے بھی عبارت ہے:

چپ ہوں کسی سبب سے تو پتھر ہمیں نہ جان
دل پہ اثر ہوا ہے تیری بات بات کا

دبی دبی اور مدھم لہجے میں یا سرگوشیوں میں بھی مزاحمت کا اظہار کیا جاتا رہا ہے:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تا کے، یہ حشر انگیزیاں کب تک
یہ جوش انگیزیِ طوفانِ بیداد و بلا تا کے!
یہ لطف اندوزی ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک؟
(شبلی نعمانی)

کس کس طرح سے مجھ کو نہ رسوا کیا گیا
غیروں کا نام میرے لہو سے لکھا گیا

بلند و بانگ لہجے کی غماز مزاحمت کو ان نعروں سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ انقلاب زندہ باد!

"تم مجھے خون دو، میں تمھیں آزادی دوں گا۔"

یا پھر علامہ اقبال کے لفظوں میں:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

یا پھر میں اپنے لہجے میں کہنا چاہوں تو یہ کہوں گی کہ:

دیکھ رہی ہوں تم کتنے عیار ہوئے
باتوں باتوں میں ننگی تلوا رہوئے
(نامعلوم)

جب انسانی زندگی کو ہر لمحہ تازہ آفات، بلیات و حادثات کا سامنا ہو تو بھلا کب تک وہ صبر و ضبط اور شائستگی کا مظاہرہ کرتا رہے۔ معین احسن جذبی کے لفظوں میں:

ہر لحظہ تازہ تازہ بلاؤں کا سامنا
نا آزمودہ کار کی جرأت کہاں سے لائیں

بہرکیف! معاشرے کا جبر و استبداد جتنی شکلیں اختیار کرتا ہے ادبی مزاحمت اتنے رنگوں سے عبارت ہے، اور احتجاج کا ہر رنگ ادب میں قابلِ رشک رہا ہے خواہ وہ مذہبیت کے خلاف ہو معاشی نابرابری کے خلاف ہو یا پھر سیاسی بدعنوانی، پدری نظام معاشرہ ادبی جبر، یا تہذیب و ثقافت کے ریزہ ریزہ بکھرنے اور اقدار کے ٹوٹنے کے خلاف ہو:

"Exploitation is always an exploitation in each and every point of view."

(ہر نقطۂ نظر سے استحصال، صرف استحصال ہوتا ہے۔)

■

Dr. Rizwana Iram, Asst Prof./ Head Dept of Urdu, Jamshedpur Womens' College, Jamshedpur (Bihar)

فیاض عالم

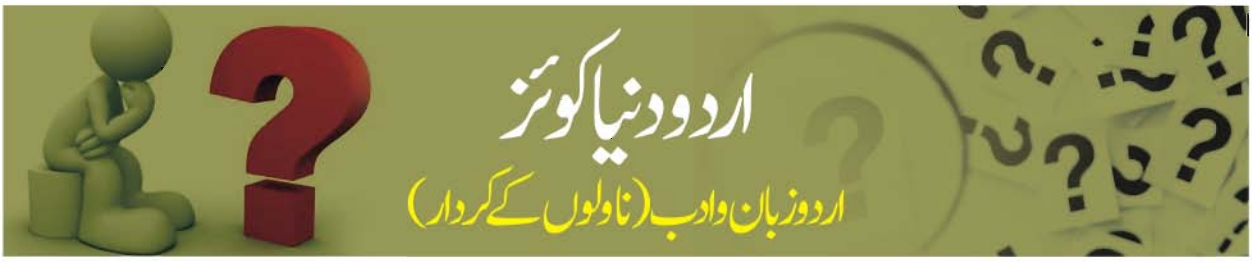

(1) اصغری اور اکبری، نذیر احمد کے کس ناول کے کردار ہیں؟
(الف) مراۃ العروس (ب) بنات النعش
(ج) توبۃ النصوح (د) ابن الوقت

(2) نذیر احمد کے ناول 'توبۃ النصوح' کا مرکزی کردار کون ہے؟
(الف) کلیم (ب) نصوح
(ج) فہمیدہ (د) مرزا ظاہر دار بیگ

(3) مرزا ظاہر دار بیگ کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) توبۃ النصوح (ب) ایامیٰ
(ج) ابن الوقت (د) مراۃ العروس

(4) خوجی کا تعلق کس ناول سے ہے؟
(الف) فسانۂ آزاد (ب) فسانۂ مبتلا
(ج) فسانۂ عجائب (د) ان میں سے کسی سے نہیں

(5) خوجی کا اصلی نام کیا ہے؟
(الف) اختر بدیع الزماں (ب) خواجہ بدیع الزماں
(ج) شمس الزماں (د) افتخار الزماں

(6) آزاد کس ناول کا نمائندہ کردار ہے؟
(الف) سیر کہسار (ب) فسانۂ مبتلا
(ج) فسانۂ آزاد (د) ان میں سے کسی کا نہیں

(7) حسین اور زمرد کا تعلق عبدالحلیم شرر کے کس ناول سے ہے؟
(الف) زوال بغداد (ب) منصور موہنا
(ج) عرب کا چاند (د) فردوس بریں

(8) شیخ علی وجودی کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) انجلینا (ب) جویائے حق
(ج) فردوس بریں (د) ان میں سے کسی کا نہیں

(9) امراؤ جان ادا کے بچپن کا نام کیا تھا؟
(الف) امراؤ (ب) زہرہ
(ج) امیرن (د) ان میں سے کوئی نہیں

(10) سمن، پریم چند کے کس ناول کا مرکزی کردار ہے؟
(الف) بیوہ (ب) گئودان
(ج) نرملا (د) بازارِ حسن

(11) اختر بھائی قاضی عبدالستار کے کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) داراشکوہ (ب) شب گزیدہ
(ج) غبارِ شب (د) شکست کی آواز

(12) چمپا کا تعلق قرۃ العین حیدر کے کس ناول سے ہے؟
(الف) میرے بھی صنم خانے (ب) آگ کا دریا
(ج) سفینۂ غم دل (د) چاندنی بیگم

(13) خدیجہ مستور نے 'آنگن' کے کس کردار کو مسلم لیگ کے حمایتی کے طور پر پیش کیا ہے؟
(الف) بڑے چچا (ب) عالیہ
(ج) چھمی (د) کریمن بوا

(14) امرکانت، پریم چند کے کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) غبن (ب) گئودان
(ج) گوشۂ عافیت (د) میدانِ عمل

(15) 'گئودان' کا مرکزی کردار کون ہے؟
(الف) گوبر (ب) ہوری
(ج) دھنیا (د) ان میں سے کوئی نہیں

(16) کرشن چندر کا ناول 'غدار' کس کردار کی یادداشت پر مبنی ہے؟
(الف) بیج ناتھ (ب) شاداں
(ج) داداجی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(17) جیلانی بانو کے ناول 'بارشِ سنگ' میں وینکٹ ریڈی کا قاتل کون ہے؟
(الف) مستان (ب) دیش مکھ
(ج) سلیم (د) پٹیل

(18) مزدوروں کے استحصال کے خلاف الیاس احمد گدی کے ناول 'فائر ایریا' میں نوجوان نسل کی نمائندگی کون کرتا ہے؟
(الف) کالا چند (ب) رحمت میاں
(ج) مجمدار (د) عرفان

(19) قرۃ العین حیدر کے ناولٹ 'سیتا ہرن' کے مرکزی کردار سیتا میر چندانی کے شوہر کا نام کیا ہے؟
(الف) جمیل (ب) راما سوامی
(ج) قمر الاسلام (د) برجیس چودھری

(20) رانو کا تعلق کس ناول سے ہے؟
(الف) شکست (ب) ٹیڑھی لکیر
(ج) گوشۂ عافیت (د) ایک چادر میلی سی

(21) علیم مسرور کے ناول 'بہت دیر کردی' کے کردار سلطانہ کا تعلق کس شہر سے ہے؟
(الف) بڑودہ (ب) احمد آباد
(ج) ناگپور (د) ممبئی

(22) جوگندر پال کے ناول 'نادید' میں چار نابینا کردار ہیں۔ ان میں سے ایک ایسا بھی کردار ہے جس کی بعد میں بینائی لوٹ آتی ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟
(الف) شرفو (ب) بھولا
(ج) بابا (د) رونی

(23) عبداللہ حسین کے ناول 'اداس نسلیں' کا مرکزی کردار کون ہے؟
(الف) نعیم (ب) علی
(ج) عذرا (د) عائشہ

(24) 'بارشِ سنگ' اور 'جب کھیت جاگے' دونوں ناول تلنگانہ تحریک سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ 'بارش سنگ' میں وینکٹ ریڈی غریبوں کا استحصال کرتا ہے۔ 'جب کھیت جاگے' میں اس کا مماثل کردار کون ہے؟
(الف) راگھوراؤ (ب) پرتاپ
(ج) دیشمکھ (د) ناگیشور

(25) گوہر مرزا کا تعلق کس ناول سے ہے؟
(الف) امراؤ جان ادا (ب) شریف زادہ
(ج) ذات شریف (د) ان میں سے کسی سے نہیں

(26) زہرہ خانم عرف محبوب جان کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) شاہد رعنا (ب) امراؤ جان ادا
(ج) ایوانِ غزل (د) ان میں سے کسی کا نہیں

(27) ممتاز مفتی کے ناول 'علی پور کا ایلی' میں ایلی کے باپ کا نام کیا ہے؟
(الف) علی احمد (ب) احمد علی
(ج) محمد علی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(28) 'بستی' انتظار حسین کا اہم ناول ہے۔ اس کا مرکزی کردار کون ہے؟
(الف) جواد (ب) ذاکر
(ج) بی اماں (د) ان میں سے کوئی نہیں

(29) بانو قدسیہ نے 'راجا گدھ' میں گدھ کے طور پر کسے پیش کیا ہے؟
(الف) سہیل (ب) آفتاب
(ج) قیوم (د) افتخار

(30) نیاز کباڑی کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) خدا کی بستی (ب) اداس نسلیں
(ج) علی پور کا ایلی (د) بستی

(31) شمن عصمت چغتائی کے کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) دل کی دنیا (ب) ضدی
(ج) معصومہ (د) ٹیڑھی لکیر

(32) عزیز احمد کے ناول 'گریز' کا مرکزی کردار کون ہے؟
(الف) نعیم (ب) کرا کسلے
(ج) بلقیس (د) ان میں سے کوئی نہیں

(33) 'لہو کے پھول' کا کون سا کردار ناقابل فراموش ہے؟
(الف) امر سنگھ (ب) راحت رسول
(ج) شوکت (د) سلیمہ

(34) جیلانی بانو کے ناول 'ایوانِ غزل' کا کردار چاند کس کی بیٹی ہے؟
(الف) حیدر علی خاں (ب) واحد حسین
(ج) ہمایوں علی شاہ (د) راشد

(35) شیام اور ونتی کس ناول کے مرکزی کردار ہیں؟
(الف) غدار (ب) شکست
(ج) ایک عورت ہزار دیوانے (د) ان میں سے کسی کے نہیں

(36) شیلا گرین کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) لندن کی ایک رات (ب) گریز
(ج) ہوس (د) ان میں سے کسی کا نہیں

(37) 'لہو کے پھول' کا کون سا کردار پولیس کی نوکری چھوڑ کر مجاہدین آزادی میں شامل ہو جاتا ہے؟
(الف) امر سنگھ (ب) مقصود
(ج) راحت رسول (د) ان میں سے کوئی نہیں

(38) گوتم نیلمبر اور ہری شنکر کے کردار قرۃ العین حیدر کے کس ناول میں ملتے ہیں؟
(الف) آخرِ شب کے ہم سفر (ب) آگ کا دریا
(ج) گردشِ رنگِ چمن (د) چاندنی بیگم

(39) ننھی جان کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) نمک (ب) شاہد رعنا
(ج) امراؤ جان ادا (د) لیلیٰ کے خطوط

(40) خدیجہ مستور کے ناول 'آنگن' کا کون سا کردار کمیونسٹ نظریات کا حامی ہے؟
(الف) جمیل (ب) صفدر
(ج) عالیہ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(41) کرشن چندر کے ناول 'جب کھیت جاگے' کا مرکزی کردار ہے...
(الف) ثریا (ب) مقبول
(ج) راگھوراو (د) ناگیشور

(42) 'چوگانِ ہستی' کا علامتی کردار کون ہے؟
(الف) مانک رام (ب) بھیرو
(ج) سبھاگی (د) سورداس

(43) راشد الخیری کے ناول 'شامِ زندگی' میں کس کردار کو مرکزیت حاصل ہے؟
(الف) نسیمہ (ب) ہاجرہ
(ج) سنجیدہ (د) رابعہ

(44) رضیہ میر، عبداللہ حسین کے کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) اداس نسلیں (ب) باگھ
(ج) قید (د) ان میں سے کسی کا نہیں

(45) جمنا، کرشن چندر کے کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) پانچ لوفر ایک ہیروئن (ب) مٹی کے صنم
(ج) برف کے پھول (د) میری یادوں کے چنار

(46) کرشن چندر نے 'بلبل' کے حوالے سے فلم انڈسٹری میں لڑکیوں کے جنسی استحصال کو موضوع بنایا ہے۔ یہ کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) چاندی کا گھاؤ (ب) برف کے پھول
(ج) غدار (د) سڑک واپس جاتی ہے۔

(47) مندرجہ ذیل میں سے کس کردار کا تعلق حجاب امتیاز علی کے ناول 'پاگل خانہ' سے ہے؟
(الف) ڈاکٹر گار (ب) ایلس
(ج) بلقیس (د) ان میں سے کوئی نہیں

(48) جواد، انتظار حسین کے کس ناول کا کردار ہے؟
(الف) چاند گہن (ب) بستی
(ج) تذکرہ (د) آگے سمندر ہے

(49) سہد یو اور مجمدار مندرجہ ذیل میں سے کس ناول کے کردار ہیں؟
(الف) نمبر دار کا نیلا (ب) فائر ایریا
(ج) فرار (د) بیان

(50) بلونت سنگھ کے ناول 'رات، چور اور چاند' کے مرکزی کردار کون ہیں؟
(الف) موہن سنگھ اور چندرا (ب) داؤد اور سلطانہ
(ج) پالا سنگھ اور سرنوں (د) ان میں سے کوئی نہیں

صحیح جوابات

1. الف	2. ب	3. الف	4. الف	5. ب
6. ج	7. د	8. ج	9. ج	10. د
11. ب	12. ب	13. ج	14. د	15. ب
16. الف	17. الف	18. د	19. الف	20. د
21. د	22. ج	23. الف	24. ب	25. الف
26. الف	27. الف	28. ب	29. ج	30. الف
31. د	32. الف	33. ب	34. الف	35. ب
36. الف	37. ج	38. ب	39. ب	40. ب
41. ج	42. د	43. الف	44. ج	45. الف
46. الف	47. الف	48. د	49. ب	50. ج

■ اردو دنیا کی فائل سے

'ہفت تماشا' اور انیسویں صدی کا ہندوستان

مہتاب جہاں

دلّی، جو کہ ہندوستان کا دل کہلاتی ہے دنیا میں اپنی گونا گوں صفات کی بنا پر مشہور و ہر دل عزیز ہے، یہ اپنے کھان پان، رہن سہن، میلے ٹھیلے، کھیل کود، تہواروں اور اپنی گنگا جمنی تہذیب کے باعث ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم 'دلّی' سے متعلق کسی پرانی کتاب کا مطالعہ کریں تو لگتا ہے کہ دلی میں زیادہ کچھ نہیں بدلا، بس انگریز چلے گئے اور 'قلعہ والے' نہیں رہے۔

دلی کی شان، دلی کی ہر بات میں جلوہ گر ہے۔ بھلے ہی دلی کے باہر والے دلی کے بارے میں کچھ کہیں، دلی کبھی برا نہیں مانتی اور نہ ہی دلی والے، بلکہ مسکرا کر گلے ہی لگاتے ہیں۔ دلی کی ہر بات انوکھی اور نرالی ہے۔

دلی کے کسی بھی پہلو پر بات کی جائے تو وہ لذت و شوق سے خالی نہیں ہوتی، چاہے وہ بات دلی کے شاعروں جیسے غالب، میر تقی میر، سودا، مصحفی، قتیل کے بارے میں ہو، دلی کے تنگ گلی کوچوں کے بارے میں، دلی کے مکان و مکین کے بارے میں، دلی کے لال قلعہ یا جامع مسجد کے بارے میں، دلی کے بازاروں، دلی کے خوانچہ والوں کے بارے میں یا دلی کے ہوٹلوں شوٹلوں کے بارے میں۔

دلی اور ہندوستان کی تاریخ بلا شبہ اور بلا مبالغہ ہزاروں سال پرانی ہے۔ یہاں کے لوگوں نے زندگی کے ہر ایک شعبے میں قابل قدر کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ صرف تصنیفی میدانوں کو ہی دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان میں علم و ادب کی مختلف شاخوں میں بڑی قیمتی اور بلند پایہ کتابیں لکھیں گئیں۔ مذہب، الٰہیات، ریاضیات، ہئیت، طب، ڈراما، شعر، افسانہ، غرض علم کی تمام اصناف میں ایسی ایسی اور اتنی کتابیں دستیاب ہوئی ہیں کہ ساری دنیا یہاں کے تہذیب و تمدن اور فنون میں ترقی کا لوہا مان گئی ہے۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی سے متعلق ایسی ہی فارسی میں مرزا محمد حسن قتیل ((1817 کی ایک کتاب 'ہفت تماشا' ہے۔ قتیل ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئے ان کا بچپن اور جوانی کا ابتدائی زمانہ اسی ماحول میں بسر ہوا۔ سترہ سال کی عمر میں انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس طرح وہ گویا ہندو اور اسلامی تہذیب کا سنگم بن گئے ان کے علم اور مشاہدے اور غور و فکر کا مرقع ان کی کتاب 'ہفت تماشا' ہے۔

مگر یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا قتیل نے اپنی اس کتاب میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی تفصیلات میں سارا کا سارا درست ہے۔ مگر اس کا اکثر حصہ ضرور صحیح ہے۔ اس کتاب کا پانچواں اور چھٹا باب جہاں تہواروں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسوم و رواج کا ذکر ہے بہت اہم اور گویا پوری کتاب کی جان ہے۔ ان ابواب سے اس زمانے کی معاشرت، عوام کی روز مرہ کی زندگی، ان کے جذبات اور خیالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ جو بہت مفید اور کارآمد ہے۔ اگر یہاں پہلے قتیل سے متعلق کچھ باتیں ہو جائیں تو بے جا نہ ہوگا۔

مرزا محمد قتیل، اصلاً بٹالہ ضلع گورداس پور (پنجاب) کے کھتری بھنڈاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا خاندانی نام دیوان سنگھ یا دیوال سنگھ، یا دیوالی سنگھ تھا۔ شجرۂ خاندان مالک رام کو اسی کے ایک خاندان کے آدمی سے ملا تھا۔ جو کہ ہفت تماشا کے اردو ترجمہ میں موجود ہے۔[1]

مؤلف نشترِ عشق، آغا حسین قلی خان عاشقی نے قتیل کے خاندان اور ابتدائی زندگی کے بارے میں جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں وہ اس طرح ہیں۔

''ان کے آبا و اجداد قصبہ پٹیالہ (بٹالہ) کے رہنے والے تھے۔ جو مشہور مقام پٹیالہ سے مختلف جگہ ہے۔ ایک زمانہ گزرنے پر ان کے جَد سومی صورت سنگھ نے قوم کھتری کے ایک فرد کے ہمراہ، جو اُن سے دوستی رکھتا تھا۔ اپنے موروثی مکان کو چھوڑ کر باغپت میں نزول کیا جو جمنا کے پار دہلی سے سترہ کوس کے فاصلے پر ایک شہر ہے۔ قتیل کے والد اور دادا وہیں پیدا ہوئے۔ جب قتیل کے دادا نے فردوس آرام گاہ محمد شاہ کے جلوس کے سترہویں سال (1148ھ 36-1735) میں وفات ہوئی تو ان کے باپ (درگاہی مل) نے باغپت سے نقل مکانی کر کے دہلی سے بارہ کوس کے فاصلے پر قصبہ ڈاسنہ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں دو تین سال ہی گزرے تھے کہ نواب ہدایت علی خاں بہادر نے شاہ جہاں آباد (دلی) پہنچ کر یہ صوبہ مستاجری پر لیا تو اپنے ہم مکتب اور پرانے تعلق پر نظر کر کے جو سید فیض اللہ خان اور ان کے دادا کے وقت سے آپس میں چلے آ رہے تھے۔ ان کے والد درگاہی مل کو ڈاسنے سے بلا بھیجا اور دلجوئی و چارہ سازی کے ساتھ پیش آئے۔ ہزار روپیہ (سالانہ) ان کی ذات کا مقرر کر کے اجازت دے دی کہ اپنے گھر میں بال بچوں کے ساتھ رہیں (یعنی تکلیف نوکری سے معاف رکھا۔) لہٰذا درگاہی مل کبھی ان کی سرکار میں رہتے تھے اور کبھی ڈاسنہ چلے جاتے تھے۔ اور فارغ البال زندگی گزار رہے تھے۔

قتیل 1172ھ بمطابق 1758 دہلی میں پیدا ہوئے۔ سترہ سال کی عمر تک صرف و نحو و منطق حکمت و معانی و بیان و بدیع و ریاضی و عروضی و عربی و فارسی کی تحصیل کرتے رہے، آخر شعر گوئی کی طرف میلان ہوا، اور میرزا محمد باقر کرمان شاہ شہید کے شاگرد ہوئے اور ان سے فیض اٹھایا۔ ان کی صحبت کی برکت سے چودہ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے دو سال تک اسے اپنے عزیز و اقارب سے مخفی رکھا آخر جب سترہ سال کی عمر کو پہنچے تو قبول اسلام کا اظہار کیا، اور مذہب اثنا عشری (شیعہ) اختیار کیا اپنے گھر بار سے کنارہ کر کے آزادگی اور تجرد کے میدان میں قدم رکھا۔[2]

قتیل کا وطن اور مولد بھی ایک مسئلہ بن گیا کوئی اسے پٹیالہ سے منسوب کرتا ہے کوئی پٹیالی سے کوئی لاہور سے، کوئی فرید آباد سے اور کوئی دلی سے مگر قتیل دہلی میں پیدا ہوئے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:

گرچہ باشد مولدِ من خاک دہلی اے قتیل
کم کسی چون من زیزد ایران برخاست است

عاشقی کے مطابق قتیل نے اثنا عشری فرقے کے عقائد

اختیار کیے تھے۔ یہی بات غلام ہمدانی مصحفی نے بھی قتیل کے لیے کہی ہے۔ خود قتیل نے بھی ہفت تماشا باب دوم میں لکھا ہے کہ:

''بہت سے لوگ شیعوں کی حکومت ہونے کے باعث تشیع کی طرف جھکتے ہیں۔''

قتیل نے اپنی ابتدائی زندگی دو شہروں یعنی دہلی اور فیض آباد میں گزاری اس کے بعد تقریباً 1776 میں وہ ذوالفقار الدولہ نجف خان کے لشکر میں شریک ہوکر دہلی اور اس کے اطراف میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اور نجف خان سے ان کا یہ تعلق ان کی موت یعنی 1782 تک باقی رہا۔ اس بیچ اکثر وہ دہلی بھی آتے رہتے تھے کیونکہ ان کی موجودگی ان مشاعروں میں ملتی ہے جو کہ مصحفی کے مکان پر ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں قتیل نے مصحفی کو فارسی شعرا کا تذکرہ عقدِ ثریا لکھنے کی ترغیب دی۔[3] بلکہ کچھ مواد بھی جو قتیل نے فراہم کر رکھا تھا، یا زبانی یاد تھا تذکرے میں شامل کرانے کے لیے لکھوا دیا۔

نجف خان کے لشکر سے الگ ہوکر قتیل نے لکھنؤ کا رخ کیا اور پھر اسے اپنا وطن ہی بنالیا۔ اور 23 ربیع الثانی 1233 مطابق 2 مارچ 1817 روز شنبہ کو قتیل نے استسقاء (Affected with dropsy) میں مبتلا ہوکر لکھنؤ میں وفات پائی۔[4] قتیل کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ انھوں نے تمام عمر آزادہ روی میں گزاری۔ مختلف شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاشق مزاج انسان تھے۔ اس دور کے اودھ میں طوائف بھی زندگی کے آداب میں جزو تکمیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ قتیل بھی ان لولیان شوخ کی عشوہ فروشیوں سے بہرہ اندوز ہوتے رہے۔ عاشقی لکھتے ہیں: ''ہمیشہ با یک کس تعلق خاطری دارد وگاہی می شود کہ بر یک محبوب اکتفانہ کردہ بادو سہ کس تعلق خاطر دارد۔''[5]

قتیل کی شخصیت کا اگر خاکہ کھینچا جائے تو وہ کچھ اس طرح ہوگا۔ آزاد منش قلندر وضع، سادہ طبیعت، موٹا جھوٹا کھانے والا، عاشق مزاج، خوش طبع، حریف و ظریف، یار باش، ہشاش بشاش اور سیر و سیاحت کا دلدادہ انسان۔

قتیل کی تصانیف تعداد میں خاصی ہیں۔ اس ضمن میں مخزن الغرائب کے مؤلف کا بیان ہے کہ:

''فقیر کسی را در لطافت طبع و جودت ذہن و استقامت عقل و لزوم قناعت و تجرد و تفرد خوش گز رانیدن مانند ایشان ندیدہ ام و گاہی تلاش دنیا نکردہ، خانہ بدوش، قلندرانہ بہ لباس کم بہا زیست می نماید۔ ہر گز در بند شیخی نبودہ از علاقۂ دنیا تا دوات و قلم کہ از لازمۂ اہل علم است ہمراہ خود ندارد، این ہمہ بے تعلقی از لاچاری (نیست) بلکہ بہ استغنای طبع است، اکثر بزرگان مثل...... نواب آصف الدولہ مرحوم و دیگر عزیزان در حدود تربیت اور در آمدہ اندو او سر باز زدہ و تن بکرٌ وفرندادہ رویۂ کہ اختیار نمودہ از ان برنگشتہ۔''[6]

قتیل کی قلندرانہ طبیعت کے بارے میں عاشقی مؤلف نشترعشق کہتے ہیں کہ:

''نہ التفات بر قلم تراشیدن دارد نہ بر قط زدن، ہنگام تحریر اگر نوک قلم می شکند بہ ہمان قلم دہ خط می نویسد، و خدمت لفافہ تعلق بہ حاضرین دار دالی یومنا ہٰذا بہ ہمین نمط زندگی می کند۔''[7]

ایک دوسری جگہ بھی بقول عاشقی:

''امروز در ہندوستان کسی ہم زبان آن جناب نیست۔''[8]

احمد علی الہاشمی مؤلف مخزن الغرائب نے شاعری اور انشا پردازی کے معیار اور قتیل کی حاکمانہ قدرت کے بارے میں بیان کیا ہے کہ اس کی نظیر نہیں ہے۔[9]

قتیل کی نظم و نثر میں ماہرانہ چابک دستی کی مثالیں عاشقی نے پیش کی ہیں جن میں سے ایک کا خلاصہ اس طرح ہے۔

''ایک بار مرزا جعفر کے لڑکے کی شادی کے موقع پر شہر کے لوگوں کو شرکت مجلس کا دعوتی رقعہ بھیجنے کی خدمت قتیل کے سپرد کی گئی دعوت کے رقعے کا مضمون ہوتا ہی کیا ہے۔ مگر انہوں نے دو دن میں سو رقعے مختلف الفاظ و عبارت میں لکھ کر پیش کیے اور کہا کہ اگر ایک ہفتے کی مہلت مل جائے تو ایسے ہی آٹھ سو رقعے اور لکھ سکتا ہوں۔''

یہ واقعہ لکھ کر عاشقی کہتا ہے کہ اسے مبالغہ یا جانب داری نہ سمجھنا، حقیقت یہ ہے کہ فیضی تو موجود ہے کوئی اکبر نہیں رہا۔ ظہوری آج بھی زندہ ہے مگر برہان الملک جیسا قدردان کمال نہیں ہے۔

مرزا قتیل عربی، فارسی اور ترکی سے واقفیت رکھتے تھے۔ عاشقی کے بیان کے مطابق کہ وہ عربی اور ترکی میں بات چیت کر سکتے تھے۔[10] احمد علی کے مطابق مہارت کلی حاصل تھی۔ مصحفی اور احمد علی نے فنِ تاریخ میں اس کی دسترس اور قوتِ حافظہ کی بھی تعریف کی ہے۔

نجف خان کے لشکر سے الگ ہوکر قتیل نے لکھنؤ کا رخ کیا اور پھر اسے اپنا وطن ہی بنالیا۔ اور 23 ربیع الثانی 1233 مطابق 2مارچ 1817 روز شنبہ کو قتیل نے استسقا، (Affected with dropsy) میں مبتلا ہوکر لکھنؤ میں وفات پائی۔ 4قتیل کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ انھوں نے تمام عمر آزادہ روی میں گزاری۔ مختلف شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاشق مزاج انسان تھے۔ اس دور کے اودھ میں طوائف بھی زندگی کے آداب میں جزو تکمیل کی حیثیت رکھتی تھی۔

مرزا محمد حسن قتیل کی تصانیف کا مختصر خاکہ اس طرح ہے:

1. دیوان فارسی: اس کے قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتاب خانوں میں موجود ہیں۔ اشعار کی مجموعی تعداد پانچ ہزار ہے۔
2. چار شربت: یہ قواعد فارسی، مصطلحات، زبان دانی اور محاورۂ اہل فارس میں ہے۔ اس کی تالیف کا زمانہ 1228ھ ہے محمدی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔
3. نہر الفصاحت: یہ مختصر رسالہ جس کی تعداد صفحہ 38 ہے قواعد زبان فارسی اور اصول بلاغت و انشا وغیرہ میں ہے غالباً پہلی بار 1270ھ میں مطبع مصطفائی کانپور سے شائع ہوا تھا۔
4. مَعدنِ الفوائد: یا رقعات مرزا قتیل، خواجہ امام الدین امامی قتیل کے شاگرد نے 17-1816 میں اپنے مرقومہ رقعات جمع کیے تھے اس میں بہت سی کارآمد باتیں قتیل کی زندگی اور اس کے معاصرین کی بابت معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کتاب مطبع نولکشور سے 1881 میں چھپی تھی۔
5. شجرۃ الامانی: یہ میر امان علی کی فرمائش پر ان کے بیٹے میر محمد حسین کے لیے لکھا گیا تھا۔
6. ثمر البدائع: یہ بھی فارسی بلاغت اور فن انشا سے متعلق ہے 1263 میں مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔
7. مظہر العجائب: یہ 1231ھ۔ 16-1815 میں کالپی میں لکھی تھی۔ اور مطبع نولکشور سے شائع ہو چکی ہے۔
8. حدیقۃ الانشا: یہ نظر سے نہیں گزری، مطبوعہ ہے یا غیر مطبوعہ نہیں معلوم۔
9. دریائے لطافت: میر انشا اللہ انشا 18-1817 کی تالیف ہے، جو 1809 میں لکھی گئی۔ اس کا آخری حصہ جو معانی و بیان و بدیع و عروض و منطق سے متعلق تھا، قتیل نے لکھا ہے۔ یہ حصہ مطبوعہ کتاب (مترجمہ برج موہن دتاتریہ کیفی طبع انجمن 1935 کے صفحہ 359 سے شروع ہوتا ہے۔
10. ہفت تماشا: یہ قتیل کی زندگی کے آخری دنوں کی تصنیف ہے اور اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم کتاب ہے۔ یہ مارچ 1875 میں مطبع نولکشور سے چھپی تھی۔ اس نے یہ کتاب بہ عنوان 'ہفت تماشا' مرزا محمد حسین کے حکم سے ہندوؤں کے حالات کے بارے میں اور ان کے رسوم کے بارے میں اس کے علاوہ قدیم مسلمانوں کے اوضاع و اطوار اور نو مسلموں کے حالات کے بارے میں تحریر کی ہے۔

یہ کتاب اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی نہ صرف دہلی بلکہ ہندوستان کی پوری معاشرت کا احاطہ کرتی ہے۔ اس میں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سات تماشے (یعنی ابواب ہیں)

پہلا باب: سمارتکوں یعنی اہل تقلید کا مذہب اور اس کے بارے میں تحقیقات۔

دوسرا باب: انسان کی آفرینش کا بیان۔

تیسرا باب: ہندو فرقوں کے عقائد

چوتھا باب: ہندوؤں کے متبرک دنوں اور تہواروں کا بیان۔
پانچواں باب: ہندوؤں کے رسوم ورواج۔
چھٹا باب: ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور رسوم و رواج۔
ساتواں باب: بعض عجائب وغرائب

ان ابواب میں ہندوستانی دیومالا کی روایات، عوام کے عقائد، عوامی رسمیں نذر ونیاز، باہمی روابط، یا خود قتیل کی زندگی اور ذہنی افتاد سے متعلق کارآمد معلومات ملتی ہیں۔ قتیل کی اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض اندھے تقلیدی عقائد ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ بہت سے امور میں ان کی آزادانہ رائے تھی جو انھوں نے عقلی دلائل کی روشنی میں قائم کی تھی۔ اور اس طرح کے اظہار رائے میں وہ بہت بے تکلف ہیں۔

اس دور کی معاشرت میں شرافت اور حسب نسب کے معیار پر بہت سخت اور تقلیدی قسم کے تھے۔ قتیل نے ان تصورات کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے ظاہری طور پر وہ ان رائج قدروں کے مخالف نہیں بلکہ ہمدرد ہیں ہفت تماشا کے دوسرے باب میں لکھتے ہیں کہ:

''بعض امیر مرثیہ خوانوں کو بھی محرم کے سوائے اپنی محفل میں بٹھانے کے لائق نہیں سمجھتے۔''[11]

حالانکہ محرم کے دنوں میں ان روضہ خوانوں کی بڑی آو بھگت کرتے تھے۔

ہفت تماشا کے باب سوم یا تماشائے سوم میں قتیل نے سمارتکوں کے بارے میں لکھا کہ ان کی بت پرستی ایسی نہیں ہے کہ وہ بتوں کو خدا کا مظہر یا خدا سمجھتے ہوں بلکہ وہ اس طرح صاحب ضرورت کو دوست رکھتے ہیں جیسے ایک عاشق معشوق کی تصویر سے دل بہلاتا ہے۔ عقیدہ خواص کا قابل اعتبار ہے ... لیکن اس فرقے کے عوام یقینا بتوں کو خدا سمجھتے ہیں۔[12]

پہلے باب میں شاہ جہاں آباد کے بارے میں ایک اطلاع ملتی ہے جو دہلی کے لڑکوں کی ایجاد کردہ زبان کے بارے میں ہے۔ قتیل کا کہنا ہے کہ شاہ جہاں آباد (دہلی) کے شوخ لڑکے ہمیشہ نئی زبانیں ایجاد کرکے آپس میں بات چیت کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ جنھوں نے ان بچوں سے یہ زبان سیکھی ہو، کوئی دوسرا شخص اس سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔۔۔۔۔۔ تو شاہجہاں آباد کے لڑکوں کی یہ اختراعی زبان فارسی اور عربی سے جو کہ مروجہ اور مشہور ہیں، بہتر اور اشرف ہوئی، مگر ایسا نہیں ہے۔[13]

مسلمانوں کے زمانۂ اقتدار میں، عالمی قانون کا تقاضا تھا، کہ محکوم قومیں ان کے قریب آنے کی کوشش کریں۔ تہذیب سے بڑھ کر یہ بات مذہبی عقائد تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ہفت تماشا میں حسینی برہمنوں کے بارے میں اطلاع ملتی ہے۔ انھوں نے اپنا تعلق واقعات کربلا سے کسی طرح جوڑ دیا ہے۔ یا جے پور کے اولوالعزم مہاراجہ کا رشتہ نوشیروان عادل سے جوڑ دیا ہے کہ ان کے اجداد ان کی نسل سے تھے۔[14]

اسی طرح شنوی فرقہ بھی آتا ہے جس کا ذکر قتیل نے باب دوم میں کیا ہے۔:

''ان کی عادت ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ کر عید تک خوب نماز پڑھیں گے ہندو مذہب کے برت رکھیں گے محرم میں تعزیہ داری کریں گے اور کالکاجی مندر کے سامنے ناچیں گے۔ اور بندرابن میں آرتی اور شلوک پڑھیں گے گائے اور سور کے گوشت سے پورا پورا پرہیز کریں گے وغیرہ ان کے نام بھی مسلمانوں ہی جیسے ہوتے ہیں۔ جیسے نور محمد پانڈے یعنی ملا نور محمد کیونکہ ہندی میں پانڈے کا وہی مفہوم ہے جو فارسی میں ملّا کا ہے۔[15]

قتیل نے انگریزوں کے ملکی نظم ونسق کی تعریف کی ہے۔ کیونکہ انھیں دیسی انتظام میں خرابیاں نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ کہا ہے کہ شاہی وقتوں میں اکثر سنیاسیوں اور بیراگیوں میں کشت وخون ہوتا تھا مگر اب ''صاحبان عالی شان انگریز بہادر کے نظم ونسق کی وجہ سے یہ لوگ سرنہیں اٹھا سکتے ...... یہ رعب خداداد ہے۔ ورنہ اتنی بڑی جماعتوں سے قدیم عادت کا چھڑا دینا محالات میں سے تھا۔[16] ایک جگہ انگریزی ڈاک کے نظام کی تعریف میں لکھتا ہے کہ اس میں خط ہرگز گم نہیں ہوتا۔ دیسی ڈاک میں ضائع ہوجاتا تھا۔ خطِ احدی در ڈاک انگریزی تلف نمی شود۔[17]

ہفت تماشا کے چوتھے باب میں ہندوستانی تہواروں کا ذکر ہے اس سے اطلاع ملتی ہے کہ مسلمان اپنی حکومت کے زمانے میں یہاں کے تہواروں میں عام طور سے حصہ لیتے تھے۔ نہ صرف بادشاہ وامرا بلکہ عام لوگ بھی پورے جوش و خروش سے شرکت کرتے تھے۔ دسہرے کے بعد ہندو عوام میں نیل کنٹھ کے دیدار کا رواج ہے اکثر مسلمان بھی اس میں ان کے مقلد تھے۔ اس طرح ہولی مسلمانوں میں بھی کھیلی جاتی تھی ہولی کے سلسلے میں قتیل کا ایک بیان توجہ کے لائق ہے' لکھتے ہیں کہ انگریز بہادر نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اس اتحاد وارتباط میں رخنے پیدا کردیے اور ہولی کا رنگ مسلمانوں پر ڈالنا خلاف قانون بنادیا ہے لیکن اس زمانے میں ہر مسلمان اور ہندو چند متقی لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب تعلیم یافتہ صاحب تمیز اور اہل متانت تک ہولی کے دنوں میں ایک دوسرے پر رنگ اچھالتے ہیں۔ چھوٹے بچے اور بعض جوان لوگ بھی چمڑے اور بیتل کی بنی ہوئی پچکاری کو جسے فارسی میں 'آب دزدک' کہتے ہیں [18] دور سے ہی آنے والے کے کپڑوں کو رنگ دیتے ہیں۔

جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان ہوا کہ مسلم تہذیب سے ہندو سماج بہت متاثر تھے۔ اس لیے ان کی عورتوں میں بھی پردے کا رواج عام ہوا۔ اس کا ذکر بھی ہمیں ہفت تماشا کے پانچویں باب میں ملتا ہے۔ قتیل نے ہندوستانی فرقوں کے ان رسموں کا بیان بھی کیا ہے جو پیدائش سے لے کر موت تک انجام پاتی ہیں۔ یہ کتاب ہندوستانی عوام کی سچی تصویر ہے۔ قتیل نے ستی کی رسم کا بیان بھی خوب کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ستی کا جلوس حاکم وقت کے دروازے کے سامنے سے نکلتا ہے۔ کبھی کبھی حاکم بھی اس میں شریک ہوتا ہے۔ یہ بات داخل آئین ہے کہ چاہے حاکم ہندو ہو یا مسلمان وہ ستی کے جلنے سے پہلے اس کی خواہش کے مطابق روپیہ دینے کا وعدہ کرتا ہے......... ستی کے جلوس کے ساتھ نوبت بجانے کا حکم بادشاہوں اور امرا کی طرف سے ہے۔ جب ستی لکڑیوں کے انبار پر بیٹھ کر اپنے شوہر کا سر اپنے زانو پر رکھ لیتی ہے تو اس وقت حاکم یا بادشاہ کی طرف سے کوئی شخص جاکر اس سے آئندہ زمانے کا حال پوچھتا ہے تاکہ بادشاہِ وقت اور اس کی بیوی کے حق میں اس کی زبان سے دعائے خیر نکلے۔[19]

چھٹے باب میں قتیل نے 'ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور آئین' کے عنوان سے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے بارے میں بتاتے ہوئے مسلمانوں کی شادی کی رسموں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ مسلمان چند رسموں کو چھوڑ کر جیسے آگ کے گرد چکر لگانا، باقی ساری رسمیں ہندوؤں کی طرح کرتے ہیں۔ ہندو لوگ بھی ان کی شادی کی رسموں میں شرکت کرتے ہیں۔ اور اپنی حیثیت کے مطابق تھال میں زر ڈال دیتے ہیں۔[20] ذات پات کا نظام مسلمانوں میں بہت زیادہ ہے ان کی چار اہم ذاتیں ہیں۔ مغل، سید، شیخ، اور پٹھان' یہ شادیاں بھی اپنی ہی ذات میں کرتے ہیں اور اس میں بہت کٹر ہیں۔

ساتویں باب میں جو کہ 'احوال عجیبہ کے بارے میں' کے عنوان سے شامل کتاب ہے مصنف نے عجیب وغریب واقعات کا ذکر کیا ہے جو پڑھنے کے لائق ہیں اس باب میں بعض ہندو فقیروں کی کرامات کا ذکر کیا گیا ہے اس کے علاوہ شعبدے بازوں' نٹوں جردہ باشہ، بہروپیوں کے بڑے عجیب وغریب واقعات اس میں ملتے ہیں۔

غرض یہ کتاب اس زمانے کی ایک مستند اور جامع کتاب ہے۔ پورے ہندوستانی سماج کی آئینہ دار ہے خاص طور پر ہندو مسلم تہذیب اور سماجی حالت کا بخوبی احاطہ کرتی ہے۔

حواشی:

1. مقدمۂ ہفت تماشا اردو: مترجم ڈاکٹر محمد عمر۔ 2 نشترعشق، حصہ 2، 3. مصحفی، عقد ثریا 2، 4. صحائف شرائف، 5. نشترعشق، ج 2، 6. مخزن الغرائب، احمد علی الہاشمی، 7. آغا حسین قلی خان عاشقی، 8. نشترعشق۔ ج 2، 9. مخزن الغرائب، 10. عاشقی، نشترعشق، ج 2، 11. ہفت تماشا، تماشای دوم، 12. ہفت تماشا، تماشای سوم، 13. ہفت تماشا، تماشای چہارم، 14. تماشای دوم، 15. ہفت تماشا، باب دوم، 16. تماشای دوم، 17. معدن الفواید، مرزا قتیل، ص 11، 18. تماشای چہارم، 19. تماشای پنجم، 20. تماشای ششم

■

Dr. Mehtab Jahan, Dept. of Persian, Delhi University, Delhi - 110007

آزادی کی تحریک اور ہندوستانی سنیما

انیس امروہوی

ہندوستان میں سنیما کے ارتقا کا زمانہ لگ بھگ وہی ہے، جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک روز بہ روز شدت اختیار کرتی جارہی تھی، اور ہندوستانی عوام نے اپنے دل ودماغ میں یہ بات پختہ کرلی تھی کہ اَب ہر قیمت پر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینا ہے۔

ہندوستان کی آزادی کی جنگ یوں تو 1857 کی جدوجہد سے ہی شروع ہوگئی تھی، مگر انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور چالاکیوں نے اس جنگ کو اپنے ظلم وستم سے جیت کر ہندوستان کو غلام بنالیا تھا اور پورے ہندوستان پر قبضہ کرلیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فوٹوگرافی کی تکنیک میں نت نئے تجربے ہورہے تھے اور تصویر کو متحرک بنانے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ دوسرے ممالک میں پردے پر چلتی پھرتی تصویروں کو اُبھارنے کی کوشش 1893 میں ہی کامیابی کی طرف گامزن ہوچکی تھی۔ ہمارے یہاں ہندوستان میں اپنے طور پر بھی کوششیں جاری تھیں۔

اُس زمانے میں ہندوستان میں اس طرح کی کئی کتابیں شائع ہوئیں، جن میں تمام صفحات پر ایک جیسی تصویریں چھاپی گئی تھیں، مگر ہر تصویر پچھلی تصویر سے تھوڑی سی مختلف تھی۔ جب اس کتاب کے صفحات کو تیزی سے پلٹا جاتا تو ایسا لگتا تھا جیسے اس کتاب میں چھپی تصویر متحرک ہو اٹھی ہو۔

پہلے پہل 1896 میں ہندوستان کے شہر بمبئی میں بیرون ممالک سے چھوٹی چھوٹی خاموش فلموں کی آمد شروع ہوئی اور 7 جولائی 1896 کو لومیئر برادرس نے بمبئی کے واٹسن ہوٹل میں 'میجک لائٹس' کے نام سے ایک چھوٹی سی فلم کی نمائش کی۔ اس طرح کی فلموں کو عوام نے اور تھیئٹر کے مالکوں نے بہت پسند کیا۔

طویل فیچر فلموں کے سلسلے کو ہندوستان میں شروع کرنے کا سہرا داداصاحب پھالکے کو جاتا ہے۔ انھوں نے 'لائف آف کرائسٹ' نام کی فلم سے متاثر ہوکر بڑی محنت سے فلم 'راجہ ہریش چندر' کو ہندوستان میں تیار کیا اور 1913 میں اس خاموش فلم کی نمائش کی۔ اس طرح ہندوستان میں خاموش فلموں کا سفر شروع ہوگیا۔

حالانکہ 1900 میں گرودیو رابندر ناتھ ٹیگور نے گراموفون پر پہلی بار خود اپنی ہی آواز میں......''بندے ماترم......'' گانا ریکارڈ کرایا تھا، مگر 1931ء میں ہندوستانی فلموں کو بھی باقاعدہ بولنا آگیا اور اردیشر ایرانی نے 1936 میں ہندوستان کی پہلی بولتی فلم 'عالم آرا' کی نمائش کی۔ یہی وہ دور تھا جب ہندوستان میں جنگِ آزادی کی تحریک بھی زوروں پر تھی۔

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ہندوستان کے نوجوان، آزادی کے متوالے پوری طرح انگریزوں کو ہندوستان سے بھگا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے اور گاندھی جی کی قیادت میں مکمل آزادی کی قرارداد پاس ہوچکی تھی، مگر ایسے وقت میں بھی ہماری فلموں میں آزادی کی تحریک کے اثرات کم دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو انگریز حکومت کی قائم کردہ پابندیاں اور ظلم وستم، جس کی وجہ سے کوئی بھی فلمساز ایسے موضوع کو اپنانے سے اپنا دامن بچاتا تھا، جس سے انگریز حکومت کے غضب کا خطرہ لاحق ہو۔

دُوسرے برٹش حکومت نے 1922 میں جو پریس سنسرشپ قانون بنایا تھا، اس کے دائرہ کار میں ہندوستانی سینما کو بھی جکڑ لیا تھا۔ جس کی وجہ سے اگر کوئی فلمساز جنگ آزادی کو موضوع بنا کر فلم بنا بھی لیتا تو اس کی نمائش پر پابندی لگ سکتی تھی۔ ایک اور خاص وجہ یہ تھی کہ اُس وقت تک ہندوستانی فلموں کا مزاج صرف دیومالائی یا جادوئی کہانیوں تک محدود تھا، اور لوگ اُسی کو پسند بھی کرتے تھے۔

خاموش فلموں کے دَور میں بھی بمبئی میں کئی لوگوں نے ہمت

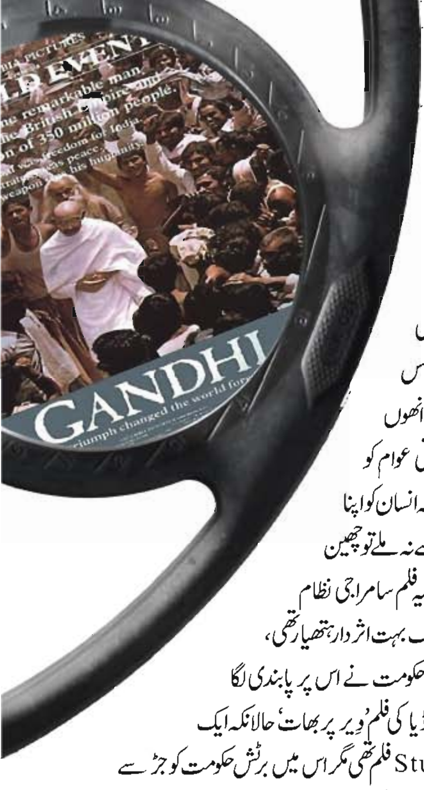

کر کے سیاسی مقاصد کو پس منظر میں رکھ کر کئی اہم فلمیں بنائیں، جو مقبول بھی ہوئیں۔ فلم 'کس کا قصور' بیوہ عورتوں کے مسائل پر بنائی گئی تھی۔ اس کے علاوہ 'گوری بالا' اور 'رام رحیم' میں سیاسی تحریک کو ایک خاص انداز میں پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی قومیت کا جذبہ اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے عنصر کو بھی ان فلموں میں شامل کیا گیا تھا۔ اُس دَور میں جنگ آزادی کی کامیابی اور مقبولیت کے لیے ملک میں ہندو مسلم اتحاد کی سخت ضرورت تھی اور اسی موضوع کو مرکزی خیال بناتے ہوئے لکشمی پکچرز نے 1925 میں 'سورن' نام سے ایک ایسی فلم کی نمائش کی جس میں مغل تاریخ کے ایک واقعہ کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد کا پیغام ہندوستانی عوام کو دیا گیا تھا۔

فلم 'دی بم' میں بھی انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر اکسایا گیا تھا۔ اس لیے برٹش سنسر اور بھی ہوشیار ہو گیا اور اس نے اس فلم کو بُری طرح کاٹ دیا تھا۔ وی شانتارام نے فلم 'اُودے کال' بھی ان ہی دنوں میں بنائی تھی۔ اس زمانے میں کوہِ نور اسٹوڈیو میں ایک خاص قسم کی ریلی کا اہتمام کر کے بھی فلم والوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا۔ اس کے بعد ہی 'انڈین فلم ایسوسی ایشن' کا قیام عمل میں آیا تھا، اور ایک دن کی مکمل علامتی ہڑتال بھی کی گئی تھی۔

اسی دوران ایک اور فلم 'غصہ' کی نمائش ہوئی۔ اس فلم میں ہندوستانی سماج کا پچھڑا پن دکھایا گیا تھا اور گاندھی جی کی طرح دکھائی دینے والا ایک کردار بھی اس فلم میں موجود تھا جسے مکند نام کے ایک اداکار نے ادا کیا تھا۔

1935-36 کے آتے آتے ملک بھر میں ہندوستانی فلموں کے دیکھنے والے سنجیدہ اور غور طلب موضوعات پر بننے والی فلموں کو دیکھنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ فلم بینوں کا یہ رویہ دوسری جنگ عظیم کے وقت تک اور پھر ہندوستان کی آزادی کی سنہری صبح کے آنے تک برقرار رہا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر فلم بین متوسط طبقے کے تھے، یا پھر اُونچی سوسائٹی کے لوگ تھے۔

فلمساز کے سی بروا نے روایت سے ہٹ کر اور کھلی

ملک کی آزادی کے ساتھ ہی فلم والوں کو بھی اپنی مرضی کے موضوعات پر فلم بنانے کی آزادی ملی... اور بڑی تیزی سے جنگ آزادی اور حب الوطنی کے موضوعات پر فلمیں بننے لگیں۔ وی شانتارام نے 1949 میں فلم 'اپنا دیش' بنائی۔ نتن بوس نے 1950 میں 'مشعل' بنائی۔ شیام مکھرجی نے 1950 میں ہی اشوک کمار کو لے کر فلم 'سنگرام' بنائی۔ 1952 میں فیمس پکچرز نے آر ایس چودھری کی ہدایت میں فلم 'جلیاں والا باغ' بنائی اور پھر 1953 میں منروا مووی ٹون کے بینر سے سہراب مودی نے فلم 'جھانسی کی رانی' پیش کی، جو بہت مقبول ہوئی۔ 1954 میں فلمستان نے 'جاگرتی' بنائی۔ 1954 میں ہی 'شہید اعظم بھگت سنگھ' کی نمائش ہوئی، جو مکمل طور پر جنگ آزادی پر مبنی فلم تھی۔

آزادانہ روش کے درمیان پھنسے انسانوں کے دَرد کو فلم 'منزل' اور فلم 'مایا' میں بڑے ہی پُراثر انداز میں پیش کیا۔ جس نے ہمارے فلم بینوں کے ذہن و دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دیوکی بوس نے 1936 میں فلم 'سنہر اسنسار' میں سماج کی نابرابری کے مسئلے کو پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی واڈیا کی فلم 'جے بھارت' اور وجے بھٹ کی 'پاسنگ شو' اور محبوب خان کی 'ڈکن کوئن' جیسی فلمیں بھی خاصی کامیاب رہیں۔ ان فلموں میں کسی نہ کسی طور پر دیش بھکتی اور جنگ آزادی کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔

1942 میں مشہور فلمساز و ہدایت کار محبوب خان نے ہی فلم 'روٹی' کی نمائش کی، جس کے ذریعے انھوں نے ہندوستانی عوام کو یہ پیغام دیا کہ انسان کو اپنا حق مانگنے سے نہ ملے تو چھین لینا چاہیے۔ یہ فلم سامراجی نظام کے خلاف ایک بہت اثر دار ہتھیار تھی، لہٰذا انگریزی حکومت نے اس پر پابندی لگا دی۔ ہومی واڈیا کی فلم 'ڈِیر پربھات' حالانکہ ایک اسٹنٹ Stunt فلم تھی مگر اس میں برٹش حکومت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی بات کو بڑے ہی پُراثر انداز اور سلیقے سے پیش کیا گیا تھا۔

1946 میں چیتن آنند نے فلم 'نیچا نگر' پیش کی۔ اس فلم میں انگریز حکومت کے ذریعے معصوم ہندوستانیوں پر ڈھائے گئے مظالم کی تصویر کشی بڑے خوبصورت انداز میں کی گئی تھی۔ اس فلم کی کہانی اردو کے ممتاز افسانہ نگار حیات اللہ انصاری نے تحریر کی تھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو کو یہ فلم اس قدر پسند آئی تھی کہ 1947 میں جب نئی دہلی میں پہلی ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی تو پنڈت نہرو کی خواہش کے مطابق یہ فلم کانفرنس کے ڈیلی گیٹس کو دکھائی گئی۔

اس زمانے میں انگریز حکومت کی سخت سنسر شپ کی وجہ سے بہت سی باتیں سیدھے طریقے سے نہ کہہ کر موضوعات کو بدل کر بھی کہی گئیں۔ مثال کے طور پر 1941 میں نمائش کے لیے دی۔ شانتارام کی فلم 'پڑوسی' ہندو مسلم ایکتا پر بنائی گئی تھی۔ فلم میں دِکھایا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان خاندان آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، مگر باہری طاقتیں اپنے مقاصد حاصل کرنے کی غرض سے اُنھیں آپس میں لڑا دیتے ہیں۔ دوست بچھڑ جاتے ہیں، بعد میں اُنھیں طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اُن کے پاس صرف یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اُن کا دوبارہ ملن تب ہوتا ہے، جب ایک باندھ کے ٹوٹنے کی وجہ سے وہ سب موت کی آغوش میں ہوتے ہیں۔

1943 میں ریلیز ہوئی فلم 'قسمت' بامبے ٹاکیز کی فلم تھی، جسے ایس مکھرجی کی ہدایت میں بنایا گیا تھا۔ حالانکہ یہ فلم جرائم کے واقعات پر مبنی ہلکی پھلکی مزاحیہ قسم کی فلم تھی، مگر اس فلم کا ایک گانا...... 'دور ہٹو اے دنیا والو، ہندوستان ہمارا ہے' نے بڑی شہرت

حاصل کی اور جنگ آزادی کے متوالوں کو جھومنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی حب الوطنی کا جذبہ بھی لوگوں میں بیدار ہوا۔ اس گیت کی ایک لائن...... 'تم نہ کسی کے آگے جھکنا، جرمن ہو یا جاپانی' ایک طرح سے انگریزوں کی طرف ہی اشارہ تھا، اور گاندھی جی کے نعرہ 'انگریزوں بھارت چھوڑو' کی ہی ترجمانی کرتا تھا۔ ان دنوں یہ گانا ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر تھا، جسے کوی پردیپ نے تحریر کیا تھا۔

اِسی طرح دوسرے فلمسازوں نے بھی انگریزی سنسر بورڈ کی پریشانیوں سے بچنے کے لیے ایسی حکایت آمیز اور دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں پر مبنی علامتی فلمیں بنائیں۔ حالانکہ ان کا مقصد لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔

1945 سے 1947 تک کا وقت ہندوستانی سینما کے لیے بے حد اہم رہا ہے۔ ایسے وقت میں جب دوسری جنگ عظیم ختم ہو رہی تھی اور ہندوستان کو آزادی ملنے ہی والی تھی، ہر طرح کے فن کے میدان میں تبدیلی کی لہریں نمایاں ہونے لگی تھیں۔ ہماری فلموں نے بھی ایسے ماحول میں کروٹ لی اور کچھ لوگوں نے ہمت کر کے خاص طرح سے جنگ آزادی کو موضوع بنا کر فلمیں بنانے کا ارادہ کر لیا۔ اُدھر بنگال میں بھی نوجوانوں میں ایک خاص طرح کی لہر چل رہی تھی۔ تب وہاں بی این سرکار نے 1938 میں 'ساتھی' فلم بنائی۔ 1946 میں ریلیز کی گئی فلم 'ہم ایک ہیں' کی کہانی بھی پوری طرح قومی ایکتا کے دھاگے میں پروئی ہوئی تھی، اور جس کے اہم کرداروں میں دیو آنند، گرودت اور کملا کوٹنس تھے۔ سدا بہار اداکار دیو آنند کی یہ پہلی فلم تھی۔

بائیں بازو کے ہی چند دانشور قسم کے افراد نے 1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی داغ بیل ڈالی اور منشی پریم چند کی صدارت میں لکھنؤ میں ایک کامیاب کانفرنس کر کے اُردو اور ہندی ادب میں ایک نئی طرز کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس تحریک نے ہندوستانی سنیما کو بہت سے کہانی کار، ہدایت کار، نغمہ نگار، موسیقار اور اداکار دیے۔ اُس زمانے میں روایت سے ہٹ کر بننے والی فلموں کے موضوعات بائیں بازو کی تحریک سے متاثر ہونے لگے، کیونکہ ان کے لکھنے والے زیادہ تر ادیب اور شاعر اسی تحریک سے وابستہ تھے۔ اس طرح کی تحریک کو اپٹا Indian People's Theater Association سے بھی کافی مدد ملی، اور اس تحریک کا جذبہ فلموں پر حاوی ہوتا گیا۔

دیکھا جائے تو جنگ آزادی کو موضوع بنا کر ہندوستان کی آزادی سے پہلے کوئی بہت زیادہ کام نہیں ہو سکا تھا۔ 29 اگست 1918 کو لوک مانیہ تلک نے خاص طور پر کانگریس کا اجلاس بمبئی میں بلایا تھا۔ اس وقت بابوراؤ پینٹر نے اپنے دو معاونوں داملے اور فتح لعل کو ساتھ لے کر اس اجلاس کی فلم بندی کی تھی۔ مگر یہ فلم اُس وقت کہیں پر بھی دکھائی نہ جا سکی تھی، اور جب 1920 میں بابوراؤ پینٹر ہی کی فلم 'سیرندھری' کی بمبئی کے میجسٹک سینما میں نمائش ہوئی، تب اس فلم کو بھی 'سیرندھری' کے ساتھ ہی جوڑ کر دکھایا گیا تھا۔ اتفاق سے فلم کی نمائش سے قبل ہی یکم اگست 1920 کو بال گنگادھر تلک کا انتقال ہو گیا، لہٰذا وہ خود یہ فلم نہ دیکھ سکے۔

1935 میں ایسٹرن کمپنی نے فلم 'بھارت کی بیٹی' بنائی تھی۔ اس کی ہدایت پریمانکور آترتھی نے کی تھی اور کہانی کے ایل ورمانی کی تھی۔ اس فلم میں بھی ہندوستان کی آزادی کی بات کو اُٹھایا گیا تھا۔ 1938 میں محبوب خان نے 'وطن' نام سے ایک فلم بنائی تھی، جو حب الوطنی پر مبنی کچھ باتوں کو لے کر پیش کی گئی تھی۔

ملک کی آزادی کے ساتھ ہی فلم والوں کو بھی اپنی مرضی کے موضوعات پر فلم بنانے کی آزادی ملی......اور بڑی تیزی سے جنگ آزادی اور حب الوطنی کے موضوعات پر فلمیں بننے لگیں۔ وی شانتارام نے 1949 میں فلم 'اپنا دیش' بنائی۔ نتن بوس نے 1950 میں 'مشعل' بنائی۔ شیام مکھر جی نے 1950 میں ہی اشوک کمار کو لے کر فلم 'سنگرام' بنائی۔ 1952 میں فیمس پکچرز نے آر ایس چودھری کی ہدایت میں فلم 'جلیاں والا باغ' بنائی اور پھر 1953 میں منروا مووی ٹون کے بینر سے سہراب مودی نے فلم 'جھانسی کی رانی' پیش کی، جو بہت مقبول ہوئی۔ 1954 میں فلمستان نے 'جاگرتی' بنائی۔ 1954 میں ہی 'شہیدِ اعظم بھگت سنگھ' کی نمائش ہوئی، جو مکمل طور پر جنگ آزادی پر مبنی فلم تھی۔

اس سلسلے کی سب سے مشہور اور بہترین فلم 'شہید' کی 1948 میں نمائش جس نے ہندوستانی عوام کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ بھر دیا تھا۔ فلمستان کی اس فلم کے خالق رمیش سہگل تھے اور دلیپ کمار کی ہیروئن کامنی کوشل تھیں۔ چندر موہن، لیلا چٹنس اور رام سنگھ نے بھی اس فلم میں اہم رول ادا کیے تھے۔ فلم کے مکالمے اور کہانی کی بُنت نے ہندوستانی عوام کے سینوں میں ایک جوش بھر دیا تھا۔ اسی نام سے ایک دوسری فلم 1965 میں بھی بنی جو شہیدِ اعظم بھگت سنگھ کی زندگی پر مبنی تھی۔ اس دوسری فلم 'شہید' میں مرکزی کرداروں میں منوج کمار کے ساتھ اور کئی نامور اداکار اور اداکارائیں تھیں، اور یہ فلم بھی کافی مقبول ہوئی تھی۔ 1965 میں ہی آئی ایس جوہر نے ایک فلم 'جوہر محمود اِن گوا' بنائی تھی۔ یہ فلم بھی جنگِ آزادی کے موضوع پر ہی بنی تھی، مگر اس فلم میں خاص طور پر گوا کی آزادی کو ہی موضوع بنایا گیا تھا۔ 1981 میں ریلیز ہوئی منوج کمار کی فلم 'کرانتی' بھی جنگ آزادی کے ہی موضوع پر ایک بڑی فلم تھی اور اس میں دلیپ کمار نے بھی ایک اہم رول ادا کیا تھا۔ یہ فلم بھی کافی کامیاب ہوئی تھی۔

ان سب فلموں کے علاوہ بھی کئی فلمیں ایسی آئیں، جن میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے کچھ حصے فلمائے گئے تھے، یا کہانی میں اُس دور کے چند واقعات پیش کیے گئے تھے۔ اس کے باوجود اتنے بڑے ملک کی آزادی کی اتنی بڑی تحریک پر جو کام دنیا کی سب سے بڑی ہماری فلم انڈسٹری میں ہونا چاہیے تھا، میرے خیال سے وہ نہیں ہو پایا ہے۔ آزادی سے قبل تو انگریز حکومت کا سنسر بورڈ آڑے آتا رہا، مگر اب اس سلسلے میں ضرور کوئی ایسا کام ہونا چاہیے جس سے ملک کا وقار اونچا ہو۔ آزادی کے اس موضوع پر سب سے بڑی فلم 'گاندھی' کو ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس فلم میں بڑے پیمانے پر گاندھی جی کی زندگی اور اس وقت کے حالات کی عکاسی ہوئی ہے۔ مگر یہ فلم مکمل طور پر ہندوستانی فلم نہیں کہی جا سکتی۔ کیا اس طرح کی کسی بڑی فلم کی اُمید ہم ہندوستانی سنیما سے بھی کر سکتے ہیں؟

■

Anees Amrohvi, 54-C, First Floor, St. No. - 05, J - Extension, Laxmi Nagar, Delhi - 110092, Mob.: 9811612373
Email:- qissey@rediffmail.com

جاگو گراہک جاگو

خالص استعمال کریں مطمئن رہیں

کھانے کی چیزوں میں ملاوٹ کا پتہ لگانے کے طریقے

نمبر شمار	کھانے کی چیزیں	ملاوٹ	جانچ/ پتہ لگانے کا طریقہ
.1	نباتاتی تیل	ارنڈی کا تیل	صاف سوکھی ٹیسٹ ٹیوب میں 1 ملی لیٹر تیل لیں۔ اس میں 10 ملی لیٹر ایسڈ فائڈ پٹرول ڈالیں۔ دو منٹ تک تیزی سے ہلائیں۔ امونیہ مولبڈیٹ ریجنٹ کی ایک بوند ملائیں۔ نمونے میں گدلا پن ارنڈی کے تیل کی موجودگی کو بتاتا ہے۔
		آرجی مون تیل	نمونے کی 5 ملی لیٹر مقدار میں 5 ملی لیٹر مرکوز نائٹرک ایسڈ (HNO_3) ملا کر ہلائیں۔ پیلے اور سنتری رنگ کو الگ الگ ہونے دیں۔ ایسڈ کی نچلی پرت میں کرمسن رنگ ملاوٹ کو ظاہر کرتا ہے۔
.2	گیہوں کا آٹا	ضرورت سے زیادہ ریت اور دھول	نمونے کی تھوڑی مقدار کے ساتھ قریب 10 ملی لیٹر کاربن ٹیٹرا کلورائڈ (CCl_4) ملا کر ہلائیں اور اسے بے حرکت رہنے دیں۔ کنکڑ اور ریت نیچے جمع ہو جائیں گے۔
		ضرورت سے زیادہ بھوسی	پانی کی سطح پر چھڑکیں۔ بھوسا پانی میں تیرنے لگے گا۔
		چاک پاؤڈر	پتلا ہائڈروکلورک ایسڈ (HCl) نمونے میں ملا کر ہلائیں۔ بلبلے اٹھنا چاک پاؤڈر کی موجودگی کو بتاتا ہے۔
.3	اناج	چھپے ہوئے کیڑے انفیکشن	ننہائڈرین ریجنٹ (الکحل 1%) سے گیلا کیا ہوا ایک فلٹر پیپر لیں۔ کچھ دانے اس کے اوپر ڈالیں اور فلٹر پیپر کو موڑ دیں اور ہتھوڑے سے دانے کو توڑیں۔ نیلا جامنی رنگ چھپے ہوئے کیڑوں کی موجودگی کو بتاتا ہے۔

DAVP 08101/13/0014/1516

امور صارفین کے سلسلے میں کسی مدد/ وضاحت کے لیے نیشنل کنزیومر ہیلپ لائن کو فون کریں
1800-11-4000 (Toll Free)
آپ www.nationalconsumerhelpline.in اور
www.core.nic.in (ٹول فری نمبر 1800-11-456)
پر اپنی شکایات بھی درج کرا سکتے ہیں۔
گمراہ کن اشتہارات کے بارے میں اپنی شکایات درج کرانے کے لیے
www.gama.gov.in پر لاگ اِن کریں۔

عوامی مفاد میں جاری کردہ
وزارت برائے امورِ صارفین، خوراک و عوامی تقسیم
شعبۂ امور صارفین، حکومت ہند، بھارت سرکار
کرشی بھون، نئی دہلی 110001
ویب سائٹ: www.consumeraffairs.nic.in

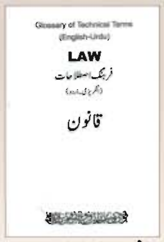

قانون (فرہنگ اصطلاحات)

مصنف: ادارہ
صفحات: 440، قیمت: 136 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عابد انور، ڈی 64 فلیٹ نمبر 10، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

انسان جوں جوں ترقی کرتا ہے اس کے علوم وفنون میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور جب علوم وفنون میں اضافہ ہوتا ہے تو نئے الفاظ، استعارات، تشبیہات، ٹرمنالوجی ان کے سامنے آتے ہیں۔ ترجمہ نگاری کا کام کرنے والے افراد خواہ وہ یونیورسٹی کے اساتذہ ہوں صحافت سے وابستہ ترجمہ نگار ہوں یا دیگر شعبہ حیات سے، انہیں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ کبھی کبھی اس زبان کا صحیح ترجمہ نہیں ہو پاتا۔

ایک طویل عرصے تک مترجمین کو کافی دشواریاں تھیں اور وہ الفاظ، محاورات اور تراکیب کے صحیح مفہوم تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ابتدا سے ہی اس کام کا بیڑا اٹھایا اس طرح کے الفاظ و استعمارات والی کتابوں کو ماہرین سے ترجمہ کرایا جس میں زیرتبصرہ کتاب ’قانون‘ بھی ہے۔ جس کا اردو ترجمہ مشہور ماہر قانون اور لا کے پروفیسر طاہر محمود کی نگرانی میں انجام دیا گیا ہے۔ جنہیں اردو انگریزی پر عبور کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں پر بھی ادراک حاصل ہے۔

زیرتبصرہ کتاب قانون (فرہنگ اصطلاحات) میں انھوں نے بامحاورہ اور مروجہ زبان میں ترجمہ کرانے کی کوشش کی ہے کیوں کہ یہ کتاب قانونی اصطلاحات کا مجموعہ ہے اور پروفیسر طاہر محمود اس میدان کے شہ سوار ہیں۔ انھوں نے ’پس منظر‘ کے تحت لکھا ہے کہ ’’کسی زمانے میں ملک میں قانون و عدلیہ کی زبان اردو ہوا کرتی تھی اور اردو کی قانونی اصطلاحات زبان زد عوام وخواص تھیں۔ اہم قوانین سرکاری طور پر انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی مہیا کرائے جاتے تھے جن میں تعزیرات ہند، ضابطہ دیوانی، ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت ممتاز تھے۔ آگے چل کر وقت نے کروٹ بدلی اور اردو زبان عدالتوں سے آہستہ آہستہ خارج ہونے لگی۔ لیکن یہ اخراج زیادہ تر رسم الخط محدود رہا ہے ورنہ جرح، بحث، گواہی، پیشی، فیصلہ، بیان، وکیل، ملزم اور سزا جیسے بے شمار اردو کے الفاظ ہندی حروف میں لکھی جانے والی عدالتی زبان میں آج بھی مروج ہیں۔ اعلی عدالتوں اور لا کالجوں میں قانونی کارروائیوں اور قانون کی درس و تدریس کی زبان پہلے بھی انگریزی تھی اور عموماً اب بھی ہے‘‘۔ بدلتے حالات کے پیش نظر اس قانونی فرہنگ اصطلاحات کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیوں کہ اس وقت بیشتر شعبوں، انتظامیہ، عدلیہ اور مقنّنہ میں انگریزی یا ہندی زبان کا دبدبہ ہے اور انگریزی زبان میں جو اصطلاحات لکھے جاتے ہیں اس کا سمجھنا تھوڑا مشکل ہوتا ہے اور قانون سے متعلق جو چیزیں ہندی میں دستیاب ہیں وہ اتنے مشکل ہوتے ہیں بیشتر ہندی داں بھی اسے نہیں سمجھ پاتے کیوں کہ سنسکرت میں ملفوف ہوتے ہیں۔ یہ اردو کے اساتذہ، صحافی، وکلاء اور ججوں کو ترجمانی کی فرائض منصبی ادا کرنے میں مدد دے گی۔

زیرتبصرہ کتاب میں قوانین کے علاوہ دفتری اصطلاحات، پارلیمنٹ کی کارروائی کے اصطلاحات، سرکاری کارروائی کے انگریزی اصطلاحات کا آسان اور عام فہم ترجمہ کیا گیا ہے۔عوام کی پسند (Public Taste)، نیم حکیم (Quack)، امر واقعہ (Question Of Fact) پالیسی کا مسئلہ (Question Of Policy)، ناواجب تاخیر (Undue Delay)، لگان دار (Tenure Holder)، ملکی سمندر (Territorial Water) وغیرہ الفاظ دئے گئے ہیں۔غرضیکہ سماجی، انسانی حقوق، پارلیمنٹ میں اپنائے جانے والی ٹرمنالوجی اور آئینی اصطلاحات کے ترجمے دئے گئے ہیں۔اس سے اردو داں کو قانون، انسانی حقوق کے بارے میں اصطلاحات اور دیگر شعبوں سے متعلق اصطلاحات کو شامل کتاب کیا گیا ہے۔ آج انسانوں کو معلومات کی کمی وجہ سے بہت سی پریشانیاں درآتی ہیں اور حق پر رہتے ہوئے بھی اپنا دفاع نہیں کر پاتا جس کی وجہ سے وہ بلاوجہ قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ کتاب ان کے معاون ثابت ہوگی اور اپنی مافی الضمیر کو ادا کرنے میں بھی آسانی ہوگی۔

ڈاکٹر طاہر محمود کی قانون سے متعلق کئی کتابیں آچکی ہیں اور وہ اس میدان میں بہت ہی ماہر مانے جاتے ہیں۔اس لیے انھوں نے اس وقت مستعمل الفاظ اور اصطلاحات ومحاورات کا خیال رکھا ہے۔ زیرتبصرہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔جن میں اصطلاحات قانون، لاطینی مقولے، الفاظ و اصطلاحات، آئینی اصطلاحات، انسانی حقوق سے متعلق اصطلاحات، پارلیمانی اصطلاحات اور مرکزی قوانین شامل ہیں۔

یہ کتاب ہر اردو داں، اردو اساتذہ، وکلاء، ماہر قانون، ترجمہ نگار اور صحافیوں کے پاس ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ ایسی کتاب ہے کہ جس میں عام فہم الفاظ میں تمام اصطلاحات دی گئی ہیں۔اس کتاب کے مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوسکے گا کہ ہمیں ترجمہ کرتے وقت کون سے الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔

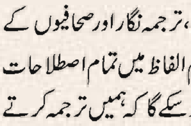

عربی ادب کی تاریخ [جلد اول وسوم]

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: جلد اول: 371، جلد سوم: 695
قیمت: جلد اول: 112 جلد سوم: 178 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان؛ نئی دہلی
مبصر: جابر زماں، جے این یو، نئی دہلی

عبدالحلیم ندوی کی زیرتبصرہ کتاب کی پہلی جلد ’عہد جاہلیت‘ پر مشتمل ہے۔ مصنف نے کتاب میں جلد اول کو ایک مقدمہ اور چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ کتاب کا مقدمہ اردو میں ’تاریخ ادب عربی‘ کی ضرورت و اہمیت سے متعلق ہے۔اس کے پہلے اور دوسرے باب میں عرب قوم کا تاریخی پس منظر اور عربی زبان کی تشکیلی کہانی مذکور ہے۔ مصنف نے مختلف حوالوں سے تاریخی اور ثقافتی نقوش کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن یہاں ان کا کردار صرف راوی کا ہے۔ ادبی ناقد اور مورخ کا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ واقعات

کے بیان میں تحقیقی روش اور تنقیدی نظریہ اختیار کرے۔

مصنف نے دورِ جاہلیت کے نثری اقسام پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ضروری حوالات واقتباسات سے انھیں مزین کرنے کی کوشش کی ہے۔

چوتھے باب میں عربی شاعری کے تشکیلی مراحل اور اس کے ثقافتی سیاق کو خصوصیت کے ساتھ اجالنے کی کوشش کی ہے۔اس کے مختلف ذیلی حصے ہیں۔آغاز میں شاعری کی تعریف اور شعر کی اقسام پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔اس ضمن میں غزل، فخر وحماسہ، مدح، مرثیہ اور ہجو وغیرہ کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔اس حوالے سے صمہ بن عبداللہ قریشی، حسین بن مطیر اسدی، عمرو بن کلثوم، قریط بن انیف وغیرہ کے شعری متون کا مختلف حوالوں سے تجزیہ کیا گیا ہے۔

زمانۂ جاہلی میں بہتیرے شعرا نے نام پیدا کیا لیکن ان میں سے اکثر کا کلام ضائع ہوگیا۔عربی کے اولین شعرا میں مہلہل بن ربیعہ کا ذکر ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ 'معلقات' کے سب سے مشہور شاعر امراؤالقیس کا ماموں تھا۔شراب وشباب کی تعریف اور معرکۂ کارزار کی منظر کشی میں اسے امتیاز حاصل تھا۔مصنف نے جاہلی شاعری کو چار عناوین اصحاب معلقات، اصحاب جمہرات، اصحاب منتقیات اور صعالیک میں تقسیم کیا ہے۔'اصحاب معلقات' کو جاہلی شعرا میں خاص اہمیت حاصل ہے۔اس سے وہ شاعر مراد ہیں جن کے قصیدے خانہ کعبہ میں لٹکائے گئے۔ایسے شعرا میں امراؤ القیس، نابغہ ذبیانی، زہیر بن ابی سلمٰی، عنترہ بن شداد عبسی، اعشیٰ قیس، طرفہ بن العبد، عمرو بن کلثوم اور لبید بن ربیعہ کا شمار ہوتا ہے۔ مصنف نے ان شعرا کے تاریخی پس منظر اور ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ مصنف نے معلقات کے بعد 'اصحاب جمہرات' کے شاعروں کو موضوع بحث بنایا ہے۔اس حوالے سے عبید ابن ابرص اور امیہ بن ابی الصلت کی شاعری پر گفتگو کی گئی ہے۔منتقیات کے تحت مرقش اکبر اور علقمۃ الفحل کے شعری متون پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔اس باب کا آخری حصہ صعالیک [خانماں برباد] شعرا پر مشتمل ہے۔ایسے شاعروں میں عمرو بن مالک ازدی شنفری کو ہیرو کی حیثیت حاصل تھی۔اس کے علاوہ 'تابط شرا' کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی تیسری جلد میں بنوامیہ کے عہد میں عربی زبان وادب کی ترقی کو موضوع بنایا گیا ہے۔اسے بھی ایک مقدمہ اور بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے اور دوسرے ابواب میں گفتگو اور خطابت کے حوالے سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔اس ضمن میں طارق بن زیاد، زیاد ابن ابیہ، حجاج بن یوسف، سحبان وائل اور احنف بن قیس کی تقاریر کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔تیسرا باب مذہبی تقاریر کے لیے وقف ہے۔اس ضمن میں حسن بصری کا خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے۔چوتھے باب میں دفتری اور سیاسی خطوط نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب میں مصنف نے مورخ کے بجائے تذکرہ نگار اور راوی کا کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے بعض مقامات پر اختصار اور بعض جگہ طوالت کا احساس ہوتا ہے۔ ہندوستان کے بہت سے جامعات میں عربی زبان وادب کے شعبے قائم ہیں۔اس کے علاوہ مدارس میں بھی عربی ادب کی تعلیم کا انتظام ہے۔ جامعات سے منسلک اساتذہ کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ عربی زبان وادب کو عرب مصنف/ ناقد جس پس منظر میں دیکھتا ہے؛ اس کے بارے میں ہندوستان میں رہنے والوں کی رائے بھی وہی ہوگی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ عجمی مصنّفین اپنے تحفظات کا برملا اظہار کرنے میں ہچکچاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ عربی زبان وادب پر اردو میں جو بھی تصانیف سامنے آئی ہیں وہ کہیں نہ کہیں عربی کتابوں کا ترجمہ یا چربہ ہیں۔بعض نے برملا اس کا اقرار کیا ہے تو بعض نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ مجموعی طور پر یہ دونوں جلدیں اپنے موضوع پر متوسط درجے کی تصنیف ہیں۔ جو درسی ضروریات کے پیش نظر مرتب کی گئی ہیں۔اس لیے طلبہ کی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مصنف نے تمام مباحث کو آسان زبان اور سلیس اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔طلبہ کے درمیان بھی یہ کتاب شروع سے مقبول رہی ہے۔اس کا ثبوت اس کے مختلف ایڈیشن ہیں۔پہلی مرتبہ یہ کتاب 1979 میں شائع ہوئی تھی اور 2014 میں کونسل نے اس کا چھٹاں ایڈیشن شائع کیا ہے۔اس ایڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے از سر نو کمپوز کرا کے دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ہاں نئی کمپوزنگ میں بہت سے مقامات پر پروف کی خامیاں در آئی ہیں۔ایک بات اور کہ یہ کتاب 'حوالہ جاتی' کتابوں کے دائرے میں آتی ہے۔قومی کونسل کو چاہیے کہ آئندہ ایڈیشن میں انڈکس شامل کرے۔نیز مصنف نے جن کتابوں کا حوالہ حواشی میں درج کیا ہے؛ اسے بھی مرتب کر کے کتاب کے آخر میں شامل کر دیا جائے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگا۔اسی طرح فہرست میں عناوین اور ذیلی عناوین کے مابین کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا؛ اس جانب بھی توجہ دینی چاہیے۔امید کہ یہ کتاب مزید مقبولیت وشہرت کے مراحل طے کرے گی۔

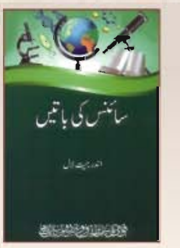

سائنس کی باتیں

مصنف: اندر جیت لال

صفحات: 111، قیمت: 25 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ریحان سعید، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ

موجودہ زمانہ سائنس اور ٹکنالوجی کا زمانہ ہے۔ آج کا انسان سائنس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کرسکتا۔ ہماری زندگی میں سائنس جزو لاینفک کی حیثیت سے داخل ہوچکی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں ہم نت نئے انکشافات وایجادات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اس سے حتی المقدور استفادہ بھی کرتے ہیں۔ ان ایجادات کو سمجھنے کی ایک کڑی زیر نظر کتاب 'سائنس کی باتیں' بھی ہے۔کتاب کے مصنف اندر جیت لال صاحب ہیں۔ جو معلوماتی سائنس کے ایک جانے پہچانے ادیب وصحافی ہیں۔ انھوں نے معلوماتی سائنس پر کئی ایک کتابیں لکھیں اور انعامات سے سرفراز ہوئے۔ مصنف اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور پنجابی میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں آج کی سائنس، نیا ہندستان، ہمارے سائنس داں، سائنس اور ہندستان، نغمۂ روح اور ایٹم کی کہانی وغیرہ اردو میں ہیں۔ جب کہ کینڈل سموک (غالب کی حیات اور شاعری) اے شارٹ بائیوگرافی آف مرزا غالب (انگریزی) گیہوں کی کہانی (ہندی) اور اج دی سائنس (پنجابی) میں ہیں۔ اکثر کتابوں میں مصنف نے سائنس کے اسرار ورموز سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

زیر نظر کتاب میں جملہ مضامین کی تعداد گیارہ ہے۔ پہلا مضمون 'سائنس کیا ہے' میں مصنف نے سائنس کے اصل معنی ومفہوم سے آگاہ کیا ہے۔ یہ بات بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کوئی بھی ایجاد کسی ایک آدمی کی کوشش سے وقوع پذیر نہیں ہوتی بلکہ اس میں کئی آدمیوں کی کوششیں شامل ہوتی ہیں۔ دوسرا مضمون 'ایٹم اور ایٹمی توانائی' میں مادہ اور توانائی کو ایک ہی مانا ہے۔ ایٹمی توانائی کو رحمت وزحمت کا باعث بتا کر اس کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ الفا، بیٹا اور گاما شعاعوں کی اہمیت کو نہایت حسن وخوبی سے بیان کیا ہے۔ تیسرا مضمون 'راڈار: فضائی نقل وحمل کا آلہ' ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے راڈار کی گوناگوں خصوصیات کا احاطہ کرتے ہوئے ایک مختصر مضمون میں بہت ساری چیزوں کو سمیٹ دیا ہے۔ نیز راڈار کس طرح سے گونج کے اصولوں پر مبنی طریقۂ کار جہازوں، موسموں اور نشریاتی خبروں کے اصولوں کو پیش کرتا ہے۔ چوتھا مضمون 'کرۂ زمین پر زندگی کیسے پیدا ہوئی؟' میں مصنف نے برسہا برس کے قدیم اصولوں اور مختلف نظریات وعقائد کو پیش نظر رکھ کر جدید دور کے خیالات ونظریات کی روشنی میں ایک مثبت بات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیق وجستجو کو بھی باقی رکھا ہے۔ 'موسم کے بارے میں' پانچواں مضمون ہے۔

مضمون میں موسم کے بننے بگڑنے اور تغیرات میں کون کون سے اجزا اہم رول ادا کرتے ہیں، ان سب کا ایک سرسری مگر جامع اصول پیش کیا ہے۔ چھٹا مضمون 'چاند کی

دنیا' ہے۔ چاند شروع سے ہی انسان کی دل چسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس مضمون میں چاند کی حقیقت سے قاری کو آگاہ کیا ہے۔ زمین سے چاند تک کا خلائی سفر انسان کے لیے شوق و جستجو کا غماز ہے۔ مصنف نے اپنے ساتویں مضمون 'بجلی: ایک کمال ایک حقیقت' میں بجلی کو سائنس کے خاص الخاص کمالوں میں سے ایک بتایا ہے جو بجا ہے۔ بجلی سے متعلقہ مختلف ناموں کو سائنس دانوں کے ناموں پر رکھا گیا ہے۔ آٹھواں مضمون 'ریڈیم کی کہانی' ہے۔ اس مضمون میں ریڈیم کی دریافت، اہمیت اور اس کا کم مقدار میں ملنا نیز اس کی قیمت سونے سے زیادہ جیسی حیران کن باتوں سے آگاہ کیا ہے۔ اپنے نویں مضمون 'آواز و تصویر کا ایک کرشمہ' میں مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے سائنسی ایجادات نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ کو دل چسپ بنایا ہے۔ دسواں مضمون 'زندگی میں سائنس' ہے۔ اس مضمون میں انسانی زندگی میں سائنس کا استعمال کتنی برق رفتاری سے ہو رہا ہے نیز روز بروز ہم اس میں اضافے سے مستفید ہو رہے ہیں۔ آخری مضمون 'کائنات: بدلتے ہوئے نظریات' ہے۔ اس مضمون میں کائنات کے متعلق شروع سے موجودہ دور تک کے مختلف نظریات و خیالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قدیم نظریات و خیالات جدید دور کے نظریات و خیالات سے کس قدر غیر مشترک تھے۔

کتاب اپنے موضوع و مواد کے اعتبار سے قابل تحسین اور سرورق جاذب نظر ہے۔ کتاب کی اہمیت اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کی پہلی اشاعت 1982 میں ہوئی تھی اور یہ پانچویں اشاعت 2014 میں آپ کے سامنے ہے۔ کونسل نے یہ کتاب بچوں کے لیے شائع کی ہے۔ محض 111 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت صرف 25 روپے ہے۔ یہ کتاب نہایت معلوماتی، عام فہم زبان اور دل چسپ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ اس کتاب سے چھوٹے بڑے یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ پروف کی غلطیاں نا کے برابر ہیں۔ اگر کونسل اس کتاب کی جدید کمپوزنگ کرائے تو اس کی خوب صورتی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

پاکستان (ادب کے آئینے میں)

مرتب: شموئل احمد

صفحات: 380، قیمت: 450 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: راشد جمال فارقی، C-1452، آئی ڈی پی ایل ٹاؤن شپ ویربھدر (رشی کیش)، ضلع دہرہ دون 249202 (اتراکھنڈ)

مستند، مستحکم اور معتبر فکشن نگار شموئل احمد نے ایک انتہائی اہم اور خوبصورت کتاب ترتیب دی ہے۔ 'پاکستان (ادب کے آئینے میں)' کتاب کا پیش لفظ اس قدر جامع اور دلچسپ ہے کہ قاری کو گرفت سے آزاد نہیں ہونے دے گا۔ پاکستان شروع ہی سے تاریخی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی شناخت کے لیے بے چین ہے۔ اس ملک میں جمہوریت کے لیے فضا کبھی سازگار نہ ہو سکی۔ معاشرتی جبر کی متعدد صورتیں بلکہ کریہہ صورتیں روز ابھر آتی ہیں نتیجتاً غریب کسان عورت مختارن بائی کے ساتھ ریپ کیا جاتا ہے۔ جرگا انصاف کرتا ہے جو مختارن کو قبول نہیں اور وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ ہرجانے کی رقم سے غریب بچوں کا اسکول کھولتی ہے۔ شموئل احمد نے اپنی یہ کتاب اسی مختارن بائی کے نام منسوب کی ہے جو احتجاج کا استعارہ ہے۔

پیش لفظ کے بعد فہمیدہ ریاض کی نظم 'نیا بھارت' سبق آموز ہے کہ جس مذہبی شدت پسندی نے پاکستان کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے وہی راہ نیا بھارت بھی اپناتا جا رہا ہے۔ مذہب کی اجارہ داری اور فرقہ پرستی کی آگ سے بچنے کی صلاح دیتی ہوئی یہ نظم طنز کی کاٹ اور شعری حسن کا امتزاج ہے۔ آغا ظفر حسنین کی معروف کتاب 'مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری' سے ماخوذ ان کا مضمون 'پاکستانی سماج کی عصری صورتِ حال اور جبر' چشم کشا، معلوماتی اور عبرت ناک ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا مزاحیہ مضمون 'روزنِ دیوار سے' متعدد لطائف کے وسیلے سے پاکستانی معاشرے کی نقاب اتارتا ہے مثلاً ایک صاحب جو ٹرین میں سفر کرتے تھے ایک اسٹیشن پر ان کا بیٹا کسی کام سے نیچے اترا اور گاڑی چل پڑی جب انھوں نے اس کے نام اسلام سے اسے آواز لگائیں تو پلیٹ فارم پر کھڑی بھیڑ نے زندہ باد، زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ ٹرین آگے نکل گئی اور بے چارہ اسلام جذباتی مسلمانوں کے ہجوم میں کہیں گم ہو کر رہ گیا۔ 'کہنہ روایات اور پاکستانی شاعرات' میں نسیم سید نے پاکستان تانیثی شاعری کے بولڈ ہوتے ہوئے لہجے کو مثالوں سے سمجھایا ہے۔ طاہر مسعود اور جمیل جالبی کی گفتگو پاکستان کے ادب پر وہاں کے تہذیبی بحران کا اثر تلاش کرتی ہے تو قمر سبزواری کا مضمون اس اس تہذیبی بحران کے بطن سے پیدا شدہ اردو افسانے کی پڑتال کر رہا ہے۔ خالد اشرف نے پاکستان کے چند احتجاجی ناولوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اقتباسات کی موجودگی سے یہ مقالہ پاکستان کے ناول نگاروں کے شدید احتجاجی رویوں کا لیکھا جوکھا پیش کرتا ہے۔ غالب نشتر نے ساٹھ کی دہائی کے پاکستانی اردو افسانے کی تفصیلی بحث کی ہے اور فرداً فرداً افسانہ نویسوں پر خیال آرائی کی گئی ہے۔ ابرار احمد نے اپنے مضمون 'مزاحمتی ادب' میں پاکستان کے ادبا اور شعرا کے اندرون میں دہکتے ہوئے آتش فشاں دکھائے ہیں۔

کتاب کے آخری حصے میں اہم افسانوں کی شمولیت نے اس کتاب کی انفرادیت میں مزید اضافہ کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا افسانہ 'بین' انتہائی درد انگیز ہے۔ حمید کاشمیری کا افسانہ 'انقلابی' دہشت گردی کے ماحول میں پاکستان کی نوجوان نسل کی سائیکی بیان کرتا ہے۔ اے حمید کا افسانہ 'پھول گرتے ہیں' جنگ کے پس منظر میں رومانیت کی خوشبو اڑاتا ہے۔ رشید امجد کا افسانہ 'بگل والا' تاریخ کے تسلسل میں اپنے عصر کی شناخت کے لیے سرگرداں ہے۔ پوکھرن نیوکلیر دھماکے سے متعلق انتظار حسین کا افسانہ 'مورنامہ' سب کو پسند آئے گا۔ گلزار جاوید کی کہانی 'شبھ چنتک' تقسیم سے پیدا شدہ حالات میں انسان دوستی کا درس دیتی ہے۔ احمد داؤد کی کہانی 'وہسکی اور پرندے کا گوشت' دہشت پسندوں کی مرغوب غذا کے بہانے ان کی بربریت کی عکاسی کرتی ہے۔ 'گودھرا کیمپ' (نعیم آروی) بنگالیوں اور مغربی پاکستانیوں کے درمیان نفرت اور شیخی کا اظہار کرتی ہوئی کہانی ہے۔ غرض یہ کہانیاں پاکستانی افسانہ نگاروں کی شاہ کار تخلیقات ہیں جو فن پر ان کی دسترس کے علاوہ ذمے دار افسانہ نویسی کا ثبوت بھی ہیں۔

معاشرتی، مذہبی اور فوجی جبر و استحصال کے خلاف پاکستانی خواتین افسانہ نگار بھی صف آرا نظر آتی ہیں۔ اس کتاب میں نسیم سید کی کہانی 'چراغ آفریدم' اور شاہینہ کاظمی کی کہانی 'برزخ' باغی خواتین افسانہ نگاروں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ پاکستانی عورت جس عذاب سے گزر رہی ہے اس کا دل دہلا دینے والا اظہار ان افسانوں کی خصوصیت ہے۔ اسی ضمن میں گوشہ 'کاروکاری' بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سندھی زبان میں کارو یعنی کالا اور کاری یعنی کالی ہوتا ہے۔ سیاہ کار مرد عورت کے لیے یہ اصطلاح ہوتی ہے۔ لیکن اکثر سیاہ کاری کے واقعات میں کارو کو بچانے کے لیے عدالت، جرگے، سماج، دولت، رتبہ، روایت نہ جانے کون کون آ پہنچتے ہیں جبکہ کاری آنر کلنگ (honour killing) کا شکار ہوتی ہے۔ اس گوشے میں ایک افسانہ 'کاری' (مانک) اور عطیہ داؤد کی نظمیں ہم ہندوستانی قارئین کے لیے بالکل نئی چیزیں ہیں۔

پاکستان کو ادب کے آئینے میں دیکھنے کی شموئل احمد کی سعی کی تعریف کرنی ہوگی کہ فاضل مقالہ نگاروں کے معیاری مضامین، اقتباسات، نظمیں اور افسانے کچھ یوں منتخب کیے گئے ہیں کہ تصویر صاف ہو جاتی ہے۔ وہ ملک جو آغاز سے ہی اپنی مخصوص شناخت پر مصر نظر آتا ہے، جسے اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ وہاں ہندوستان سے علاحدہ شناخت کے اصرار نے بڑی مضحکہ خیز حالات پیدا کر دیے ہیں۔ حسن عسکری ممتاز شیریں اور حمد شاہین وغیرہ نے اسلامی ادب اور پاکستانی ادب کے نعرے لگائے لیکن انتظار

حسین، زاہدہ حنا، اسد محمد خاں، جمیلہ ہاشمی، ممتاز مفتی اور گلزار جاوید کی تخلیقات میں ہندوستان سانس لیتا رہا۔ مومن، دبیر، میر، غالب، سودا، امیر خسرو، واجد علی شاہ، بڑے غلام علی خاں، بسم اللہ خاں، تاج محل، لال قلعہ وغیرہ کو ہندوستانی سمجھ کر ان سے رشتہ توڑنے کی شعوری کوششیں بھی جاری رہیں۔ ہندوستان سے تمدن، ادب اور ثقافت کا تعلق ختم کر کے پاکستان خلاؤں میں معلق ہو کر تو نہیں رہ سکتا۔

اس حسین و جمیل کتاب کو میں اپنے 'کتاب چور' دوستوں سے بچا کر رکھ رہا ہوں۔ اور اکثر اسے کھول کر بار بار پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں کہ سرحد پار کے اردو ادب کی جھلکیاں دیکھ سکھوں۔ وہاں کے تخلیق کاروں کے درد و کرب کو محسوس کر سکوں اور نامساعد حالات میں اپنے ضمیر کو زندہ رکھے ہوئے ان قلم کاروں کو خراجِ تحسین ادا کر سکوں جو ظالم وقت سے دو دو ہاتھ ہو رہے ہیں۔

افہام ادب

مصنف: ایم نصراللہ نصر

صفحات: 272، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: طفیل علیمی، مکان نمبر 122 گلی نمبر 01 ذاکر نگر، نئی دہلی

تخلیق و تنقید آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ بغیر تخلیق کے تنقید نہیں ہو سکتی اور تنقیدی شعور کے بغیر فن پارے کی تخلیق ممکن نہیں۔ تنقیدی شعور کے ذریعہ ہی تخلیق کار اپنی تخلیق کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ایک ہی ادیب تخلیق کار بھی ہو اور تنقید نگار بھی۔ ایم۔ نصراللہ نصر ایسے ادیبوں کی فہرست میں شامل ہیں جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقید نگار اور اچھے نثر نگار بھی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب 'افہام ادب' ایم۔ نصراللہ نصر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں اردو ادب کے مایۂ ناز ادبا و شعرا پر بھی خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ حالانکہ ان حضرت پر پہلے ہی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن کتاب میں شامل مضامین میں بہت ساری نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بقول مصنف 'حقیقت یہ ہے کہ مشاہیر ادبا و شعرا پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ نئے قلم کاروں کو ان میں کچھ نیا ڈھونڈنا کارِ محال سے کم نہیں۔ یا پھر اجالے میں چراغ جلانے کے مصداق ہے، لیکن پیش نظر کتاب قاری کو کچھ نئے گوشے ضرور فراہم کرے گی۔ یہ میرا دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔'

کتاب مذکور تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے 'شہر سخن وراں' میں 'حمد اور اس کی روایت' کے عنوان سے ایک مضمون ہے، جس میں پہلے 'حمد' کی تعریف اور اس کے بعد اس کی روایت پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کے پہلے حصے میں دوسرا مضمون 'ایک شاعر ایک شعر' کے عنوان سے شامل ہے، جس میں علامہ اقبال کی مشہور نظم 'طلوع اسلام' کے صرف ایک شعر 'ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے: بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا' پر بہت ہی پر مغز گفتگو کی گئی ہے۔ علامہ کے اس شعر میں بعض حضرات نے خامیاں نکالی ہیں اور اس کی تصحیح کرنے کی بھی ناکام کوشش کی ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ شعر مہمل ہے اور کسی نے کہا کہ یہ محض شاعرانہ اپج ہے وغیرہ۔ مضمون میں اس شعر کے اثر و تاثیر اور بلاغت معانی و محاسن کو بیان کیا گیا ہے اور دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ علامہ کے اس شعر میں کوئی خامی نہیں ہے، شعر کا مفہوم بالکل واضح ہے۔

پہلے حصے میں ان دونوں مضامین کے علاوہ 'جگر مرادآبادی-شخصیت، شاعری اور داستان عشق'، 'علیم صبا نویدی- حصار غزل میں'، 'کوثر مظہری کی شاعری کے کچھ روشن پہلو'، 'حامی گورکھپوری-سحر سخن کا اجالا'، 'سوہن راہی-شہر گیت کا شہریار'، 'ڈاکٹر معصوم شرقی کی شخصیت اور شاعری'، 'عتیق الہ آبادی کا شعری مزاج'، 'عادل اسیر دہلوی- ملک سخن کا شاہ بے تاج'، 'مطرب بلیاوی-ایک خوش فکر شاعر'، 'ساگر چاپدانوی-نظموں کا ساگر'، 'عین رشید-تازہ کار شاعر'، 'ڈاکٹر شبیر ابروی-عصری آگہی کا ترجمان'، 'نور قریشی- نیم زا لہجے کا شاعر' اور 'اسید نفیس دسنوی-سخن آشنا' شامل ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے 'شہر نثر نگاراں' میں 'اردو زبان کی تولید و تشکیل'، 'منٹو سے مکالمہ بعد از مرگ'، 'قیصر شمیم بحیثیت نثر نگار'، 'شمس صابری- ایک ترقی پسند افسانہ نگار'، 'کمال احمد-کمال کا ڈرامہ نگار'، 'ڈاکٹر الف۔ انصاری-ایک چراغ ضوفشاں'، 'شمس افتخاری- خطۂ نثر کا گل سرسبد'، 'خورشید اقبال- نئے جہاں کا سفیر اردو'، 'دلی جو ایک شہر ہے-سفرنامہ'، 'نور الہدیٰ- بنگال کا ایک منفرد و ممتاز نثر نگار' شامل ہیں۔

تیسرے اور آخری حصے 'شہر نظم نگارانِ بنگالہ' میں ایک مضمون 'بنگال کے نظم گو شعرا- 1950 تک' ہے، جس میں مصنف نے پہلے نظم گوئی کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے، اس کے بعد بنگال کے نظم گو شعرا کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے ہیں۔ ایم۔ نصراللہ نصر نے اپنے تنقیدی مضامین میں فن کاروں کے حسین پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور تخلیق کاروں کی خوبیوں کو بیان کرتے وقت مبالغہ آرائی سے بھی پرہیز کیا ہے۔ البتہ خامیوں کی طرف کم توجہ دی ہے اور ان کی طرف صرف اشارے کر دیے ہیں۔

کتاب میں شامل تمام مضامین کے عنوان نہایت دلکش ہیں۔ کہیں کہیں کمپوزنگ کی غلطیاں در آئی ہیں۔ عمدہ طباعت و کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے اور سرورق بھی دیدہ زیب ہے۔

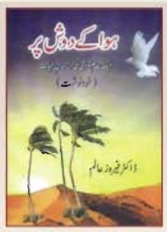

ہوا کے دوش پر

مصنف: ڈاکٹر فیروز عالم

صفحات: 472، قیمت: 500 روپے، سنہ اشاعت: فروری 2015

ناشر: بزم تخلیق ادب پاکستان

مبصر: عبدالحی

خودنوشت سوانح انسان کی اپنی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی میں مختلف نشیب و فراز سے گزرتا ہے۔ بہت جتن اور جدوجہد کے بعد ہی اُسے اپنی منزل مقصود حاصل ہوتی ہے۔ زندگی میں مشکل اوقات کے ساتھ ساتھ رنگارنگی اور خوشگوار لمحات بھی آتے ہیں۔ یہ جدوجہد اور رنگارنگی سے بھرے واقعات جب صفحہ قرطاس پر بکھرتے ہیں تو خودنوشت سوانح حیات تیار ہوتی ہے۔ خودنوشت سوانح حیات اپنی نوعیت کی واحد صنف ہے جو حقائق اور سچائی پر مبنی ہوتی ہے۔ اِس میں لکھنے والے کی خارجی و داخلی دونوں زندگیاں نظر آتی ہیں۔ خودنوشت میں مصنف کی شخصیت مرکزی کردار رکھتی ہے اور یہی کردار ہمیں اپنی زندگی کی داستان سناتا رہتا ہے۔ اردو ادب میں خودنوشت سوانح نگاری کی ایک مستحکم روایت موجود ہے۔ جعفر تھانیسری کی کالا پانی، سید رضا علی کی اعمال نامہ، دیوان سنگھ مفتون کی ناقابل فراموش جوش ملیح آبادی کی یادوں کی بارات، قدرت اللہ شہاب کی شہاب نامہ، اختر الایمان کی اِس آباد خرابے میں، کلیم الدین احمد کی اپنی تلاش میں، ادا جعفری کی جو رہی سو بے خبری رہی، رشید احمد صدیقی کی آشفتہ بیانی میری، عبدالماجد دریابادی کی آپ بیتی، آل احمد سرور کی خواب باقی ہے وغیرہ اردو کی اہم خودنوشتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان میں مصنف کی اپنی زندگی اور اُس سے جڑے تمام حقائق و واقعات بڑے شگفتہ انداز میں رقم کیے گئے ہیں۔ حال ہی میں 'ہوا کے دوش پر' ڈاکٹر فیروز عالم کی خودنوشت شایع ہوئی ہے۔ ایک عام آدمی کی داستان حیات کی شکل میں سامنے آئی یہ کتاب حقیقت میں ایک خاص آدمی کی خاص کتاب بن گئی ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے میرپور خاص میں آنکھیں کھولیں اور جہد مسلسل کرتے ہوئے کیلی فورنیا

پہنچے اور وہاں ایک قابل ڈاکٹر کے روپ میں شناخت بنائی۔ ان تمام واقعات کو انھوں نے ہوا کے دوش میں قلم بند کیا ہے۔ وہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''اس کتاب کو لکھنے کی ایک بڑی تحریک یہ بھی تھی کہ میں اپنے بچوں حماد اور حرا کو اپنی زندگی کی کہانی سنانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ انھیں معلوم ہو کہ میں کن راستوں سے گزر کر اپنی موجودہ منزل تک پہنچا ہوں۔ میرا مقصد اس سے ان میں حوصلے اور ولولے کی ایک آگ لگانا تھا اور انھیں یہ پیغام دینا تھا کہ بقول قابل اجمیری:

حوالے آگ کو گلزار بنا دیتے ہیں

(ص 17)

یہ کتاب بے حد دلچسپ اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے۔ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسان نامساعد حالات میں بھی کوششیں کر کے اور خدا پر بھروسہ کر کے کامیاب و کامران ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے کتاب کے عنوانات بھی بڑے دلچسپ قائم کیے ہیں جن سے ان کی تحریری مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً بڑی خالہ بی، شادی، گارڈ، زیور کی چوری، پہلی مشکل، ایک تھپڑ، پھولوں کی چوری، میری بے راہ روی، امتحان کے بعد، مینڈکوں پر ظلم، طب قانونی وغیرہ ایسے عنوانات ہیں جیسے انشائیے یا افسانے تحریر کیے گئے ہوں۔ اِس خودنوشت میں جابجا اردو کے اہم اشعار بھی بکھرے پڑے ہیں جو مختلف واقعات و حادثات کی مناسبت سے انھوں نے چسپاں کیے ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی اِس خودنوشت میں ہم ان افراد سے بھی ملتے ہیں جنھوں نے فیروز عالم کے مشکل وقت میں انھیں مالی مدد کے ساتھ ساتھ حوصلہ دیا اور کوشش و جدوجہد کرتے رہنے کی ترغیب دی۔ امریکہ میں رہ کر بھی فیروز عالم کو اپنا گاؤں اور اپنے لوگ بے حد پیارے ہیں اور انھوں نے سبھی کا تذکرہ بڑے شگفتہ انداز میں کیا ہے۔ یہ ایک ایسی خودنوشت ہے جسے پڑھ کر زندگی جینے کا نیا حوصلہ، نئی امنگ اور نئی طاقت ملتی ہے۔ واقعات میں سسپنس کا رنگ بھر کر انھوں نے اسے مزید دلچسپ بنا دیا ہے۔ اردو کے قارئین کو ایسی کتابیں ضرور پڑھنی چاہئیں۔

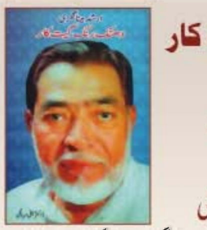

ارشد مینا نگری دھنک رنگ گیت کار

مصنف: ڈاکٹر سیفی سرونجی

صفحات: 151، قیمت: -/200 روپے سنہ اشاعت: 2014

زیراہتمام: انتساب پبلی کیشنز، سیفی لائبریری، سرونج

تبصرہ: صبا امبرین (ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی)

زیر تبصرہ کتاب 'ارشد مینا نگری دھنک رنگ گیت کار' ارشد مینا نگری کے گیتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر سیفی سرونجی کی لگن محنت اور تنقیدی بصیرت کو اُجاگر کرتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں ارشد مینا نگری کے گیتوں کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی خوبیوں کو بیان کیا ہے سیفی سرونجی نے گیتوں پر بڑے ہی سادہ سلیس انداز میں اپنے تاثرات بھی پیش کیے ہیں۔

گیت مکمل طور پر ہندوستانی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ ارشد صاحب کے گیتوں میں ہندوستانی تہذیب، یہاں کا مزاج، جمالیات و کیفیات اور رسم و رواج، میلے ٹھیلے اور تہواروں کے ساتھ رہن سہن کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اُن کے گیتوں میں ہندوستانی تہذیب پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اُن کے گیتوں میں ایسے موضوعات پر گیت ملتے ہیں کہ جن کی خوشبو سے سارا ذہن معطر ہو جاتا ہے پیار کی حقیقت، عید کی جلوہ بازیاں، نہ جاگی نہ سوئی میں، عید اور آنسو، محبت کا گلزار، ہولی، تازہ گلاب، حوصلوں کے دیئے، میرا دِل، بھول جا، ہنستے آنسو، پیار ہے تم سے بولو نہ جیسے موضوعات بھی ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

موسم کی طرح بدلے گا غم کا مزاج بھی ہمدرد بن ہی جائے گا ظالم سماج بھی
عید کے دن یوں میری آنکھ سے آنسو نکلے جیسے ظلمات میں اُڑتے ہوئے جگنو نکلے

دھنک رنگ گیت کار نے اپنے گیتوں میں کئی طرح کے رنگ بھرے ہیں اور ہر رنگ ایک منفرد رنگ ہے۔ گیتوں میں پیار کا رنگ بہت گہرا ہے۔ پیار کے رنگوں سے ایسی دنیا سجائی ہے جس میں خوشیاں انبساط اور دِل میں طوفانی جذبات کی لہریں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ پیار گیتوں کا خاص موضوع ہے پیار میں جدائی بھی ہے وصل کی آسودگی بھی ہجر وصال کے قصے بھی، چھیڑ چھاڑ گلے شکوے، ناز و ادائیں، غم کے آنسو، پیار کی مسکراہٹیں، پیار کا ہر رنگ موجود ہے، پیار خود مختار، زندگی پیار ہے پیار، پیار غم ہی سہی، پیار آساں نہیں، پیار کے سلسلے جیسے موضوعات پر گیت لکھے ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

اقرار کر کے وہ مجھے انکار کر گئے چہرے کے ہنستے پھول پہ آنسو بکھر گئے
چاہو نہ چاہو آپ ہمیں ہم تو چاہیں گے ہم پیار کے احساس کا وعدہ نبھائیں گے

گیتوں میں دِل بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دِل جب اُداس ہوتا ہے تو خوشیوں کے ترانے گانے کے بجائے غم کی روداد بیان کرتا ہے۔ ہر چیز اُداس نظر آتی ہے، کوئی شے اچھی نہیں لگتی، اور جب خوشی کا لمحہ ملتا ہے تو دِل خوشیوں کے ترانے گاتا ہے۔ دِل پیار محبت، جدائی، غم آنسو یہ وہ استعارے ہیں جن سے گیتوں میں درد، کسک اور تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ دِل تڑپ رہا ہے، دِل ہی جانے، حیران دِل، دِل نہ جلاؤ، دِل بنجارا ہے، دِل پر قابو نہیں جیسے موضوعات پر گیت لکھے ہیں:

نظروں سے تو روز ملے تو کبھی تو دِل سے بھی مل تڑپ رہا ہے دِل، تڑپ رہا ہے دِل
دِل بنجارہ ہے بنجارہ، دِل بنجارہ ہے بنجارہ ایک دِل سے گیا ایک دِل میں رہا پھرتا ہے یہ مارا مارا

ارشد کے گیتوں میں پیار محبت کے علاوہ کہیں تنہائی کا کرب ہے تو کہیں خوشی اور انبساط کی لہریں ہیں کہیں ساون کی گھٹائیں، پھولوں کی برسات کا ذکر بھی ملتا ہے۔

ارشد مینا نگری نے گیتوں میں نرم شیریں، سبک اور لوچ دار لفظوں کا استعمال کر کے لہجے کے دھیمے پن اور خوبصورت بندشوں کے ساتھ غنائیت پیدا کی ہے۔ سادہ لفظوں کا خوبصورت استعمال، بحروں کا صحیح انتخاب، خوبصورت مکھڑوں سے گیت کو معنویت عطا کرتا ہے۔

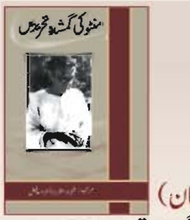

منٹو کی گمشدہ تحریریں

مرتب: شہزاد منظر / اسد فیض

صفحات: 224، قیمت: 400 روپے

مبصر: ایم خالد فیاض، استاد شعبہ اردو، یونیورسٹی آف گجرات (پاکستان)

ڈاکٹر اسد فیض اور شہزاد منظر کی مرتب کردہ کتاب 'منٹو کی گم شدہ تحریریں' مطبوعہ دسمبر 2014، اس بات کا ثبوت ہے کہ منٹو کو تحقیقی سطح پر دریافت کرنے کا عمل ابھی بھی جاری ہے۔ جو یقیناً خوش آئند ہے۔ ہمارے محققین منٹو کی ایک ایک تحریر محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر کسی تخلیق کار کی تمام تخلیقات کو جمع کرنے کا عمل کہاں تک بامعنی ہے؟ کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ بڑے سے بڑے تخلیق کار کی بھی ہر تخلیق اہم یا بڑی نہیں ہوتی۔ اور یہ طے ہے کہ کسی تخلیق کار کی حیثیت اس کی بڑی تخلیقات کی بنیاد پر ہی قائم ہوتی ہے شاید اسی لیے انتظار حسین صاحب نے اس کتاب سے متعلق اپنے ایک کالم میں کہا ہے کہ:

''اس مجموعہ میں منٹو کی بعض تحریریں تو ایسی ہیں کہ جو گم ہو گئیں تو ادب کا اور خود منٹو کا ایسا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ اب شائع ہو گئی ہیں تو منٹو کی قیمتی تحریروں میں کسی طور شامل نہیں کی جاسکتیں۔'' (انتظار حسین: منٹو کی گم شدہ تحریریں مشمولہ روزنامہ 'ایکسپریس'، 21 نومبر 2014)

اصل میں مذکورہ کتاب منٹو کی چند ایسی اہم تحریروں کا مجموعہ ہے جو اس سے پہلے مدوّن شکل میں سامنے نہیں آسکی تھیں۔ کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ 'منٹو کی غیر مدوّن تحریریں' کے عنوان سے ہے۔ اس میں منٹو کی تیرہ تحریریں شامل

ہیں۔ جس میں منٹو کے پانچ تراجم اور سات طبع زاد تحریریں ہیں۔ ایک ڈرامائی فیچر جو بیگم منٹو کے نام سے شائع ہوا تھا، اسے ڈاکٹر اسد فیض نے یہاں اس دعوٰی کے ساتھ شامل کیا ہے کہ ''یہ دراصل سعادت حسن منٹو کی تحریر ہے۔'' اگرچہ اس بات کے کوئی خارجی شواہد تو موجود نہیں مگر داخلی شواہد واقعی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ ایک انتہائی اہم تحریر ہے۔ اس کے علاوہ پانچ تراجم تو خاصے کی چیز ہیں ہی۔ گورکی کے نام چیخوف کے خط اب بھی فکشن کی تنقید میں اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ چیخوف کا افسانہ 'ساحرہ'، الیگزینڈر کپرن کا شاہکار 'سنگتراش کا روز نامچہ' اور گارشن کا افسانہ 'سرخ پھول' بلاشبہ عالمی ادب کے وہ شہ پارے ہیں کہ جنہیں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یہاں میں بطورِ خاص جاپانی شاعر بونی لیوگوشی کی نظموں کے منٹو کے نثری تراجم کا ذکر کروں گا۔ ڈاکٹر اسد فیض کی اس تحقیق نے ہمارے اس عمومی تاثر کو زائل کیا ہے کہ منٹو کو صرف روسی اور فرانسیسی تراجم سے ہی سروکار رہا ہے۔ منٹو کے ان جاپانی نظموں کے تراجم سامنے آنے پر اب ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ منٹو صرف روسی اور فرانسیسی زبانوں کے ادب تک محدود نہیں تھے بلکہ وہ دیگر زبانوں کے ادب سے بھی مقدور بھر آگاہی رکھتے تھے۔

طبع زاد تحریروں میں ایک افسانہ 'بارہ روپے' منٹو کے اہم افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ منٹو کا لکھا ہوا دیباچہ جو سنسکرت زبان کی مشہور کتاب 'نٹی متم' کے اردو ترجمہ 'نگار خانہ' (جو میراجی نے کیا تھا) میں شائع ہوا تھا، وہ دیباچہ نگاری کے ذیل میں ایک اہم مثال کے طور پر پیش کیے جانے کے لائق ہے اور ایک تمثیل 'غالب کی وضع داری' جو تذکرہ 'آبِ حیات' کے ایک واقعہ پر مبنی ہے پڑھنے کے قابل ہے۔ اسی موضوع پر منٹو کی دوسری تحریر 'غالب اور سرکاری ملازمت' کے عنوان سے مختلف متن کے ساتھ تو میسّر تھی مگر یہ متن جو یہاں پیش کیا گیا اور جو بقول ڈاکٹر اسد فیض کے ''... بہتر اور فنی اعتبار سے مکمل ہے'' ہماری نظروں سے ابھی تک اوجھل تھا۔

کتاب کا دوسرا حصہ 'منٹو کی گم شدہ تحریریں' کے عنوان سے ہے۔ جس میں منٹو کی چار ایسی تخلیقات کا متن شامل ہے جو بعد میں یا پہلے منٹو کے افسانوی مجموعوں میں دوسرے عنوانات کے تحت شامل ہوئیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اسد فیض کی وضاحت جو ان کی تحقیق کا نچوڑ ہے، سن لیجیے۔ لکھتے ہیں:

''گم شدہ تحریروں میں 'پگلا' سعادت حسن منٹو کا ایک افسانہ ہے۔ یہ بعد میں نام بدل کر انھوں نے 'نعرہ' کے نام سے اپنے افسانوں کے مجموعہ 'منٹو کے افسانے' مطبوعہ 1940 میں شامل کیا 'پگلا' ہمایوں میں دسمبر 1939 میں شائع ہوا۔ 1948 کے نقوش شمارہ 4، جشنِ آزادی نمبر میں منٹو کا ایک افسانہ 'بلا عنوان' صفحہ 133 سے 140 تک شائع ہوا ہے۔ اس کے عنوان کو تجویز کرنے کا کام قارئین نقوش پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بعد میں یہ منٹو کے افسانوی مجموعے 'نمرود کی خدائی' مطبوعہ 1950 'ڈارلنگ' کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے۔ نقوش کے شمارہ نومبر/ دسمبر 1953 میں ص 171 تا 174 میں منٹو کا ایک افسانہ 'حماقت' کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ 'رتی ماشہ تولہ' مطبوعہ 1956 میں 'نفسیات شناس' کے نام سے موجود ہے۔ اس کتاب میں منٹو کا ایک فیچر 'کوئلے' بھی شامل ہے۔ یہ آذر ذوبی کے پرچہ 'شعور' کراچی چھٹا شمارہ 1959 میں شائع ہوا۔ یہ اس سے قبل 'منٹو ڈرامے' مطبوعہ 1944 میں 'نیلی رگیں' کے نام سے شائع ہو چکا تھا۔ ان گم شدہ تحریروں کی اپنی اہمیت ہے کہ یہ اب ان ناموں سے منٹو کی کتابوں میں شامل نہیں۔''

(اسد فیض، ڈاکٹر: 'مقدمہ' مشمولہ 'منٹو کی گم شدہ تحریریں'، شریکِ مرتب: شہزاد منظر، کراچی، ظفر اکیڈمی، ستمبر 2014، ص:10 تا 11)

کتاب کا تیسرا حصہ 'منٹو شناسی' کے عنوان سے ہے۔ جس میں 'منٹو اور رسالہ ہمایوں'، 'رسالہ عالمگیر کا ایک یادگار شمارہ' اور 'منٹو کی چار نادر تحریریں' کے عنوانات سے ڈاکٹر اسد فیض کے تین قیمتی تحقیقی مضامین کے علاوہ سیّد فیضی، مجید امجد، خاطر غزنوی اور راجہ مہدی علی خان کی منٹو پر پانچ نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں سے منٹو کے شخصی اور فکری خدّ و خال مرتب ہوتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر اسد فیض کے مضامین بہت سی معلومات بہم پہنچانے کا وسیلہ ہیں۔

کتاب میں شامل تحریروں کے ماخذات اگرچہ مجموعی طور پر بڑی ذمہ داری سے درج کیے گئے ہیں مگر کچھ جگہوں پر اندراج میں کمی رہ گئی یا سرے سے ماخذ درج ہونے سے رہ گیا۔ مثلاً افسانہ 'بارہ روپے' اور سیّد فیضی کی نظم کے حوالے پورے نہیں ہیں۔ 'نگار خانہ' کے دیباچہ کا حوالہ غیر تسلّی بخش ہے اور خاطر غزنوی کی نظم کا حوالہ ندارد۔ پھر یہ کہ بعض جگہوں پر مرتب کی وضاحت کی ضرورت تھی۔ مثلاً بونی لیوگوشی کی نظموں کے تراجم سے پہلے کا جو نوٹ ہے اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ کس کا نوٹ ہے۔ منٹو کا؟ یا رسالہ 'شاعر' کے مدیر کا جن کے پرچہ سے یہ نظمیں لی گئی ہیں۔ یہاں اس وضاحت کی بھی ضرورت تھی کہ 'شاعر' نے یہ نظمیں کہاں سے لی تھیں۔ کیونکہ 'شاعر' کے جس شمارہ سے یہ نظمیں لی گئی ہیں وہ 1983 میں شائع ہوا تھا۔ میرے خیال میں حوالوں میں ایسی کمیاں کمپوزنگ کی خامیوں کی وجہ سے ہیں کیوں کہ ڈاکٹر اسد فیض نے جب منٹو کا افسانہ 'بارہ روپے' مجھے 'تناظر' کے شمارہ نمبر 2 کے لیے ارسال کیا تھا تو اپنے تعارفیہ مضمون 'منٹو کا ایک گم شدہ افسانہ' میں اس افسانے کا مکمل حوالہ درج کیا تھا۔ (دیکھیے 'تناظر' شمارہ نمبر 2، جولائی تا دسمبر 2012، ص: 382)

اب ایک وضاحت کتاب کی مرتب شدہ شکل کے بارے میں کہ اصل میں یہ کتاب کس کی مرتب کردہ ہے؟ شہزاد منظر کی یا ڈاکٹر اسد فیض کی۔ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس معاملے میں تھوڑا کنفیوژن پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ یہ سچ کہ منٹو کی گم شدہ تحریروں پر مبنی ایک پورا نسخہ شہزاد منظر ترتیب دے گئے تھے۔ لیکن اس میں سے بیش تر تحریریں بقول ڈاکٹر اسد فیض بعد میں شائع ہو گئیں اور صرف تین تحریریں ایسی بچیں جو ابھی تک مدوّن نہیں ہو سکی تھیں۔ (یہ تین تحریریں ہیں: 'چیخوف کے خطوط گورکی کے نام'، 'ساحرہ' اور 'سرخ پھول') لہٰذا یہ تین تحریریں اس کتاب میں شامل کر کے ڈاکٹر اسد فیض نے شہزاد منظر کو شریکِ مرتب کیا ہے جو ایمان داری اور فراغ دلی کا بیّن ثبوت ہے۔ بلاشبہ 'منٹویات' کے ذیل میں یہ کتاب ایک اہم اضافہ ہے۔

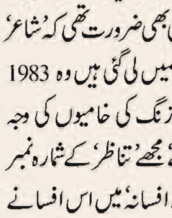

زندگی نامہ گوپی چند نارنگ

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر

صفحات: 400 قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر وسیم بیگم، ایسوسی ایٹ پروفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ

زیرِ نظر کتاب 'زندگی نامہ گوپی چند نارنگ' اشاریہ ہے۔ جس کو جمیل اختر نے پوری لگن، محنت اور یکسوئی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ یہ تحقیق پر مبنی عرق ریزی اور جان سوزی کا ایسا کام ہے جس کو جمیل اختر جیسا محقق ہی انجام دے سکتا ہے۔

مرتب نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ مصنف کی نگارشات پر مبنی ہے اس میں ان کی ذاتی زندگی کے علاوہ علمی اور ادبی کارناموں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور کتاب کا دوسرا حصہ مصنف کے کارناموں کی قدر شناسی اور داد و تحسین پر مبنی ہے۔ پروفیسر نارنگ ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں جن کے ادبی کارنامے نصف صدی سے بھی زیادہ مدت پر محیط ہیں، اس کتاب کی تفصیلات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے وہ صرف ایک محقق، ماہرِ لسانیات، ناقد، نظریہ ساز دانشور، ماہر ساختیات و پس ساختیات ہی نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہیں۔ اس کتاب میں ان کی تمام جہتیں کھل کر سامنے آئی ہیں، یہ کتاب صرف ان پر اشاریہ ہی نہیں بلکہ ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔

پروفیسر نارنگ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک افسانہ لکھ کر کیا جو پہلی مرتبہ 1946 میں افسانہ، ہفتہ وار بلوچستان سماچار میں شائع ہوا۔ پہلی تحقیقی کتاب ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں ہیں جس کی اشاعت سنہ 1959 میں ہوئی۔

مرتب نے کتاب میں تاریخی اعتبار سے تمام خطبات اور مقالات کا اشاریہ پیش کر دیا ہے۔ جو چودہ صفحات پر مبنی ہے۔ پروفیسر نارنگ کی کتابوں کی فہرست بھی طویل ہے پچھتر کتابوں کے وہ مصنف اور مرتب ہیں اگر موضوع کے اعتبار سے دیکھیں تو سب سے زیادہ کتابیں ان کی تحقیق وتنقید پر ہیں، اردو زبان میں لسانیات پر پانچ کتابیں ہیں، درسیات پر بھی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، ڈکشنری یا انسائیکلو پیڈیا (انگریزی میں) جیسے بڑے اور اہم موضوع پر آٹھ کتابیں ہیں۔ ڈائرکٹری یا وضاحتی کتابیات (مشترکہ پروجیکٹ) پر بھی چار کتابیں سامنے آ چکی ہیں۔

کتابوں کی موضوعاتی ترتیب کے بعد مرتب نے ہر کتاب کے بڑے سلیقے سے مندرجات کا اشاریہ پیش کیا ہے۔ ان مندرجات کی مدد سے کوئی بھی محقق مطلوبہ مواد تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ پروفیسر نارنگ کی تمام کتب کی تفصیلات اور مندرجات کے بعد مرتب نے مضامین ومقالات کو اردو کی تقویمی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کون سا مقالہ یا مضمون کب اور کہاں سے شائع ہوا تمام تفصیلات باقاعدگی کے ساتھ اس میں شامل کی گئی ہیں ان مقالوں اور مضامین کی تعداد دو سو چوالیس ہے۔ اس کے بعد ہندی اور انگریزی کے مضامین کو مدنظر رکھا ہے اور تقویمی ترتیب کے اعتبار سے پہلے ہندی کے مضامین کا اشاریہ تحریر کیا گیا ہے، یہ مضامین تعداد میں اکتالیس ہیں اور انگریزی زبان میں مقالات کی تعداد اڑتالیس ہے۔

مرتب نے مصنف کے تحریر کردہ تبصروں، مقدموں اور پیش لفظ کی زمانی اعتبار سے مکمل فہرست پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں تحریر کردہ پیش لفظ کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے نیز دیباچوں اور حرفِ چند کو الگ سے پیش کیا ہے۔ جمیل اختر نے پھر تالیفات کی فہرست الگ سے دے کر ان کتب کے مندرجات کو سلیقے کے ساتھ یکجا کیا ہے۔

مکالمے کے عنوان سے اردو ہندی اور انگریزی کے ان انٹرویوز کو یکجا کیا ہے جو مجموعے کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں، دوسرے ان انٹرویوز کو بھی شامل کیا ہے جو اخبارات میں شائع ہوئے ہیں' دیکھنا تقریر کی لذت' میں وہ تمام انٹرویوز شامل ہیں جو نارنگ صاحب سے مختلف اوقات میں میں لیے گئے ہیں، ان میں پاکستان، برطانیہ، امریکہ، کینڈا، ناروے اور ہندوستان میں دیئے گے تمام انٹرویوز شامل ہیں، ان انٹرویوز کو بھی نظر میں رکھا گیا ہے جو خود مصنف نے دوسری بڑی ہستیوں سے لیے۔

پروفیسر نارنگ نے خود بھی اپنی بہت سی کتابوں کے ترجمے کیے، ترجمے کے عنوان سے ان کا بھی ذکر ہے، اس کے علاوہ ان کی اپنی کتابوں کے دوسری ہندوستانی زبانوں ہندی، پنجابی، مراٹھی، گجراتی، کشمیری، انگریزی، کنڑ، تامل بنگالی، ملیالم اور اڑیا میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ اس کا مکمل اشاریہ بھی مرتب نے پیش کیا ہے اس کے بعد خطوط کا اشاریہ ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ مصنف کی قدر شناسی پر مبنی ہے، یہاں خصوصی طور پر ان مضامین کا ذکر کیا گیا ہے جو پروفیسر نارنگ کی مختلف کتابوں پر شائع ہوئے ہیں، سب سے پہلے ان رسائل کی طویل فہرست ہے جن میں پروفیسر نارنگ کے حوالے سے بات کی گئی ہے اس کے بعد کتابوں میں مصنف پر جو مضامین لکھے گئے ہیں ان کی تفصیلات کا اندراج کیا گیا ہے۔

منظوم خراجِ عقیدت کی تعداد بھی طویل ہے۔ پروفیسر نارنگ پر آٹھ تحقیقی مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔

پروفیسر نارنگ کی شخصیت پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور مرتب نے ان کتابوں کی فہرست کا بھی اشاریہ شامل کر دیا ہے۔ مصنف نے ممتاز ادبی شخصیات کے متعلق اپنے نظریات کو مختصراً مگر جامع اور دلچسپ اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے۔

آخر میں مصنف کی وہ کتابیں جو پاکستان سے شائع ہوئیں ان کا مکمل اشاریہ ہے۔ برقیاتی میڈیا کے حوالے سے چار ڈوکومینٹری فلمیں نارنگ صاحب پر بن چکی ہیں پہلی ساہتیہ اکادمی کی جانب سے دوسری مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کی طرف سے اور باقی دو دوردرشن نئی دہلی کی جانب سے پیش کی گئی ہیں سب سے آخر میں یوٹیوب اور مصنف کی ویب سائٹ کا پتہ دیا گیا ہے۔

جمیل اختر نے 'زندگی نامہ گوپی چند نارنگ' کا اشاریہ جس مستقل لگن، پیہم مہنت اور محققانہ اندازِ نظر کے ساتھ مرتب کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے، کہیں کہیں کچھ چیزیں اندراج نہیں ہو سکی ہیں آنے والے اڈیشن میں اس کمی کو ضرور پورا کر لیا جائے گا تنویر احمد نے کمپوزنگ کے فرائض پوری خوبی سے انجام دیے ہیں پروف کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔

تفہیم شعر

مصنف: ڈاکٹر اسلم جمشید پوری
صفحات: 256 قیمت: 130 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس؛ دریا گنج؛ نئی دہلی
مبصر: روبی نکہت، 236، شپرا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

'تفہیم شعر' شاعری سے متعلق مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے مصنف اسلم جمشید پوری ہیں جو میرٹھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بہ طور استاد وابستہ ہونے کے ساتھ متعدد تعلیمی اداروں سے بھی منسلک رہے ہیں۔ ان کے مضامین کے دو مجموعے 'اردو فکشن: تنقید و تجزیہ' [2012] اور 'اردو افسانہ: تعبیر وتنقید' [2006] بھی داد۔

زیر تبصرہ کتاب تفہیم شعر بنیادی طور پر ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف مواقع پر تحریر کیے گئے ہیں۔ ان مضامین میں معنوی ربط کی تلاش کارِ عبث ہے۔ اس میں نظم، غزل اور تصوف کے حوالے سے مختلف مضامین شامل ہیں۔ جمیل مظہری پر لکھا جانے والا مضمون تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس میں جدید مرثیہ کے آغاز کا سہرا کس کے سر...... پر گفتگو کی گئی ہے۔ انھیں اس بات پر اصرار نہیں کہ جمیل مظہری کو فوقیت حاصل ہے بلکہ ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ جدید مرثیے کی تعمیر میں جمیل مظہری کا بھی حصہ ہے۔ اس لیے انھیں نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ اسرار الحق مجاز کے شعری متن کا تجزیہ کرتے ہوئے انھوں نے جوش، جنون اور انقلاب کی جمالیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مجاز کی ذاتی زندگی میں در آنے والی محرومیوں اور اداسیوں کو خصوصاً نشان زد کیا ہے۔ یہ مضمون مواد کے اعتبار سے مختصر ہے۔ اس میں مجاز کے شعری جمالیات کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی نہیں ملتی۔ اس طرح مجاز کی تخلیقی شبیہ غیر واضح رہ جاتی ہے۔ عملی تنقید میں مجاز کے متن کو بھی کم ہی استعمال کیا گیا ہے۔ 'شکیل بدایونی کی نظموں میں افسانوی عناصر' میں کہانی کے جوہر اور بیانیہ کے تفاعل پر گفتگو کی گئی ہے۔ شکیل بدایونی کی نظموں میں سے 'چور'، نمائش علی گڑھ'، ترقی معکوس'، زلزلہ'، شب رنگیں' اور دیباچہ وغیرہ کا تجزیہ اسی تناظر میں کیا گیا ہے۔ 'میر اور ماس کمیونی کیشن' اپنے عنوان میں جدت کے ساتھ فکری اور اسلوبیاتی سطح پر بھی تنوع کا مظاہرہ ہے۔ اس مضمون میں ترسیل عامہ کے تناظر میں میر کی شاعری کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ 'اقبال اور تصوف: مختلف زاویۂ نظر' محض عنوان ہی رہ جاتا ہے۔ امید تھی کہ موصوف اس عنوان کے تحت کوئی نکتہ ضرور پیش کریں گے لیکن وہ تو اقبال اور تصوف کے حوالے سے لکھے جانے والے مباحث کا خلاصہ بھی پیش کرنے سے عاجز رہے۔ تصوف، وحدۃ الوجود، حرکت اور عرفان تمام مباحث کو اس طور پر آپس میں خلط ملط کر دیا ہے کہ خود اس کا سرا ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور/ ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں/ والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اقتباسات کا سہارا لیا گیا ہے؛ جو کہیں کہیں سہارا بنتے

ہیں تو اکثر جگہ یہ بیساکھی بھی ٹوٹتی نظر آتی ہے۔ غزل کے حوالے سے مجروح سلطان پوری پر لکھا جانے والا مضمون اپنے تجزیاتی اور تنقیدی تناظر میں قابل لحاظ ہونے کے ساتھ تحقیقی اعتبار سے حقائق کے خلاف ہے۔ یہ بات اب عام ہو چکی ہے کہ غزل کے حوالے سے مجروح کو فیض پر فوقیت حاصل ہے۔ فیض نے مجروح کے بہت بعد اس جانب توجہ دی۔ مصنف آج بھی فیض کی اولیت کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ سید احمد شمیم کی شاعری پر مشتمل مضمون تجزیاتی نوعیت رکھتا ہے۔ اس میں ان کے نظمیہ متن کی فکری وفنی جہات کو روشن کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ یہ مضمون اسے ازسرنو پڑھنے پر ابھارتا ہے۔ تنقیدی سیاق میں اسے ایک حد تک کامیاب اور سنجیدہ مطالعے کا نقش کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ 'شہریار' کی نظم نگاری پر بھی ایک مضمون شامل ہے۔ اختصار کی وجہ سے اس مضمون میں شہریار کی شاعری کا چہرہ واضح نہیں ہوتا۔ مصنف نے ان کی اختصار پسندی اور جامعیت پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ شہریار کی نظمیہ شاعری کی شناخت محض اختصار ہی ہے یا کچھ اور بھی......؟؟

اسی طرح بعض نئے شاعروں کے حوالے سے کئی ایک مضامین شامل ہیں جو نئے شعری منظر نامے کی تفہیم میں بہ صورت معکوس مددگار ہو سکتے ہیں۔ موصوف اس کتاب کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ''میری یہ کتاب شاعری کی تنقید میں کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے؛ مجھے اس کا احساس ہے۔ لیکن میں نے اپنا زاویۂ نظر پیش کیا ہے۔ نظموں اور غزلوں کو ایک خاص نقطۂ نگاہ سے پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں آپ کو کئی مضامین ایسے ملیں گے جن کا زاویہ مختلف ہے؛ یہاں تنقید کا روایتی رویہ نہیں ہے بلکہ کچھ نیا کرنے اور چیزوں کو نئے طور پر دیکھنے کی کوشش ہے۔ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ ان میں سے بیشتر ایسے مضامین ہیں جو یا تو جلد بازی میں سمیناروں کے لیے قلم بند ہوئے ہیں یا پھر احباب کی کتابوں اور مسودوں کے لیے لکھے گئے ہیں۔'' [ص: 10، 11] مصنف نے یہاں جس جدت اور نئے رویے کی بات کی ہے وہ ان مضامین میں کم ہی موجود ہے۔ ہاں اس حوالے سے صرف ایک مضمون 'میر اور ماس کیمونی کیشن' کا ہی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تمام مضامین روایتی تنقید کو ہی اعتبار عطا کرتے ہیں۔ کتاب میں پروف کی خامیاں بھی رہ گئی ہیں لیکن کم ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب بھی اردو کی دوسری کتابوں کی طرح مقبول ہوگی۔

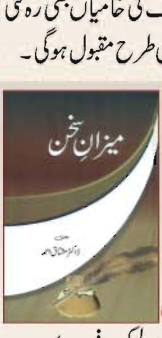

میزانِ سخن

مصنف: ڈاکٹر مشتاق احمد

صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد عبدالرحمٰن ارشد، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اردو شاعری پر خاصی تنقیدیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ وقت میں سیکڑوں مضامین کو دیکھنے کے بعد چند ایک ہی مضمون ہمارے سامنے ایسا آتا ہے جس میں تازگی پائی جاتی ہو، جو تنقید کے نئے ابعاد کھولتا ہو اور واقعتاً لائق مطالعہ ہو۔ 'میزانِ سخن' انھیں چند تحریروں کا مجموعہ ہے جو تخلیق و تنقید کی تازگی اور اصلیت کے جوہر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ کتاب شعر و ادب سے متعلق تیرہ تنقیدی اور تحقیقی تحریروں کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ جس میں مصنف نے مختلف زاویوں سے اقبال، فیض اور فراق جیسے مشاہیر کی شاعری کا دیانت داری سے ناقدانہ تجزیہ کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کا پہلا مضمون 'اردو شاعری میں حب الوطنی کے عناصر' ہے۔ صوبہ بہار کے حوالے سے اردو شاعری میں قومی اور وطنی عناصر تلاش کرتے ہوئے مصنف ڈاکٹر مشتاق احمد لکھتے ہیں کہ بہار کے قدیم شاعروں نے اپنی شاعری کی بنیاد ہی حب وطن اور سماجی رواداری پر رکھی ہے۔ مضمون کے شروع کے تین صفحوں میں انھوں نے وطنیت اور وطن پرستی کے آفاقی مفہوم کو مغربی اسکالرس کے اقوال کے حوالے سے واضح کیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے صوبہ بہار کے شاعروں عبدالقادر بیدل، قاضی عبدالغفار، مہاراجہ رام نارائن موزوں، نور محمد دلدار، راسخ عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، یاس یگانہ چنگیزی، مسلم عظیم آبادی، زار عظیم آبادی، بسم عظیم آبادی، جمیل مظہری، پرویز شاہدی، اجتبیٰ رضوی، مہر شکروی اور کلیم عاجز وغیرہ کی شاعری میں قومی اور وطنی عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ ساتھ ہی بہار کے ہم عصر شاعروں کے کلام میں بھی ان عناصر کی موجودگی کو معتبر حوالہ جات کے ساتھ ثابت کیا ہے۔ تین درجن سے زائد صفحات پر مشتمل یہ مقالہ ایک طرح سے اس کتاب کی جان ہے۔

مشاہیر ادب عصری معنویت کے حوالے سے اکثر بحث کا موضوع بنتے رہتے ہیں۔ اس طور پر زیر تبصرہ کتاب میں شامل دوسرا مضمون 'اقبال کی عصری معنویت' اہمیت رکھتا ہے۔ مصنف علامہ اقبال کی عصری معنویت سے گفتگو کرتے ہوئے درست رائے دیتے ہیں کہ انسان کے بنیادی مسائل اور حقائق ہر دور میں تقریباً ہر ایک سے رہے ہیں اور چونکہ اقبال کی شاعری ان ہی امور سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری آنے والے دور میں بھی اپنا توافق بنائے رکھے گی۔ یہ مضمون مختصر لیکن جامع ہے۔

اردو ادب کی تاریخ میں ترقی پسند تحریک کو بڑا مقام حاصل ہے۔ ترقی پسند ادیبوں اور شعرا نے اردو ادب کے وسیلے سے ہندوستانی سماج کو ایک نئی سمت عطا کی ہے۔ ترقی پسند شعرا کی اردو میں ایک بڑی تعداد ہے جن میں فیض احمد فیض کا نام معتبر اور امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ فیض کے اشتراکی پیغام کو نہ صرف برصغیر ہند و پاک بلکہ اقوام عالم نے محاسبہ کیا گیا ہے۔ 22 صفحات پر مشتمل یہ طویل مضمون اپنے قارئین سے سنجیدہ مطالعہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ 'میزانِ سخن' میں شامل چوتھا مقالہ 'حیات و کائنات کا شاعر- جوش ملیح آبادی' ہے۔ یہ مقالہ درحقیقت شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کے حضور میں خراجِ عقیدت ہے۔ اس مقالے میں جوش کی شاعری کے موضوعات سے متعلق مختصر لیکن جامع گفتگو ملتی ہے۔

پانچواں مقالہ 'ماقبل ترقی پسند تحریک کا ایک ترقی پسند غزل گو- مجاز' میں اسرار الحق مجاز کی غزلیہ شاعری میں ترقی پسندی کے عناصر کی تلاش کی گئی ہے۔ اس مقالے میں مصنف نے مجاز کو ترقی پسند تحریک سے قبل کا ترقی پسند ذہن کا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'تہذیب غزل کا پاسدار- پرویز شاہدی' میں ترقی پسند شاعر پرویز شاہدی کی شاعری کے کلاسیکی رنگ کی نشاندہی ہے۔ 'دردِ زیست کا صاحبِ اسلوب شاعر- فراق گورکھپوری' سے موسوم مقالہ میں فراق کی شاعری کا موضوعی (خاص کر عشقیہ شاعری کا) مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ آٹھواں مقالہ کیفی اعظمی کی شاعری کے اہم پہلوؤں سے نسبت رکھتا ہے۔ اس مقالے میں کیفی کی شاعری (بشمول فلمی گیت) میں پائے جانے والے رومان اور انقلاب کے حسین امتزاج کی نشاندہی ہے۔ 'ایوانِ غزل کا روشن چراغ- جگن ناتھ آزاد'، 'غزل کا رمز شناس- جذبی'، شاعر زیست- مظہر امام'، 'نئی زمین اور نئے آسمان کا متلاشی- شہریار' اور 'طاہرہ سعید ہارون- اردو دوہے کا رمز آشنا' بے حد دلچسپ اور مطالعے کا متقاضی مقالات ہیں۔

مصنف کتاب ڈاکٹر مشتاق احمد اردو دنیا کا ایک متعارف نام ہے۔ موصوف ایک اچھے استاد اور تنقید نگار کے ساتھ ساتھ بہترین اکادمک منتظم بھی ہیں۔ مصروف شب و روز کے باوجود ان کے صحافتی اور ادبی نوعیت کے مضامین اخبار و رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریریں قارئین ادب سے داد و تحسین وصول کرتی رہتی ہیں۔ ان کی ایک درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جنھیں اردو داں طبقہ نے خوب خوب سراہا بھی ہے اور بلاشبہ ان کی یہ تازہ کتاب 'میزانِ سخن' اردو تنقید کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔ کتاب کے مطالعے کے دوران پروف کی غلطیاں نہیں کے برابر ملیں جو مصنف کے حساس زبان داں ہونے کی دلالت پیش کرتا ہے۔ امید ہے کہ اردو نواز عوام اس کتاب کو پسند کریں گے۔

لفظوں کی مسیحائی

مصنف: ڈاکٹر اعظم

صفحات: 217، قیمت: 200 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: راحت افزا، ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ شعری مجموعہ 'لفظوں کی مسیحائی' کے مصنف ڈاکٹر اعظم کو خدا نے انھیں وہبی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان کا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں انھوں نے 125 غزلیں، 16 نظمیں اور کچھ دوہے بھی کہے ہیں۔ شروعات حمد، دعا، مناجات اور نعت شریف کے توسط سے اپنے قلبی احساسات کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کی ہے۔ پہلے تو ساڑھے سات صفحات پر 'اپنی بات' کے عنوان سے شاعر نے پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد پانچ مضامین ناقدین سخن کے ذریعے قلم بند کیے گئے ہیں جس میں افتخار امام صدیقی، کوثر صدیقی، وجے سنگھ بہادر، انور اسلام، اور ڈاکٹر یعقوب یاور نے اپنے تاثرات پیش کیے ہیں۔ محترمہ شفیقہ فرحت نے ڈھائی صفحے کا مقدمہ تحریر کیا ہے۔ شروعات کے 33 صفحات ان تفصیلات کی نذر ہوگئے۔ سوال یہ ہے کہ کسی شاعر کی پہچان یا اس کی شاعری خوبی یا اس کی کامیابی کی سند حاصل کرنے کی غرض سے کسی نقاد کی آرا سے آراستہ ہونا لازمی ہے یا یہ محض ایک روایت ہے۔ ڈاکٹر اعظم کا کلام خود اپنی کامیابی کی دلالت کرتا ہے۔ ان کی وسعت اس کے موضوعات میں پنہاں ہے۔ موضوع کی مناسبت سے بے شمار الفاظ وتراکیب کا لامحالہ استعمال ان کو ایک کامیاب شاعر کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ ڈاکٹر اعظم کی شاعری سے ان کی واردات قلبی جگر کی مینو کاری، غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی بھی بے شمار پرتیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ اشعار دیکھیے:

راز دل کہہ کے نہیں لکھ کے بتانا ہے ہمیں ورنہ سن لیں گے ہر اک بات کو دیوار کے گوش
زیست کی راہ پہ تنہا نہ کبھی چل پایا غم جاناں، غم دوراں بھی رہے دوش بدوش

اس مجموعے میں نظموں کی بنسبت غزلوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ غزلیں ہی شاعر کے فکر وفن کی ترجمان ہیں۔ ڈاکٹر اعظم کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو عہد حاضر کے شعری اصولوں کے مطابق پیش نظر سمجھی جاتی ہیں۔ بہر حال ڈاکٹر اعظم کی شاعری عمدہ شاعری ہے۔ وہ شاعری کے مختلف نشیب وفراز، اس کی باریکیوں، اور نزاکتوں سے خوب واقف ہیں۔

ڈاکٹر اعظم کی انفرادیت ان کی سادہ بیانی میں مضمر ہے، ردیف، قافیوں کے استعمال میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ بیشتر غزلوں میں مطلع کے بعد حسن مطلع کا استعمال ہوا ہے۔ نون، الف، اور بے پر ختم ہوئے قافیے کے استعمال سے غنائیت اور پرکاری کا بھی احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر اعظم کی شاعری روایت پرستی کے ساتھ ساتھ عہد حاضر کی بھی ترجمانی کرتی ہے۔ ان کی شاعری خالص اور زمینی شاعری ہے جہاں دور حاضر کے روح فرسا حالات، جان لیوا حادثات، ظلم وتشدد، فکر وفریب، تہذیب وتمدن کے زوال کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اعظم جذباتی اور حساس طبیعت کے شاعر ہیں۔ وہ آج کے بدلتے ہوئے حالات اور اقدار کو انسانیت کا دشمن گردانتے ہیں۔ جس میں محبت واخوت، وفا، دوستی، شرافت، دیانت داری اور رشتے سب کے سب بے معنی ہوکر رہ گئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

محبت، شرافت، دیانت، صداقت نہ جانے کہاں ان کو ہم بھول آئے
اب کہاں ملتے ہیں بھائی سے بھائی گھر میں در نہیں جس میں وہ دیوار اٹھا رکھی ہے
ملنے جلنے میں ہے اب سودوزیاں کا ہی خیال رشتے ناتے ہوگئے ہیں آج کل بیوپار سے

ڈاکٹر اعظم دراصل غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے نظم، دوہا، اور رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مجموعی طور پر ڈاکٹر اعظم کو حسن وعشق کے داخلی معاملات، جذبۂ احساس، زندگی کے نشیب وفراز، حیات ممات کی حقیقت ان سب پر غور وفکر کے دریچوں سے جھانک کر شاعری کے پیکر میں ڈھالنے کا سلیقہ خوب آتا ہے۔ امید ہے کہ ان کی شاعری کی خوشبو دور دراز تک پھیلے گی۔

عرفان صدیقی۔حیات، خدمات اور شعری کائنات

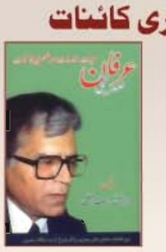

مرتبین: عزیز نبیل، آصف اعظمی

صفحات: 654، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت 2015

ناشر: گلوبل میڈیا پبلی کیشنس، E-42 نئی دہلی

مبصر: راشد حامدی، F-9، ذیشان اپارٹمنٹ، نزد مسجد الحدید، شاہین باغ، نئی دہلی 110025

اس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کا تعلق براہ راست انسان کے جمالیاتی احساس سے ہے لیکن اس سے بھی بالکلیہ انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر دور میں غزل کے رابطے عقل وفلسفہ، تاریخ وتمدن اور تہذیب وثقافت سے استوار رہے ہیں بلکہ جدید غزل نے تو انسانی شعور و وجدان اور عوامی روابط کے ان پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے جس کے بارے میں اساتذۂ فن نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ زیر تبصرہ کتاب 'عرفان صدیقی، حیات، خدمات اور شعری کائنات' اس کا بین ثبوت ہے، جس میں عرفان صدیقی کے شعری کمالات اور فکری جہات کی تعیین قدر کی بہترین سعی کی گئی ہے۔

عرفان صدیقی نے تاریخ کے ان روشن وتابناک ابواب، سانحۂ کربلا کے استعارات وعلائم اور بالخصوص حق وباطل، خیر وشر اور نیکی وبدی کے درمیان ازل سے جاری معرکہ آرائیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ جنھیں انسانیت کی بقا اور تحفظ کے لیے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے رہنا چاہیے۔ انھوں نے سانحۂ کربلا کو اپنی شاعری میں کسی مذہبی علامت کے طور پر نہیں برتا ہے بلکہ اُسے اسلام کی ایک اعلیٰ اور آفاقی قدر کے ساتھ ساتھ اسے اسلامی تہذیب کی اساسی قدر کے طور پر متعارف کرانے کی بھرپور سعی کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے شہادتِ حسین اور واقعاتِ کربلا کو انسانی میراث کے طور پر مستحکم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے تو قطعاً بے جا نہ ہوگا۔ انیس ودبیر نے فن مرثیہ گوئی کو اردو شاعری میں دوام کمال عطا کیا مگر عرفان صدیقی نے اپنے فنی شعور اور کمالِ فن سے مرثیہ کو غزل بنادیا۔ انھوں نے معرکۂ کربلا، شہادتِ امام حسینؓ اور اسوۂ شبیری کو اس طرح برتا کہ مرثیے کو غزل اور غزل کو مرثیہ بنادیا۔ انھوں نے الفاظ کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر سے تاریخی واقعات کو امر کرنے اور اسے انسانی قدر کے حوالے سے دوام عطا کرنے کا جو قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے وہ صرف اور صرف ان کا ہی حصہ ہے۔ یہ ان کا اجتہاد بالرائے نہیں اجتہاد بالاستدلال تھا جس نے انھیں عرفان صدیقی بنادیا۔

عرفان صدیقی کی شاعری کو نہ روایت سے موسوم کیا جاسکتا ہے اور نہ جدیدیت و مابعد جدیدیت سے۔ انھوں نے روایت سے استفادہ کیا تو روایت پسندی کی روایت ہی بدل دی۔ وہ جدیدیت کی راہ پر چند قدم چلے تو اس کی سمت سفر ہی تبدیل کردی۔ انھوں نے روایت وجدیدیت کے صالح عناصر کو اس طرح برتا کہ وہ ان کی اپنی شناخت بن گئے:

کوئے قاتل کی روایت ہی بدل دی ہم نے
ورنہ دستور یہاں لوٹ کے آنے کا نہیں
عشق میں کہتے ہیں فرہاد نے کاٹا تھا پہاڑ
ہم نے دن کاٹ دیے یہ بھی ہنر ہے سائیں

شاید یہی وجہ ہے کہ جدیدیوں نے انھیں قابل اعتنا سمجھا نہ روایت پرستوں نے ان کی تعیین قدر کی کوشش کی۔ اعلیٰ اور ارتقائی شاعری کے باوجود ان کے مرتبے کی تعیین میں عرصہ بیت گیا اور آج جب کہ ان کے مرتبے کی تعیین میں جو کوششیں کی جارہی ہیں اس میں بھی ایک قسم کی جھجک مانع ہے۔ ان حالات میں عزیز نبیل اور آصف اعظمی نے 'عرفان صدیقی: حیات، خدمات اور شعری کائنات' ان کی تعیین قدر کی جو قابل قدر کوشش کی ہے اور ان کی شاعری اور ان کی شعری خدمات کے حوالے سے انھیں بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے اس کے لیے یہ دونوں حضرات اور سرپرست شکیل احمد صبرحدی بھی مبارک باد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

کتاب چار حصوں میں (باعتبار مضامین) منقسم ہے۔ یاد عرفان کے حوالے سے شامل پہلے حصے عرفان صدیقی کے ذاتی معاملات، عادات واطوار سے متعلق ہے۔ اس میں شمیم حنفی، ملک زادہ منظور احمد، سید محمد اشرف، اور عابد سہیل جیسی اردو ادب کی ان قابل ذکر شخصیتوں کے مضامین شامل کیے گئے ہیں، جن سے ان کے ذاتی مراسم اور شخصی رابطے اور رشتے تھے۔

دوسرا اہم حصہ تفہیم عرفان کا ہے۔ اس میں شمس الرحمٰن فاروقی، مظہر امام اور وارث کرمانی جیسے بااثر ناقدین کی وقیع تحریروں کے علاوہ اور بھی دیگر اہل قلم کی تحریریں شامل ہیں۔

کتاب کا تیسرا گوشہ عرفانیات: عرفان صدیقی کی شاعری، انٹرویو اور نثری تحریروں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے ذریعے قارئین عرفان کی نثری تحریروں، ان کی شاعری اور انٹرویو سے براہ راست لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ عرفان صدیقی کا غیر مدون کلام بھی اس گوشے کا اہم حصہ ہے۔

عرفان صدیقی کی تصاویر کوائف، شجرہ اور ان کی کتابوں کے سرورق کی تصاویر آئینہ عرفان کے حوالے سے منتخب آخری حصے کا جزو ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف معروف ومشہور قلم کاروں کی تحریروں کو شامل کیا گیا ہے بلکہ ایسے قلم کاروں کو بھی جگہ دی گئی ہے بقول مرتبین جن کی قلمی عمر دس بارہ برس سے زیادہ کی نہیں ہے۔ لیکن مضامین کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان ناقدین کا قلم پختہ تحریریں لکھنے کا ہنر بخوبی جانتا ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعری جتنی پرکیف ہے کتاب کا سرورق اور مضامین اس سے کم پرکیف اور جاذب نظر نہیں۔ البتہ کہیں کہیں پروف ریڈنگ کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں مرتبین ان غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

اسد رضا - بحیثیت طنز ومزاح نگار

مصنف: فرح ناز

صفحات: 160، قیمت: -/160 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال، بیت الراضیہ، ابوالفضل، نئی دہلی

اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت کافی قدیم ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں طنز ومزاح ایک الگ صنف کی حیثیت سے سامنے آیا۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ طنز ومزاح کے فروغ میں اردو اخبارات ورسائل کا خصوصی رول رہا ہے۔ اردو شاعری میں جعفر زٹلی اور اردو نثر میں غالب سے طنز ومزاح کا آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج طنز ومزاح ایک ایسی ہردل عزیز صنف سخن ہے جس کے قارئین کی تعداد کثیر ہے۔

پیش نظر کتاب 'اسد رضا- بحیثیت طنز ومزاح نگار' فرح ناز کا ایم فل کا مقالہ ہے، جس کو انھوں نے ترتیب جدید کے ساتھ کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ اسد رضا ان قابل ذکر قلم کاروں میں ہیں، جن کا رشتہ اگر ایک طرف شاعری سے رہا ہے تو دوسری طرف نثر نگاری سے متعلق رہا ہے۔ اگر ایک طرف وہ بچوں کے ادیب کے طور پر سامنے آتے ہیں تو دوسری طرف طنزیہ مضامین اور شاعری کے نمونے بھی ان کی تخلیقات میں وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ اگر ایک طرف انھوں نے افسانہ نویسی میں قلم آزمایا ہے تو دوسری طرف سیاسی اور معاشرتی قسم کے مضامین سے بھی ان کا دامن مالا مال رہا ہے۔ 'اسد رضا- بحیثیت طنز ومزاح نگار' کو فرح ناز نے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں طنز ومزاح کی تعریف اور روایت، اس کے ذیل میں طنز ومزاح کی تعریف کرتے ہوئے فرح ناز نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ طنزیہ ومزاحیہ ادب انسانی زندگی اور سماجی حالات کا گہرائی کے ساتھ تنقیدی مطالعہ کرتا ہے اور اس میں پیدا ہو رہی اعتدالیوں، ناہمواریوں، برائیوں، خامیوں اور ناانصافیوں کو ایک خاص فن کے ذریعے دلکش انداز میں دور کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس حوالے سے جب ہم اسد رضا کی نثری خدمات کا جائزہ لیتے ہیں تو روزنامہ راشٹریہ سہارا کے صفحات پر شائع ان کے مضامین درج بالا تعریف پر حرف بہ حرف صادق آتے ہیں۔ ایک جگہ اسد رضا خود لکھتے ہیں:

'نثر میں طنز ومزاح کو میں اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ معاشرہ کی ناہمواریوں، بدگمانیوں، ثقافتی، سیاسی ومعاشی استحصال، فرقہ پرستی، رہبران کی دورخی زندگی اور قول وفعل کے تضاد کو اشعار کی بہ نسبت نثر میں بہتر طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔'

نثر میں اسد رضا کے 6 مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں 3 طنزیہ ومزاحیہ مضامین کے مجموعے 'شوخیِ قلم'، 'ادبی اسپتال' اور 'شوشے' ہے۔ تین مجموعے بچوں کی کہانیوں پر مشتمل ہیں۔ فرح ناز نے ان کتابوں پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اسد رضا کے طنز ومزاح کا نقطۂ نظر ہمارے سماج میں پنپ رہی غلطیوں اور ناہمواریوں پر مبنی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب اسد رضا کی سوانح ہے، جس میں فرح ناز نے اسد رضا کے آبائی وطن ضلع بجنور پر گفتگو کرتے ہوئے وہاں کا ادبی پس منظر بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اسد رضا کا شجرہ، پیدائش، تعلیم، ازدواجی زندگی، ادبی خدمات، ادبی سفر، چہرہ، سراپا، عادات واخلاق، شوق، تصنیفات اور ان کو ملنے والے اعزاز وایوارڈ کا تذکرہ کیا ہے، جس سے اسد رضا کی شخصیت اور مقبولیت کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

تیسرے باب میں ان کی شعری خدمات، نثری خدمات، بچوں کا ادب اور ان کے اسلوب نگارش پر کھل کر گفتگو کی ہے۔ اسد رضا کے دو شعری مجموعے 'آئینے احساس کے' اور 'شہر احساس' شائع ہوچکے ہیں۔

اسد رضا نے اپنی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب کوئی تلخ شیریں تجربہ، مشاہدہ یا حادثہ میرے دل ودماغ کو جھنجھوڑتا ہے اور خوابیدہ احساسات وجذبات کو بیدار کرتا ہے تو میں شعر کہنے کے لیے مجبور ہوجاتا ہوں۔ اس کے علاوہ راشٹریہ سہارا میں آئینہ عنوان کے تحت ان کا قطعہ کم وبیش روزانہ ہی سیاسی، سماجی اور کبھی کبھی معاشرتی پہلوؤں پر تنقید وطنز کرتا نظر آتا ہے۔ ویسے ان کی شاعری میں نعت ومنقبت اور حقیقت کی ترجمانی بھی جابجا نظر آتی ہے۔ فرح ناز نے ان کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے اپنی بات کی تصدیق کے لیے جگہ جگہ منتخب اشعار بھی پیش کیے ہیں، جو مطالعے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نمونۂ کلام دیکھیے:

یہ مہنگائی زدہ بچے ہیں شاید   کھلونے دیکھ کے مچلے نہیں ہیں
بھوک پھر بھی بھوک ہے مٹتی نہیں   اس نے دیکھا خواب روٹی کا بہت
اس کی یادوں نے مالا مال کیا   بھر گئے آنکھ کے خزانے پھر

یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ بچوں کے لیے ادب تحریر کرنا ادیب کے لیے بڑا چیلنج ہے۔ جسے ہر ادیب قبول نہیں کرسکتا، لیکن اسد رضا نے اس میدان میں بھی اپنے قلم کی جادو بیانی سے قارئین کو مسحور کیا ہے۔ ان کے تین مجموعے چاند نگر کی سیر، ننھے منوں کی

سرکار اور کرکٹی مشاعرہ اس بات پر دال ہیں کہ انھوں نے بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھ کر انہی کی سطح پر اتر کر اور انہی کی نفسیات کی لفظیات میں بچوں کے لیے چاند تارے تراشے ہیں۔ یہ اسد رضا کی تحریر کا ہی فیضان ہے کہ یہ کتابیں مقبول عام ہیں اور خوب پسند کی جاتی ہیں۔ اسلوب نگارش سے متعلق فرح ناز کی یہ رائے درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے اسلوب کی خوبی سے معمولی اور غیر اہم بات کو بھی لطافت میں ڈھال کر اس طرح سنوارتے ہیں کہ کبھی کبھی ان کی تحریر میں لطیفے کے مزاح کا احساس بھی ہوتا ہے، جنھیں پڑھ کر قاری لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ وہ اپنے اسلوب میں تیکھے طنز کے مقابلے شوخ تحریر سے مزاح پیدا کر کے اپنی زندہ دلی اور بذلہ سنجی کا ثبوت دیتے ہیں اور ادبی سرمائے میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔

یقین کیا جانا چاہیے کہ فرح ناز کی یہ کتاب جہاں اسد رضا کی ادبی شناخت کے معیارات قائم کرنے میں معاون ثابت ہوگی، وہیں فرح ناز کے لیے بھی فکر و تحقیق کے نئے دریچے وا کرنے میں کامیاب ہوگی۔

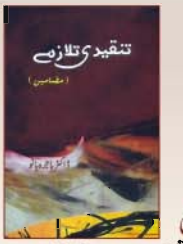

تنقیدی تلازمے

مصنف : ڈاکٹر ہاجرہ بانو

صفحات : 288، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2014

پبلشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر : ڈاکٹر ریاض الہاشم، 39۔T، سیکٹر 7، جسولہ وہار، نئی دہلی

ڈاکٹر ہاجرہ بانو بطور ایک انشائیہ نگار بھی مشہور ہیں۔ تحقیق میں ان کی تصنیف 'اردو انشائیہ اور بیسویں صدی کے اہم انشائیہ نگار' شائقین ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔ ادھر انھوں نے پچھلے کچھ برسوں میں کچھ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ زیر تبصرہ تصنیف ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل مجموعہ ہے۔

کتاب کو ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے افکار، اصناف، اشخاص، ابلاغ، اپنی مٹی اپنے رنگ اور نقد پارے، حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ افکار میں ان کے اہم مضامین ہیں۔ 'خواتین افسانہ نگاروں کے کرداروں کی تجسیم اور تقلیب' والے مضمون میں انھوں نے ایک جگہ سیاسی ادب کی بات کی ہے اور اسے ایک وقتی چیز قرار دیا ہے جو غلط فہمی پر مبنی ہے۔ ادب بہ یک وقت سیاسی اور سماجی ہوتا ہے لیکن ادب کی پہلی شرط اس کی ادبیت ہے۔ اس طرح انھوں ایک جگہ تہذیبی افسانے کی اصطلاح کو استعمال کیا جو سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ ادب اپنی تہذیب کا پروردہ ہوتا ہی ہے اس میں افسانے کی کوئی تخصیص نہیں۔ سب رس کو انھوں نے انشائیے کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے جبکہ انشائیہ مختصر افسانے اور ناول کی طرح واضح طور پر مغربی ادب کی دین ہے۔

دوسرے حصے کا آغاز مصنفہ نے 'انشائیہ میں غزل کا رنگ' سے کیا ہے، جو ایک تاثراتی نوعیت کا مضمون ہے۔ مصنفہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انشائیہ اور غزل دو الگ الگ اصناف ہیں۔ اس کے بعد مصنفہ نے بڑے مدلل انداز میں انشائیہ اور مقالہ کے فرق کو واضح کیا ہے۔ لیکن 'انشائیہ اور مقالہ کے خدوخال' عنوان غلط ٹائپ ہوا ہے جبکہ مقالہ کی جگہ مزاح ہونا چاہیے تھا۔ اور مضامین کے عنوان کی فہرست میں بھی غلطی ہے۔ شائد ٹائپ رائٹر کی غلطی ہو۔ 'مغرب میں ایسیز کا آغاز' اور 'اردو ادب کی شاہکار صنف ناول نگاری' دلچسپ مضامین ہیں، جو مصنفہ کے تنقیدی شعور کا پتہ دیتے ہیں۔ ناول والے مضمون میں انھوں نے ناول کے خدوخال سے بحث کی ہے۔ مصنفہ قرۃ العین حیدر کے اس قول سے متفق نظر آتی ہیں کہ ناول لکھنے کے لیے آپ کو سنجیدہ ہونا چاہیے، اور یہ ادب کی ہر صنف پر صادق آتا ہے۔

کتاب کے تیسرے حصے میں ڈاکٹر ہاجرہ بانو نے غالب، سرسید، ابوالکلام آزاد، سجاد حیدر یلدرم، میراجی، وزیر آغا وغیرہ کی حیات و ادبی خدمات کا مختصر مگر جامعہ جائزہ پیش کیا ہے۔

چوتھا حصہ ابلاغ پر مشتمل ہے۔ اس حصے کے پہلے باب میں صحافت اور ادبی صحافت کے خدوخال کو واضح کرنے کی ادھوری کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے آخری حصے کا عنوان 'نقد پارے' ہے، جس کا عنوان اگر 'تحسین پارے' ہوتا تو بہتر ہوتا، کیونکہ ایس ایم ایس۔ ای میل اور فون پر تحسینی کلمات سے نوازنا کسی بھی صورت میں نقد پارہ نہیں کہا جا سکتا۔

آخر میں کہوں گا کہ یہ کتاب معلومات سے پر ہے۔ اس کے مضامین کافی دلچسپ ہیں۔ ڈاکٹر ہاجرہ بانو کی زبان کافی سلجھی ہوئی ہے۔ جسے ہمارے یہاں کچھ لوگ تنقیدی زبان بھی کہتے ہیں۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے اور طباعت بے حد عمدہ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب قارئین کو ضرور پسند آئے گی۔

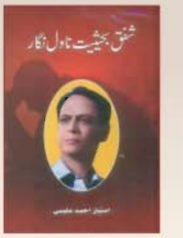

شفق: بحیثیت ناول نگار

مصنف: امتیاز احمد علیمی

صفحات: 212، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: اسحاق مصباحی، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

'شفق بحیثیت ناول نگار' مصنف کی پہلی اور کامیاب تصنیف ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شفق کے مکمل فنی ادراک و تفہیم کے سلسلے میں بھی یہ پہلا تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ سرورق دیدہ زیب، سادہ اور جاذب نظر ہے۔ ساتھ ہی شفق کی تصویر کتاب کی دلکشی میں مزید اضافہ کرتی ہے۔

مذکورہ کتاب میں شفق کے تخلیقی کارناموں اور اس دور کے بدلتے ہوئے رجحانات نیز فکشن پر مرتب ہونے والے اثرات کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ پیش کرنے کی کامیاب اور لائق ستائش کوشش کی گئی ہے۔ مصنف نے کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ شفق کے سوانحی کوائف پر مشتمل ہے۔ جس میں شفق کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات، شکل و شباہت، مسلک و مذہب، تخلیقی سفر کا آغاز، ملازمت اور ان کی وفات سے متعلق اہم معلومات کو نہایت ہی اختصار اور جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اور شفق کے تخلیقی فن پاروں میں افسانہ، ناول، خاکہ، اور مقالوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے اردو ادب میں شفق کی ادبی حیثیت اور ان کے مقام و مرتبے نیز ایک فنکار کی حیثیت سے ان کی اہمیت و انفرادیت کو اجاگر کرنے کی مکمل سعی کی گئی ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ 'شفق اور ان کے معاصرین فکشن نگار' کے عنوان سے ہے۔ جس میں ان کے معاصر تخلیق کاروں میں حسین الحق، عبدالصمد، علی امام نقوی، مظہر الزماں خاں اور اقبال مجید پر ان کے ناولوں کی روشنی میں اختصار کے ساتھ تجزیے کی کوشش کی گئی ہے اور ان تمام فکشن نگاروں کی تخلیقات کو اس عہد کے ادبی رجحانات کے تحت پرکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے جس کے مطالعے سے قاری پر یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جس دور میں شفق اور ان کے معاصرین اپنے فن پارے تخلیق کر رہے تھے وہ جدیدیت سے مابعد جدیدیت میں داخل ہونے کا دور تھا جس میں زیادہ تر علامتی اسلوب بیان اختیار کیا جاتا تھا اور زندگی سے فرار، جذباتی زندگی سے وابستگی اور خوف و مرگ جیسے موضوعات کو تخلیقی فن پاروں میں برتا جاتا تھا جس کا اثر براہ راست شفق اور ان کے معاصرین فکشن نگار پر بھی پڑا، چنانچہ ان لوگوں نے بھی اس عہد کے تقاضے کو اپنے فن پاروں میں جگہ دی اور

ادبی دنیا میں اپنی اہمیت وانفرادیت کوتسلیم کرالیا۔

کتاب کے تیسرے حصے میں شفق کی دیگر نگارشات کے تحت گفتگو کی گئی ہے جس میں شفق کے افسانوں، خاکوں، اوران کا مقالہ 'اردو داستانوں میں ویلن کا تصور' کا تحقیقی اورتنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے تخلیقی فن پاروں کی خامیوں اورخوبیوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح سے مصنف نے شفق کی دیگر نگارشات کے تحت ان تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی فنی اورادبی حیثیت کومتعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا چوتھا حصہ 'شفق کے ناولوں کا تنقیدی محاسبہ' کے عنوان سے ہے جس میں مصنف نے شفق کے تینوں ناول کانچ کا بازی گر، بادل اور کابوس پر مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔

اس کتاب کا پانچواں حصہ شفق کے ناولوں کے موضوعات، زبان اور اسالیب ہے۔ اس حصے میں مصنف نے شفق کے ناولوں خاص طور سے 'کانچ کا بازی گر' کے موضوع کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے کیونکہ شفق کا ناول 'کانچ کا بازی گر' ایک پیچیدہ اور مبہم ناول ہے جس کے موضوع کا تعین خاصا مشکل کام ہے۔ زبان وبیان اور اسلوب کے حوالے سے بھی شفق کے ناول کافی اہم ہیں ان کی بعض تخلیقات کی زبان اور اسلوب سادہ وسلیس ہے۔

کتاب کے اخیر میں شفق کے نام عصمت چغتائی کا ایک غیرمطبوعہ خط بھی شامل کیا گیا ہے جس میں عصمت چغتائی نے جدیدیت پر نہایت ہی واضح انداز میں روشنی ڈالی ہے اور جدید ادب کی اہمیت وافادیت کو بیان کیا ہے۔ بہرحال 'شفق بحیثیت ناول نگار' اپنے مواد، موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے معیاری کتاب ہے۔

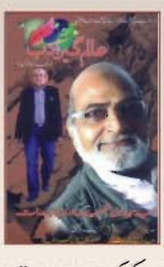

عالمگیر ادب، اورنگ آباد دکن

(پروفیسر حمید سہروردی: شخصیت اورادبی جہات)

مدیر: عارف خورشید، ترتیب وتحقیق: ڈاکٹرغضنفر اقبال، خرم عماد

شمارہ (5) مارچ 2014، صفحات: 688، قیمت: 500 روپے

ناشر: کاغذ پبلشرز، زبیر کالونی، ہاگر گا کراس، رنگ روڈ، گلبرگہ

مبصر: عزیز بلگامی، 43/373، بھونیشوری نگر، مین روڈ، گوپال گنج، بنگلور

'حمید سہروردی: شخصیت اورادبی جہات' کے عنوان سے، جسے دیکھ کر ہم حیران تھے کہ ممدوح اور مداحین ایک ہی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اوران سب نے مل کر اپنے ممدوح کے لیے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ بعض خاص وجوہ سے اسے ہم کارنامہ کہنا چاہتے ہیں اور یہ کہ فکر ونظر کی تاریکی میں جس چراغ نے ادب اور شعروسخن کے بے شمار گوشے منور کیے اورادبی کائنات کی شش جہات میں صالح فکر کی روشنی پھیلائی، اس کے گھر میں ایک ایسی نسل پلی بڑھی اور رہی بسی ہے جواس کے کاز اور کارکو آگے بڑھانے کی نہ صرف متمنی ہے بلکہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا بھی منوا رہی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اگر گھر کا بزرگ قلم کار چاہیے تو اپنے گھر کو بھی اپنے رنگ میں رنگ سکتا ہے۔ اس کا ثبوت عالمگیر ادب کی یہ ضخیم کتاب ہے۔ جو خالصتاً اس کے فرزندان ذی مرتبت کے کارنامے کی حیثیت سے ہمارے سامنے ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے پروفیسر حمید سہروردی نے اپنے گھر کو متاثر کیا ہے پھر ساری ادبی دنیا پر اپنے فکر وفن کے انمٹ نقوش ثبت کیے جو ایک نادر واقعہ سے کم نہیں۔ ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ادبا اور شعرا کوئی زمانہ اگر سب سے زیادہ کوئی نہیں جانتا ہے تو وہ ہے اس کی اولاد اور اس کے اہلِ خانہ۔ اس اعتبار سے ہم پروفیسر سہروردی، کو، ان کے اہل وعیال سمیت خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ پورے کا پورا خاندان ایک ٹیم بن کر اردو کی خدمت انجام دے رہا ہے اور جم کر انجام دے رہا ہے۔ تاریخ ادب میں ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے نہ صرف گھر کے اندر سے بلکہ بیرون سے بھی کمک منظّم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ چنانچہ جن ادبا شعرا اور قلم کاران ادب کی ایک قطار ہمیں زیرنظر کتاب میں نظر آتی ہے اور جنھوں نے آگے بڑھ کر اس کارِ عظیم میں اپنا نام درج کروایا ہے، اس کا کریڈٹ بھی ہم پروفیسر حمید سہروردی کے فرزندان کو ہی دینا چاہتے ہیں۔ قابل مبارک باد ہیں عالمگیر ادب کے مدیر محترم عارف خورشید، جنھوں نے اپنی ادارت میں ڈاکٹر غضنفر اقبال اور خرم عماد کو اپنے ساتھ رکھا۔

کتاب کا آغاز عارف خورشید کے فکر انگیز اداریے سے ہوتا ہے۔ 'خاکے' کے زیرعنوان ڈاکٹر وہاب عندلیب، امجد علی فیض، منظور وقار صاحبان نے موضوعات کے خوب خاکے کھینچے ہیں۔ منظومات کے عنوان کے تحت راہی قریشی، جمیل مجاہد، مناظر عاشق ہرگانوی، نورالدین نور، مسعود سراج، رؤف صادق اور شاد رمزی نے توصیفی شعروں کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ انٹرویوز میں، م ناگ، ڈاکٹر سید احمد قادری، نورالحسنین، نثار احمد صدیقی، محمد عارف اقبال، عارف خورشید، ڈاکٹر عبدالحی (نائب مدیر، ماہنامہ اردو دنیا نئی دہلی) کے انٹرویوز سے پروفیسر حمید سہروردی کی ہمہ گیر فکر کا وسیع کینوس ابھر کر سامنے آتا ہے۔

پروفیسر حمید سہروردی کے افسانوی فن پر، جوگندر پال، پروفیسر اختر یوسف، سلیم شہزاد، کلام حیدری، دیویندر اسر، جیلانی بانو، رشید امجد، فیروز عابد، کمار پاشی، ندا فاضلی، عبدالاحد ساز نے اپنے قلم کے گہر لٹائے ہیں۔ افسانہ نگار بہ نظر نقاد و مبصر کے تحت پروفیسر گوپی چند نارنگ، انور سدید، وہاب اشرفی، شمس الرحمٰن فاروقی، عصمت جاوید، حقانی القاسمی نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔

پروفیسر حمید سہروردی کی نظم نگاری پر قاضی سلیم، عتیق اللہ، مشرف عالم ذوقی، سید اختر صادق اور ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی نے جم کر لکھا ہے۔

حمید سہروردی کے ادبی مضامین پر، محمد علی صدیقی، فضیل جعفری، ابن فرید، انیس اشفاق، ساجد حمید، مظفر شہ میری، سردار سلیم، ڈاکٹر محبوب ثاقب جیسے ارباب قلم ہیں جن کے رشحات قلم کتاب کی شان بڑھاتے ہیں۔

صاحب کتاب پر معاصرین کے تاثرات کے تحت، ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی، عشرت ظفر، قدیر زماں، اقبال سعود، رؤف خورشید، شاہ حسین نہری، محمود شاہد، ڈاکٹر سید اقبال خسرو قادری، ڈاکٹر حبیب نثار، پروفیسر محمد اعظم شاہد، ڈاکٹر داؤد محسن، پروفیسر سید شاہ مدار عقیل، اور محمد کاشف رضا شاد مصباحی کی فکری کاوشیں بھی جگمگاتی نظر آتی ہیں۔

اردو ادب کی مثبت اور صالح قدروں کے امین عالمگیر ادب اورنگ آباد کے کتابی سلسلے (5) کے مدیر عارف خورشید نے مدیرانہ صلاحیتوں کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ مجلس مشاورت میں پروفیسر شاہ حسین نہری، نورالحسنین، اسلم مرزا، ڈاکٹر عظیم راہی جیسے خدمت گارانِ اردو شامل ہیں۔

عالمگیر ادب (پروفیسر حمید سہروردی: شخصیت اورادبی جہات) دیکھ کر ایک حسرت سی ہمارے دل سے بھی اٹھتی ہے کہ اس کتاب میں ہم دو سطر بھی لکھنے کے قابل نہ ہوئے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس کتاب کی قبولیت کو چہار دانگ عالم میں پھیلا دے اور محققین کے لیے ایک نمونہ بنائے اور طلبائے ادب کی خاطر رہنمایانہ دستاویز بھی۔ نیز فرزندانِ حمید سہروردی کی عمر میں برکت دے اور انھیں حمید سہروردی کا حقیقی ادبی وارث بنائے اور دنیا کو علامہ اقبال کے الفاظ میں یہ کہنے کا کبھی موقع نہ ملے کہ:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر وارثِ میراث پدر کیوں کر ہو

■

بجلی بچانے کے
آسان اور مفید طریقے

بجلی بچاؤ ملک بناؤ

گھر بیٹھے ہی توانائی بچت تحریک میں حصہ لیں

- سبھی بلبوں کو بجلی بچانے والے LED بلبوں سے بدلیں۔
- استعمال نہ ہونے پر سبھی پنکھے اور بلب بند رکھیں۔
- استعمال نہ ہونے کے وقت سبھی الیکٹریکل سامان پلگ سے ہٹا دیں۔
- ٹی وی، سیٹ ٹاپ باکس، ڈی وی ڈی پلییئر اور مائکرو ویو اسٹینڈ بائی موڈ میں بھی کئی واٹ بجلی خرچ کرتے ہیں۔
- استعمال میں نہ ہوں تو کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کو بند کر دیں۔
- اس بات کو یقینی بنائیں کہ ریفریجریٹر کے دروازے کی سیل ائرٹائٹ ہو۔
- ایئر کنڈیشنر کا درجہ حرارت 25-26ºC پر رکھیں۔ ایسے میں AC کے ساتھ پنکھے کا استعمال بہتر ہوگا۔
- ایئر کنڈیشنر کے درجہ حرارت میں ہر ایک ڈگری کے اضافے سے 3-5% تک بجلی بچائی جا سکتی ہے۔
- ایئر کنڈیشنز کے فلٹروں کی مسلسل صفائی کریں۔
- صرف BEE اسٹار لیبل لگی ہوئی اشیا اور مصنوعات خریدیں۔

davp 34106/13/0007/1516

विद्युत मंत्रालय
(भारत सरकार)

स्वच्छ भारत
एक कदम स्वच्छता की ओर

ऊर्जा दक्षता ब्यूरो
(विद्युत मंत्रालय)
www.beeindia.in

توانائی بچائیں پیسے بچائیں

قومی اردو کونسل اردو صحافت کا دوسو سالہ عالمی جشن ملکی سطح پر منائے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں مذاکرے کا اہتمام

نئی دھلی: قومی اردو کونسل حکومت ہند، نئی دہلی کے زیر اہتمام ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو اخبارات وارد و چیلنلز کے مدیران ونمائندگان نے شرکت کی۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے استقبالیہ کلمات پیش کیے اور اس مذاکرے کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سال 2016 میں اردو صحافت کے دوسو سال پورے ہورہے ہیں کیونکہ 'جام جہاں نما' سے قبل بھی اردو صحافت کی تاریخ ملتی ہے اس لیے کونسل ایک شایانِ شان پروگرام ملکی سطح پر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔
مذاکرے میں موجود تمام صحافیوں نے اس قدم کی پرزور حمایت کی اور اس تعلق سے متعدد تجاویز پیش کیں جن میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ کونسل اپنے دوسو سالہ جشن کا آغاز کلکتہ سے کرے کیونکہ کلکتہ ہی اردو صحافت کا پہلا مرکز ہے۔ پھر اس کے بعد ملک کی مختلف ریاستوں میں اس حوالے سے پروگرام کرے اور مقامی لوگوں کو بھی شامل کرے۔ اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کونسل دوسو سالہ جشن سے متعلق تمام پہلوؤں پر غور کرے گی اور اردو صحافت کے دوسو سالہ سفر پر ایک جامع کتاب اور ڈاکومینٹری بھی تیار کرے گی تاکہ اردو کے ان عظیم صحافیوں کو سچی خراجِ عقیدت پیش کی جاسکے جنھوں نے اردو صحافت کے معیار کو بلند کرنے اور قوم وملک کو اپنی نمایاں خدمات پیش کیں۔ انھوں نے کہا کہ اس موقعے پر کونسل ایک تصویری البم بھی تیار کرے گی تاکہ اردو صحافیوں کی یادگاروں کو محفوظ کیا جاسکے اور اس تعلق سے کونسل وقتاً فوقتاً ماہرین سے صلاح ومشورہ کرتی رہے گی۔
مذاکرے میں موجود صحافیوں نے اردو صحافت کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اردو اخبارات پیشہ ورانہ ماہرین، مترجمین اور زبان وبیان پر اچھی دسترس

کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم اور پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال صحافیوں سے گفت وشنید کرتے ہوئے

رکھنے والوں کی کمی سے جوجھ رہے ہیں۔ اس لیے کونسل اردو اخبارات کے ان مسائل پر بھی توجہ دے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کونسل اردو اخبارات کی مالی مدد کے لیے یو این آئی اردو سروس کو 50 فیصد سبسڈی مہیا کراتی ہے اور اب کونسل مزید ان مسائل پر بھی غور کرے گی۔ مذاکرے میں 'راشٹریہ سہارا' کے مدیر جناب اسد رضا، 'جدید خبر' کے مدیر جناب معصوم مرادآبادی، روزنامہ 'خبریں' کے مدیر ڈاکٹر زین شمسی، یو این آئی اردو کے سربراہ جناب عبدالسلام عاصم،

روزنامہ 'انقلاب' کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر جناب یامین انصاری، 'چوتھی دنیا' کی مدیر ڈاکٹر وسیم راشد، جناب فاروق ارگلی اور روزنامہ 'سیاسی تقدیر' کے مدیر جناب محمد مستقیم، 'پیغام' مادر وطن' کے جناب ایم رحمٰن عزیز، روزنامہ 'ہمارا سماج' کے جناب عامر سلیم خان، پی ٹی آئی بھاشا کے نمائندے جناب انوارالحق، ہند نیوز کے جناب عابد علی عاصمی، روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' کے جناب شاہدالاسلام، معروف صحافی جناب ایم جے خالد اور 'عالمی سہارا' اردو چینل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر جناب شکیل احمد، زی سلام کی نائب صدر محترمہ برکھا ارورا، ای ٹی وی اردو کے جناب خرم علی شہزاد اور منصف ٹی وی کے جناب محمد انظراللہ، روزنامہ صحافت کے جناب ضیاء الرحمٰن اور معروف صحافی جناب شعیب رضا فاطمی نے بھی شرکت کی اور اپنی اپنی تجاویز کونسل کو پیش کیں۔

کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے تمام صحافیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا کہ کونسل ان تمام تجاویز پر غور کرے گی اور انھیں مینڈیٹ کے مطابق عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گی۔ کونسل کے ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، اعزازی مدیر جناب نصرت ظہیر اور ریسرچ اسسٹنٹ ڈاکٹر قاسم انصاری نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 جون 2015

ہمارا فرض ہے کہ ہم لوگوں کو کتابوں کے قریب لانے کی کوشش کریں: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں اردو پبلشرز و بک سیلرس کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت فروغ اردو بھون میں آج اردو پبلشرز و بک سیلرس کے ساتھ ایک میٹنگ منعقد ہوئی، جس میں کونسل کے زیراہتمام پچھلے کتاب میلے کی سرگرمیوں اور کامیابی پر گفتگو کی گئی۔ اس بات پر بھی اتفاق رائے ظاہر کیا گیا کہ قومی اردو کونسل کے میلے جہاں بھی منعقد ہوں مقامی طور پر وہاں کے این جی او اور اردو کی مختلف تنظیموں، اداروں کے ساتھ مل کر کام کیا جائے، کیوں کہ اردو اکادمیاں بہت زیادہ فعال نہیں ہیں اور مقامی سطح پر اردو کے چھوٹے ادارے اس طرح کے میلوں اور نمائش میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ میٹنگ میں پبلشروں کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ آپ کی شمولیت سے ہمارے کتاب میلے کامیاب ہوئے ہیں، آپ کتاب میلوں کے حوالے سے اپنی رائے پیش کریں اور اسی روشنی میں ہم آئندہ کتاب میلوں کا لائحہ عمل مرتب کریں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کتاب میلہ اردو کا تہوار ہوتا ہے، جس میں ہم اردو آبادی تک اردو کی کتابیں مناسب قیمت پر پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کتابوں سے بے اعتنائی اور دوری کو دیکھتے ہوئے ہمارا فرض ہے کہ ہم لوگوں کو کتابوں کے قریب لانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

حیدرآباد میں اردو کی ایک بڑی آبادی کو مدنظر رکھتے ہوئے میٹنگ میں اس بات پر بھی غور خوض کیا گیا کہ کونسل اپنا اگلا میلہ حیدرآباد میں منعقد کرے۔ پبلشروں کی رائے تھی کہ کونسل سال میں ایک سے زائد کتاب میلے کا انعقاد کرے، جس میں ایک مہاراشٹر میں ہو جہاں کے لوگوں میں کتابوں کے تئیں زیادہ محبت اور دوستی نظر آتی ہے۔ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے کہا کہ ہندوستان میں جہاں بھی میلہ منعقد ہوتا ہے ان میں اردو بستیوں میں ہونے والے میلے میں ہم کوشش کریں گے کہ اردو کے لیے الگ اردو پویلین کا انعقاد کیا جائے، جس میں سارے پبلشرز ایک جگہ دکھائی دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس سال جہاں جہاں کونسل سیمینار کرنے جا رہی ہے جیسے۔ کلکتہ، سری نگر، بھوپال، پٹنہ، ممبئی، حیدرآباد ان جگہوں پر چھوٹے پیمانے پر کتاب نمائش کا انعقاد بھی کیا جائے۔

میٹنگ میں الحسنات بکس پرائیوٹ لمیٹیڈ، فروز میڈیا ملی گیزٹ، ایفا پبلیکیشن، اردو بک ریویو ہنی بکس ڈپو، منشورات بک ڈپو، ایم آر پبلی کیشن، بھارت سیوک فاؤنڈیشن، اسلامک بک سروس، ادارہ اپیکس، معصومہ اینڈ کمپنی، قاضی پبلشرز، رہبر بک سروس اور کتب خانہ حمیدیہ کے نمائندوں نے شرکت کی۔ ان کے علاوہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، کونسل کی اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی، ریسرچ آفیسر جناب شاہنواز خرم، سید ذاکر حسین نے بھی شرکت کی۔

قومی کونسل کے صدر دفتر میں اردو پبلشروں کے ساتھ میٹنگ کا منظر

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 9 جولائی 2015

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام شہرہ آفاق ناول نگار عبداللہ حسین کے انتقال پر تعزیتی نشست کا انعقاد

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے زیر اہتمام برصغیر کے ممتاز اردو ناول وافسانہ نگار عبداللہ حسین کے انتقال پر تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا، جس میں مرحوم کی موت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا گیا اوران کے اہل خانہ کے ساتھ اظہار ہمدردی کی گئی۔ کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ان کی موت کو پوری اردو دنیا کے لیے ناقابل تلافی خسارہ قرار دیا اور کہا کہ ان کی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ عبداللہ حسین نے ناول اور افسانے کے فن کو نہ صرف وسعت بخشی بلکہ اسے بلندی بھی عطا کی۔

14 اگست 1931 کو (گجرات، پاکستان) میں پیدا ہوئے، عبداللہ حسین نے کئی ایسے ناول تخلیق کیے جنھوں نے پوری اردو دنیا میں شہرت پائی۔ ان میں 'اداس نسلیں'، نادار لوگ، قید، باگھ، نشیب، رات اور افسانوی مجموعہ 'فریب' قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت ناول 'اداس نسلیں' کو ملی، ان کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انھیں 'کمال فن' کے اعزاز سے نوازا جو کہ پاکستان کا قومی سطح کا سب سے بڑا انعام کہا جاتا ہے۔ 'اداس نسلیں' اپنے موضوع کے اعتبار سے کل بھی اہمیت کا حامل تھا اور آئندہ بھی اردو ناول میں اس کی اہمیت باقی رہے گی۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ کونسل اس موقعے پر ان کی مجموعی ادبی وعلمی خدمات کو سلام کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کی دعا کرتی ہے۔

تعزیتی نشست میں ریختہ ڈاٹ کام کے سربراہ جناب سنجیو سراف، ڈاکٹر زمرد مغل، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر، پروفیسر محمد حلیم خان، کلکتہ کے شعبہ فارسی کے استاد پروفیسر احسان کریم برق اور کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک محترمہ شمع کوثر یزدانی اور ریسرچ آفیسر ڈاکٹر کلیم اللہ، و دیگر نے شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 6 جولائی 2015

معروف صحافی اور روزنامہ قومی تنظیم کے مدیر ایس ایم اجمل فرید، قوم کے ہمدرد تھے اور تنظیمی صلاحیت کے مالک بھی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے روزنامہ قومی تنظیم کے مدیر ایس ایم فرید کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور ان کے اہل خانہ کے ساتھ اظہار ہمدردی کی ہے۔ ایک تعزیتی نشست میں انھوں نے کہا کہ مرحوم نے اپنے اخبار وقلم کو سماجی مسائل کا ترجمان بنا کر قوم وملک کی اہم ترین خدمت کی ہے، جس سے اردو زبان اور فن صحافت دونوں کو تقویت بھی ملی ہے۔ ان کی یہ خدمات موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک روشن مثال ہے، وہ قوم وملک کے سچے ہمدرد تھے۔ ان میں زبردست تنظیمی صلاحیت بھی تھی اور اخبار کی مقبولیت وکامیابی اس کی بہترین مثال ہے۔ اس لیے ان کی ان خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا اور قومی اردو کونسل ان کی ان خدمات کا بھرپور اعتراف کرتی ہے۔ ان کی موت سے ہم سبھی سوگوار ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم ایک سرگرم صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بااخلاق اور اچھے انسان تھے، ان کی موت سے ہم سبھی رنجیدہ ہیں۔ تعزیتی نشست میں کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور مرحوم کی خدمات کو سراہا۔ واضح رہے کہ مرحوم کو برین ہیمریج ہونے کی بنا پر پٹنہ سے دہلی لایا گیا تھا اور وہ دہلی کے اپولو ہسپتال میں زیر علاج تھے لیکن طبیعت میں سدھار نہ ہونے کی وجہ سے آخر کار بتاریخ 15/07/2015 بروز بدھ کو اپنے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 جولائی 2015

زبان کی ترقی کے بغیر اردو ادب فروغ نہیں پاسکتا: ارتضیٰ کریم

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر اور ممتاز نقاد پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا ہے کہ اردو زبان کی ترقی کے بغیر اردو ادب مزید فروغ نہیں پاسکتا۔ اردو میں تخلیقی وتنقیدی ادب کی بنیادیں پہلے سے ہی مستحکم ہیں۔ ضرورت زبان کو پھیلانے کی ہے۔ مہاراشٹر اور جنوبی ہند کے محبانِ اردو کی تعریف کرتے ہوئے پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ جس لگن اور مستعدی سے ان علاقوں کے لوگوں نے اردو کی بنیادی تعلیم کو فروغ دیا ہے اسی جذبے سے شمالی میں بھی اردو کے تعلیمی وتدریسی ڈھانچے کو مضبوط کیا ہے جس کے ساتھ وہ تقسیم وطن سے پہلے لوگوں کے تہذیب کو فروغ دے رہی تھی جس کا دوسرا نام فروغ اردو زبان کے لیے کئی نئے منصوبوں پر غور تمام اردو نوازوں سے مشورے اور ممکنہ تجویزیں سامنے باتیں کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں مشہور کی رسم اجرا پر کہیں۔ انھوں نے کہا کہ 'ادب ساز' نے

ہندوستان بالخصوص اتر پردیش بہار اور مدھیہ پردیش جائے تو اردو کی وہی شان وشوکت پھر واپس آسکتی دلوں پر راج کرتی تھی اور اُس ملی جلی گنگا جمنی ہندوستانیت ہے۔ انھوں کہا کہ قومی اردو کونسل کررہی ہے اور اس سلسلے میں اس نے ملک کے رکھنے کی بھی اپیل کی ہے۔ پروفیسر کریم نے یہ ادبی مجلّے 'ادب ساز' کی اشاعتِ نو کے پہلے شمارے ماضیِ قریب میں ادبی صحافت کے اعلیٰ معیار کیے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اب یہ اہم جریدہ پابندی سے شائع ہوتا رہے گا۔ اشاعتِ نو کے ابتدائی شمارے میں اردو کے البیلے شاعر شجاع خاور کے فن اور شخصیت کو خاص موضوع بنانے کے لیے انھوں نے مجلّے کے مدیر نصرت ظہیر اور پبلشنگ کمپنی فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائریکٹر محمد ناصر خاں کو مبارک باد دی۔ ممتاز صحافی اور ادیب فاروق ارگلی نے پروفیسر ارتضیٰ کریم کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ جب تک زبان پھلے پھولے گی نہیں تب تک ادب کیسے فروغ پاسکتا ہے۔ انھوں نے پروفیسر کریم کے حسنِ انتظام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ دہلی یونیورسٹی میں انھوں نے اردو کے فروغ کے لیے جس خوبی سے کام کیا وہ ان کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی روشن دلیل ہے۔ انھوں نے 'ادب ساز' کی بھی تعریف کی اور کہا کہ اس رسالے نے بہت کم عرصے میں 'فنون' اور 'نقوش' جیسے عظیم جریدوں کی پیروی کرتے ہوئے اردو ادب میں اپنی خاص جگہ بنائی تھی۔ روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 27 جون 2015

پروفیسر ارتضیٰ کریم کو استقبالیہ

حیدرآباد: اردو زبان و ادب کے لیے منضبط اور ٹھوس کام کرنے کے لیے یہ زمانہ بہت موزوں ہے اور وہ اس لیے کہ مرکزی حکومت مستحکم ہے اور موجودہ مرکزی حکومت اقلیتوں اور اردو کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہے۔ مجھے کسی بھی طرح کی شرائط کے بغیر یہ ذمے داری سونپی گئی ہے اور اس عہدے کا جائزہ لینے کے بعد جب مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل اسمرتی ایرانی سے میری ملاقات ہوئی تو بہت سارے منصوبوں کے علاوہ یہ بھی طے پایا کہ کونسل کے پانچ چھ علاقائی مراکز قائم کیے جائیں۔ ہم نے چار سنٹرز کی مانگ کی تو مجھ سے کہا گیا کہ چار نہیں آپ چھ سنٹرز قائم کیجیے۔ اس کے علاوہ پی ایچ ڈی اور ایم۔فل کے ریسرچ اسکالرز کے لیے ساٹھ وظائف کی ہم نے مانگ کی تو کہا گیا کہ اتنے بڑے ملک میں صرف ساٹھ اسکالرشپ بہت کم ہوں گے۔ لہٰذا کم سے کم سو اسکالرشپ ان ریسرچ اسکالرز کو منظور کیے جائیں گے جنھیں کسی ادارے سے کوئی اسکالرشپ نہیں ملتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ارتضیٰ کریم، ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے ان کے اعزاز میں منعقدہ استقبالیہ جلسے میں کیا۔ جلسے کا اہتمام اردو ریسرچ اسکالرز فورم، ہیناریٹی ایمپلائز ویلفیئر ایسوسی ایشن، یونیورسٹی آف حیدرآباد اور حیدرآباد فکشن اکادمی نے اسکول آف ہومنیٹیز آڈیٹوریم، یونیورسٹی آف حیدرآباد میں

کیا تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سامعین سے کہا کہ ان کا ارادہ ہے کہ وہ ادب کے مقابلے اردو زبان کے فروغ پر زیادہ توجہ دیں گے اور چونکہ یہ ادارہ مرکزی حکومت کا ادارہ ہے اس لیے ہر یونیورسٹی اور ہر ادارے سے ہم پورا تعاون کریں گے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 13 جون 2015

ڈائرکٹر قومی اردو کونسل کا روزنامہ سیاست کے دفتر کا دورہ

حیدرآباد: ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) نے روزنامہ 'سیاست' کے دفتر پہنچ کر جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر 'سیاست' سے ملاقات کی۔ اس موقع پر پدم شری جناب مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر زاہد الحق کے علاوہ دیگر موجود تھے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) نے ملک میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں کونسل کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات کو وسعت دینے کے متعلق فیصلہ سے واقف کرواتے ہوئے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ریجنل دفاتر کا قیام ملک بھر کے مختلف علاقوں میں عمل میں لایا جائے گا تا کہ کونسل کے منصوبوں اور زبان کو درپیش مسائل کا جائزہ لیا جاسکے۔ ملاقات کے دوران انھوں نے جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر 'سیاست' کی اردو دوستی اور اخبار سیاست کی جانب سے انجام دی جانے والی فلاحی خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اخبار سیاست کے زیر اہتمام چلائے جانے والے فلاحی کاموں کا مشاہدہ کرنے کے لیے چند گھنٹے کافی نہیں ہیں بلکہ کم از کم ایک دن مکمل طور پر 'سیاست' میں گزارنے کے بعد ہی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملت کی ترقی کے لیے ادارہ کی جانب سے کیا خدمات انجام دی جارہی ہیں۔

جناب زاہد علی خاں نے اس موقع پر انھیں ادارہ سیاست کی جانب سے چلائی جانے والی مختلف فلاحی سرگرمیوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ادارہ سیاست اپنے قارئین وفرزندان حیدرآباد کی اعانت سے ان خدمات کو انجام دے رہا ہے۔ پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم) نے ادارہ سیاست کی جانب سے چلائی جانے والی خطاطی کی کلاسیس کے علاوہ کمپیوٹر تربیت کے مرکز کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کی ستائش کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ اخبار کے ذریعے چلائی جانے والی یہ سرگرمیاں قابل تقلید ہیں۔ اس موقع پر جناب ظہیرالدین علی خاں مینجنگ ایڈیٹر روزنامہ 'سیاست' نے ادارہ سیاست کی جانب سے چلائی جانے والی فلاحی سرگرمیوں کی تفصیل پیش کی اور سیاست کی ویب سائٹ کی مقبولیت کے متعلق ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کو واقف کروایا۔ جناب مجتبیٰ حسین نے پروفیسر ارتضیٰ کریم کو ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نامزد کیے جانے پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ قومی ادارہ کی ذمے داری ان کے کندھوں پر عائد کی گئی ہے اور توقع ہے کہ ان کے دور کارکردگی کے دوران اردو زبان کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں عملی اقدامات کو یقینی بنایا جائے گا۔

روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد، 11 جون، 2015

کونسل کے تعاون سے

اردو کے فروغ میں اڈیشا کی مختلف تنظیموں کا کردار

بھونیشور: مدنی ویمنس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے بھونیشور ریڈکراس ہال میں 'اردو کے فروغ میں اڈیشا کی مختلف تنظیموں کا کردار' کے موضوع سے مورخہ 20 مئی 2015 کو بہت ہی تزک واحتشام سے منعقد ہوا۔ سیمینار کی صدارت اڈیشا اسٹیٹ بورڈ آف مدرسہ ایجوکیشن کے سابق سکریٹری جناب الحاج سید عطامحی الدین حبیبی نے کی اور نظامت جناب شیخ عزیز الباری نے کی۔ محترمہ ریحانہ خانم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جبکہ سید انظرندیم نے 'ترانہ ہند' سے اپنا کلام شروع کیا۔ اڈیشا کے کم وبیش 10 ضلعوں سے اردو کے شیدائی اور اہل ذوق حضرات نے شرکت کی جن میں پروفیسر مبین اللہ، الحاج سید عطامحی الدین حبیبی، حسین ربی گاندھی، مولانا محمد مطیع اللہ نازش، جناب شخاوت اللہ، سید اقبال رضوی، سید انظر ندیم، محترمہ ریحانہ خان صاحبہ، مولانا شیخ نواب علی، فیض الباری، شمس تبریز وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس موقعے پر بحیثیت مہمانِ اعزازی جناب پرسن پاٹھ سانی ممبر لوک سبھا شامل ہوئے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے اور گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان ہے۔ جو ہندوستان ہی نہیں بلکہ برطانیہ، امریکہ، کناڈا اور بہت سارے ممالک میں بولی جاتی ہے اور اس کے بغیر ہندوستان کا فلم جگت ادھورا ہے، ہم سب کو مل کر اس زبان کی ترقی کی کوشش کرنی چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا اڈیشا جیسی ریاست میں سیمینار منعقد کرنے پر ہم شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے چلائے جارہے ڈپلوما کمپیوٹر اور اردو، عربی زبان میں ڈپلوما کے امتحانات میں کامیاب ہونے والے طلبا کو جناب پرسن پاٹھ سانی ممبر لوک سبھا نے اپنے ہاتھوں سے اسناد تقسیم کی۔ اظہار تشکر جناب عزیز الباری نے کیا۔

رپورٹ: سید انظر ندیم، اڈیشا، 12 جون 2015

اردو کا مستقبل اور ہماری ذمے داریاں

میرا پور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے 'اردو کا مستقبل اور ہمادی ذمے داریاں' کے عنوان سے اسکائی لارک ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اشتراک مظفر نگر ہوٹل گولڈن میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ اقلیتی کمیشن کے ممبر مولانا مفتی ذوالفقار نے کہا کہ اردو کے روشن مستقبل کے لیے اردو سکھانے والے اداروں کی اہم

ضرورت ہے۔ ادارے قائم ہونے پر ہی ہم اردو سے متعلق اپنی ذمے داری کو بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اردو اکادمی سے انعام یافتہ ڈاکٹر تنویر گوہر نے کہا کہ اردو زبان کو مدرسوں ومکتبوں اور مسلمانوں کی زبان نہ سمجھ کر ہمیں اپنے غیر مسلم بھائیوں سے اس کی اہمیت ومٹھاس کو بیان کرنا چاہیے، تبھی اردو زبان ملک میں پھیلے گی۔ اس موقعے پر امیر اعظم سابق وائس چیئر مین نگر پالیکا مظفر نگر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سیمینار کی صدارت ریاض احمد ایڈوکیٹ نے کی جبکہ نظامت کے فرائض عبدالحق نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر وسیم احمد، ڈاکٹر فصاحت حسین، ڈاکٹر منصور شمسی، نسیم احمد، ڈاکٹر لطافت علی، ڈاکٹر ارشد حسین وغیرہ خصوصی طور پر موجود رہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 9 جون 2015

علامہ جمیل مظہری توسیعی خطبہ

دربھنگہ: این سی پی یو ایل نئی دہلی کے تعاون سے علامہ جمیل مظہری توسیعی خطبہ شعبۂ اردو، فارسی اور عربی، ملت کالج دربھنگہ میں 'کلیم عاجز کی شاعرانہ انفرادیت' کے عنوان سے 25 مئی 2015 کو دن کے گیارہ بجے منعقد ہوا۔ اس توسیعی خطبے کے لیے پروفیسر شاداب رضی، صدر شعبۂ اردو بھاگلپور یونیورسٹی تشریف لائے تھے۔ پروگرام کی صدارت مشہور بزرگ شاعر پروفیسر حافظ عبدالمنان طرزی صاحب نے کی اور نظامت ڈاکٹر ایس ایم رضوان اللہ کنوینر علامہ جمیل مظہری توسیعی خطبہ نے انجام دی۔ پروگرام کی ابتدا پروفیسر عطاء الرحمٰن کی تلاوتِ قرآن پاک سے ہوئی۔ اس موقعے پر وائس چانسلر ایل این متھلا یونیورسٹی پروفیسر ساکیت کشواہا بھی تشریف لائے۔ اس پروگرام میں ملت کالج دربھنگہ کے ترجمان 'صدائے ملت' کا اجرا ہوا۔ پروگرام کے شروع میں ہی محمد افضل نے کلیم عاجز کی مشہور غزل 'بلاتے کیوں ہو عاجز کو بلانا کیا مزا دے ہے' خوبصورت انداز اور آواز میں سنائی جسے سن کر سامعین محظوظ ہوئے۔ پروفیسر شاداب رضی نے اپنے خطاب میں پہلے کلیم عاجز کی شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی اور کہا کہ ان کی شاعری پر ان کی شخصیت کا مکمل عکس ہے اور جس طرح وہ دکھوں اور غموں سے گزرے ہیں اس کا پرتو ان کی شاعری ہے۔

صدر جلسہ پروفیسر عبدالمنان طرزی نے پروفیسر شاداب رضی کی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اکثر وبیشتر مشاعروں میں ہم دونوں ساتھ ہوا کرتے تھے لیکن جب کلیم عاجز پڑھ چکتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ''اب چراغوں میں روشنی نہ رہی'' والی بات ہوگئی۔ یعنی سامعین میں کلیم عاجز کو سننے کے بعد مشاعرے کی دلچسپی ختم ہوتی نظر آتی تھی۔ پروگرام کی ابتدا میں پرنسپل ڈاکٹر محمد رحمت اللہ نے اپنے استقبالیہ خطبے این سی پی یو ایل، نئی دہلی کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ اخیر میں ڈاکٹر افتخار احمد نے اظہار تشکر کیا۔

پریس ریلیز: پرنسپل ملت کالج، دربھنگہ، بہار 15 جون 2015

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

پریس کلب آف انڈیا کے عہدے داران کا اردو صحافیوں کے ساتھ تبادلۂ خیال

نئی دہلی: اردو سمیت تمام زبانوں کے صحافیوں کے مسائل پر مل کر آواز اٹھانے کے لیے پریس کلب آف انڈیا

سب سے موثر پلیٹ فارم ثابت ہوسکتا ہے۔ پریس کلب آف انڈیا (پی سی آئی) میں اپنی نوعیت کی پہلی میٹنگ میں دوبارہ منتخب صدر راہل جلالی نے شرکا سے خطاب کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ یوں تو حکومت اردو صحافت کے فروغ کے نام پر بہت کچھ کرنے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن اس کے ٹھوس نتائج دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تمام صحافیوں کے مسائل تقریباً یکساں ہیں۔ میٹنگ میں کلب کے ذمے داران اور اردو صحافیوں نے باہمی تبادلہ خیال کیا اور اردو صحافت اور اس سے وابستہ صحافیوں کو درپیش مسائل سنے اور انھیں حل کرنے کے لیے مل بیٹھ کر راستہ تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔ پریس کلب آف انڈیا کے جنرل سکریٹری ندیم کاظمی نے کہا کہ کوئی بھی ورکنگ جرنلسٹ پریس کلب آف انڈیا کا رکن بن سکتا ہے لیکن افسوس کی بات ہے کہ اردو صحافیوں کی تعداد یہاں بہت کم ہے حالانکہ کسی زمانے میں متعدد نامور اردو صحافی اس کے رکن تھے۔ پروگرام کے کنوینر اے یو آصف نے میٹنگ کی غرض و غایت اور پریس کلب کی مختصر تاریخ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک تاریخی گھڑی ہے کہ پریس کلب نے اردو جرنلسٹوں کو جوڑنے کے لیے یہ مجلس منعقد کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ پریس کلب آف انڈیا کا قیام یکم جنوری 1950 کو ہی ہوگیا تھا تب تک ہمارا آئین بھی نہیں نافذ ہوا تھا۔ یہ موقع ہے کہ اردو میڈیا کے افراد اس سے وابستہ ہوکر ملک کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کریں۔ روزنامہ خبریں کے چیف ایڈیٹر قاسم سید نے ورکنگ جرنلسٹوں کے مسئلے کو سنجیدگی سے اٹھایا۔ انھوں نے مستقبل میں اردو کے سلسلے میں پروگرام منعقد کرانے، اردو اخبارات بھی کلب کے پیپر اسٹینڈ پر رکھنے، پریس کلب کے میگزین میں انگلش اور ہندی کے ساتھ اردو کا بھی گوشہ شامل کرنے کا وعدہ کیا۔ اس موقعے پر وسیم الحق، عارف اقبال، شیخ منظور احمد، معصوم مرادآبادی، فاروق ارگلی، عامر سلیم، طالب رام پوری، جاوید رحمانی، پروین عرشی، ایم جے خالد اور دھریندر جھا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر اردو اخبارات و رسائل اور الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ تقریباً تین درجن صحافی موجود تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 15 جون 2015

اردو گنگا جمنی تہذیب کی علامت

نئی دہلی: حکومت ہند سے اردو اور مسلمان کے تعلق سے فروغ پارہے تعصب کے فوری طور پر سدباب کا مطالبہ کرتے ہوئے اردو کے ممتاز ادیب اور پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ میں شعبہ جدید ادب کے سابق پروفیسر اور صدر ڈاکٹر نریش نے یہاں جاری ایک بیان میں کہا کہ اردو کو ملک میں اس کا جائز مقام دے کر اس کی بقا اور ارتقا کو یقینی بنایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ جب سے ملک آزاد ہوا، تین ایسے بڑے جھوٹ ہیں جن کو سچ بنانے کی کوششیں مسلسل جاری ہیں۔ پہلا جھوٹ یہ کہ جو مسلمان تقسیم ملک کے وقت پاکستان نہیں گئے، وہ ہندوستان کے تئیں وفادار نہیں ہیں۔ بجائے ان مسلمانوں کے جذبہ حب الوطنی کو سلام کرنے کے جنھوں نے اپنی مٹی کی محبت میں دو قومی نظریہ کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا، ان کو شک کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے اور انھیں ہند مخالف سمجھا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دوسرا بڑا جھوٹ یہ کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے جس زبان کا پہلا شاعر ہی ایک غیر مسلم (چندر بھان برہمن) ہوا اور جس کے ادب کو برج نارائن چکبست، دتاتریہ کیفی، دیا شنکر نسیم، پریم چند، سدرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، رگھوپتی سہائے فراق جیسے شعرا و ادبا نے تشکیل دیا ہو، وہ زبان مسلمانوں کی زبان کیسے ہوسکتی ہے؟ اردو کسی مذہب یا کسی فرقے کی نہیں، ہندوستان کی ملک گیر زبان ہے، ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ ڈاکٹر نریش نے مزید کہا کہ تیسرا بڑا جھوٹ یہ کہ اردو کی ترقی سے ہندی زبان کو نقصان پہنچے گا۔ جن دو زبانوں کی گرامر ایک ہو، ان زبانوں میں سے کسی ایک کی ترقی دوسری زبان کے لیے کیسے نقصان وہ ہوسکتی ہے؟ جس زبان کا نام (ہندی) ہی فارسی سے آیا ہو، اس کو اردو کے ارتقا سے کوئی خطرہ کیسے لاحق ہوسکتا ہے؟

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 24 جون 2015

سرسید کا 200 سالہ یوم پیدائش

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے بانی سرسید احمد خاں کے 200 سالہ یوم پیدائش کو بڑے پیمانے منعقد کرنے کے لیے کئی پروگراموں کا اعلان کیا ہے۔

واضح ہو کہ سرسید احمد خاں کا دوصد سالہ یوم پیدائش 17 اکتوبر 2017 کو منایا جائے گا۔ اس تعلق سے اے ایم یو کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیر الدین شاہ (رٹائرڈ) کے ذریعے تشکیل شدہ آرگنائزنگ کمیٹی کی ایک میٹنگ میں اہم فیصلے

ساہتیہ اکادمی یوا ساہتیہ پروگرام کا منظر

کیے گئے۔ مذکورہ کمیٹی کے صدر یو جی سی ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر اے آر قدوائی اور کنوینر شعبۂ عربی کے پروفیسر ابوسفیان اصلاحی ہیں۔ آرگنائزنگ کمیٹی کی میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ سرسید کی خدمات پر عربی، اردو اور انگریزی میں 3 کتب شائع کی جائیں گی، جن میں دنیا بھر کے دانشوروں کے مضامین بھی شامل کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ سرسید اور ان کے رفقا کی حیات پر مبنی تصاویر اور ان کے اقوالِ زرّیں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا جائے گا۔ اسی کے ساتھ سرسید پر دنیا کی اہم زبانوں میں ایک ببلیوگرافی بھی شائع کی جائے گی۔ کمیٹی نے یہ بھی طے کیا ہے کہ ہندی زبان میں سرسید کی سوانح بھی شائع کی جائے گی اور یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے تحت ان کی حیات و خدمات پر ریسرچ کرائی جائے گی۔ سرسید کی چندہ کتب کا انگریزی میں ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اکتوبر 2016 سے اکتوبر 2017 کے درمیان مختلف شعبوں اور اقامتی ہالوں کے تحت سرسید پر خطبات، سیمینار اور سمپوزیم منعقد کیے جائیں گے۔

کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ سرسید کی حیات و خدمات پر ایک عالمی سطح کا مضمون نویسی مقابلہ منعقد کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اردو ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے 2 خصوصی نمبر مارچ 2017 اور اکتوبر 2017 میں شائع کیے جائیں گے اور خود سرسید کے ذریعے شائع کردہ تہذیب الاخلاق کے شماروں کا ایک ری پرنٹ ایڈیشن بھی نکالا جائے گا۔ یونیورسٹی کے رسالے فکر و نظر کا بھی ایک خصوصی نمبر جنوری 2017 میں شائع کیا جائے گا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس تعلق سے آرٹ گیلری میں سرسید نمائش اور سرسید ہاؤس میں ایک لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو کا بھی انعقاد کرے گی، جو 2017 میں پورے سال تک چلے گا۔ سرسید کے مشن پر ایک فلم بھی بنائی جائے گی اور حکومت ہند کے محکمۂ ڈاک سے اپیل کی جائے گی کہ وہ سرسید پر ایک ڈاک ٹکٹ جاری کرے۔ اس کے علاوہ اس تقریب کے تعلق سے ایک ویب سائٹ بھی لانچ کی جائے گی اور اے ایم یو کے سابق طلبا اور بہی خواہوں کی مدد سے ملک کے مختلف شہروں میں سرسید کے تعلیمی مشن سے متعلق ریلیاں نکالی جائیں گی۔ یونیورسٹی کے باوقار سابق طلبا کی ایک ڈائرکٹری بھی شائع کی جائے گی۔ آرگنائزنگ کمیٹی کے صدر پروفیسر اے آر قدوائی نے پوری اے ایم یو برادری اور سابق طلبا سے اپیل کی کہ وہ سرسید کی صدی تقریبات سے متعلق اپنے مشورے ای۔ میل کے ذریعے ssbcelebration@gmail.com پر بھیج سکتے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 جولائی 2015

دھلی:

ساہتیہ اکادمی کا یوا ساہتیہ پروگرام

نئی دھلی: ساہتیہ اکادمی یوا ساہتیہ پروگرام کے تحت ساہتیہ اکادمی آڈیٹوریم میں ایک محفل افسانہ کا انعقاد کیا گیا جس میں جوان سال افسانہ نگار فیاض احمد وجیہ، نوجوان افسانہ نگار محمد فرقان سنبھلی اور خاتون افسانہ نگار نشاں زیدی نے اپنی اپنی کہانی پیش کی۔ ڈاکٹر نشاں زیدی نے اپنی کہانی 'تصویر کا دوسرا رخ' پیش کی جو جہیز کے موضوع پر تھی۔ فیاض احمد وجیہ نے اپنا افسانہ بیوٹی آف اسنیاک پیش کیا جس کا موضوع جنس تھا۔ یہ افسانہ موجودہ عہد کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی جنسی صورت حال پر مشتمل تھا جنسی بے راہ روی اور بے تکلفی کو بھی اسی افسانے میں جگہ دی گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد فرقان سنبھلی نے اپنا افسانہ، صلیب پر لٹکے ہوئے لوگ سنایا، اس افسانے میں بظاہر زمین پر خاندانی تنازع کو پیش کیا گیا ہے لیکن دراصل یہ اسرائیل اور فلسطین کے پس منظر کو پیش کرتا ہے۔ یہ کہانی دنیا کی ترقی کے لیے زمینی قبضے کو دور کرنے کی وکالت کرتی ہے۔ افسانہ کی اس نشست میں ساہتیہ اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے افسانہ نگاروں کا تعارف پیش کرتے ہوئے افسانے کی فکر و فن پر گفتگو کی اور نئی نسل کی کہانیوں کو معیاری قرار دیا۔ اس موقعے پر سوال و جواب کا سلسلہ بھی چلا، دہلی اور قرب و جوار کی سرکردہ شخصیات کے ساتھ یونیورسٹیوں کے طلبہ و طالبات نے بھی محفل افسانہ میں شرکت کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 19 جون 2015

ایس ایم علی کو دہلی اردو اکادمی کا اضافی چارج

نئی دھلی: اردو اکادمی کے موجودہ سکریٹری انیس اعظمی کی سبکدوشی کے بعد سکریٹری کا اضافی چارج 1993 بیچ کے دہلی کے اسپیشل سکریٹری رینک کے افسر سید مصور علی (ایس ایم علی) کو دیا گیا ہے۔ مستقل سکریٹری کی تقرری تک وہ اکادمی کی ذمے داریاں انجام دیں گے۔ ایس ایم علی فی الحال کوآپریٹو سوسائٹی دہلی کے ایڈیشنل رجسٹرار ہیں جبکہ انھیں وقف بورڈ کے سی ای او کا اضافی چارج بھی دیا گیا ہے۔ اس موقعے پر ایس ایم علی نے انقلاب سے بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ چونکہ آنریری پوسٹ ہے اس لیے قبل از وقت کچھ کہنا مشکل ہے تاہم دہلی اردو اکادمی کی ترقی کے لیے پوری محنت کے ساتھ کام کریں گے۔

واضح رہے کہ اردو اکادمی کے موجودہ سکریٹری انیس اعظمی 30 جون کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہوگئے، وہ پچھلے 30 سالوں سے اکادمی میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے جبکہ انھوں نے 16 دسمبر 2010 سے بحیثیت سکریٹری اپنی ذمے داری نبھائی۔ اس موقعے پر منعقدہ الوداعی تقریب میں پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر خالد محمود، پروفیسر شہپر رسول، پروفیسر شہزاد انجم، تحسین منور، معصوم مرادآبادی اور انجم عثمانی کے علاوہ راغب الدین اور شمیم احمد اور اکادمی کے تمام کارکنان موجود تھے۔ اس موقعے پر سبکدوش انیس اعظمی نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ گورننگ کونسل کے تمام ممبران نے میرا پورا ساتھ دیا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میرے زمانے میں پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر خالد محمود کا بڑا تعاون رہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جولائی 2015

'انجمن نوائے مستقبل' کی نشست

نئی دھلی: اردو کے معروف ناول نگار پیغام آفاقی نے موجودہ ادبی صورت حال اور ادیبوں کی ذمے داری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ بیسویں صدی میں معروف فکشن نگار پریم چند نے ادب سے متعلق جو تصور پیش کیا

تھا کہ ادب سیاست کے آگے چلنے والی مشعل ہے اس کو ہمیں عملی جامہ پہنانا ہے۔ 'انجمن نوائے مستقبل' کی جانب سے مائنارٹی میڈیا سینٹر میں پیغام آفاقی کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقعے پر تنظیم کی صدر ڈاکٹر ناصرہ خاتون، انجمن کے کنوینر رہبر حسنین، سرتاج حسین، ضرغام عابدی وغیرہ نے سوالات کیے۔ پیغام آفاقی نے کہا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے موجودہ معاشرہ کی نظر میں ادب اور ادیبوں کی کوئی افادیت باقی نہیں رہی جبکہ ادب اور ادیب ہی ملک و معاشرہ کو نیا نظریہ اور نئی سمت عطا کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں زبردست سیاسی بحران ہے جس پر تمام مکتبہ فکر کے دانشوروں سے تبادلہ خیال کیا جاتا ہے لیکن ادیب کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا جبکہ ادیب تمام مکتبہ فکر کا مجموعہ ہوتا ہے کیونکہ ادب میں سماجی، سیاسی، معاشی، اقتصادی، سائنسی، جغرافی گو کہ ہر فکر پائی جاتی ہے۔ 'مکان' اور 'پلیتہ' جیسے مشہور ناول کے مصنف پیغام آفاقی نے رہبر حسنین کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ان ناولو ں میں انھیں موضوعات کو اور انھیں سلگتے سوالات کو شامل کیا گیا ہے جو وقت کے لیے ناگزیر ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 جون 2015

دہلی اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کی میٹنگ

نئی دهلی: اردو اکادمی کی گورننگ کونسل کی نشست دہلی سکریٹریٹ میں زیر صدارت وزیر اعلیٰ اور چیئرمین اردو اکادمی منعقد ہوئی۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے اکادمی کی سرگرمیوں کو بہتر طور پر انجام دینے میں سرکار کے تعاون کی تعریف کی اور کہا کہ اکادمی کے سکریٹری اور کارکنان کی فعالیت اور اپنے فرائض کے تئیں سچی لگن کے سبب ہی اس اکادمی نے ملک بھر میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل کیا ہے۔ انیس اعظمی نے اکادمی کے پروگراموں کی تفصیلات سے وزیر اعلیٰ اور وزیر السنہ کپل مشرا کو واقف کرایا۔ میٹنگ کے دوران اکادمی کے ممبران پروفیسر معین الدین جینا بڑے، پروفیسر شہزاد انجم، ڈاکٹر شبانہ نذیر، کامنا پرساد اور تحسین منور نے وزیر اعلیٰ کو اردو کے مختلف مسائل سے واقف کرایا خاص طور سے سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری، سرکار کے مختلف محکموں میں اردو مترجمین کی تقرری اور دلّی کی سڑکوں پر اردو میں لکھے ناموں کی غلط املے کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی۔ وزیر فن، ثقافت و السنہ کپل مشرا نے تمام مسائل کو غور سے سننے کے بعد کہا کہ بیشتر مسئلے میرے علم میں ہیں اور سرکار جلد ہی ان مسائل کو حل کرنے کی نہ صرف کوشش کرے گی بلکہ ان مسئلوں کو حل کردے گی۔ اروند کجریوال نے سب سے پہلے تمام ممبران کو ماہ رمضان کی مبارکباد دی نیز اردو اکادمی کے کام کاج کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ اکادمی دانشورانہ کام تو انجام دے ہی رہی ہے، لیکن جس دن بچے بچے کی زبان پر اردو آئے گی اسی دن اکادمی صحیح معنوں میں کامیاب ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اردو اساتذہ کی تقرری کا مسئلہ واقعی بہت سنجیدہ ہے۔ ہماری سرکار دہلی کے تمام سرکاری اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کو یقینی بنائے گی اور اردو زبان کو وہ تمام حقوق مہیا کرائے جائیں گے جو آئینی اعتبار سے کسی بھی سرکاری زبان کو ملنے چاہئیں۔ وزیر اعلیٰ نے یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ ان سب کاموں کے لیے آپ کو پانچ سال انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگلے پانچ ماہ میں ہی نتیجہ آپ کے سامنے آجائے گا۔ اروند کجریوال نے تمام ممبران کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ آپ سب سے مل کر مجھے فخر کا احساس ہورہا ہے کیونکہ آپ یقیناً ایک ہیرا ہیں اور آپ کی چمک سے ہم دہلی کو درخشاں بنانا چاہتے ہیں۔ ہم دہلی کو ایک ثقافتی گہوارہ بنائیں گے اور اس میں آپ سب کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر اکادمی کی تازہ ترین کتابوں اور مونوگراف کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ میٹنگ میں شرکت کرنے والوں میں محکمہ فن، ثقافت والسنہ کی سکریٹری گیتانجلی گپتا، وزیر قانون والسنہ کے سکریٹری جی پی سنگھ، ڈپٹی سکریٹری مالیات منوج کمار کے علاوہ اکادمی کے ممبران ڈاکٹر جی آر کنول، ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 جون 2015

بچوں نے پریم چند کی کہانی 'عیدگاہ' پر ڈرامہ پیش کیا

نئی دهلی: اتم نگر واقع ودیا پبلک اسکول میں پرسنالٹی ڈیولپمنٹ اینڈ آرٹ ورک شاپ کے ننھے منے فنکاروں نے گزشتہ صدی کی ابتدا میں معروف افسانہ اور ناول نگار منشی پریم چند کے ذریعے لکھی گئی مشہور کہانی 'عیدگاہ' کو ڈرامہ کے طور پر پیش کرکے اپنی شاندار اداکاری سے ناظرین کا دل جیت لیا۔ بچوں نے یہ ڈرامہ ہدایت کار اور ٹرینر سنجے ٹٹیجا کے زیر نگرانی پیش کیا۔ پریم چند کی یہ کہانی ایک غریب لڑکے حامد کے اردگرد گھومتی ہے جس کے والدین کا انتقال ہوچکا ہے اور وہ اپنی دادی امینہ کے ساتھ رہتا ہے۔ عید کے تہوار پر وہ اپنی دادی سے ایک آنہ (چھ پیسے) لے کر اپنے دوستوں کے ساتھ گاؤں کے میلہ میں جاتا ہے۔ اس کے دوست اپنی پسند کی چیزیں کھاتے ہیں، اچھے اچھے کھلونے خریدتے ہیں لیکن حامد کے دماغ میں کچھ اور ہی چل رہا ہوتا ہے۔ آخرکار وہ اپنے اوپر قابو پاتا ہے اور تین پیسے میں اپنی بوڑھی دادی کے لیے ایک چمٹا خرید لیتا ہے کیونکہ اسے بار بار خیال آتا ہے کہ جب اس کی دادی روٹی پکاتی ہے تو اس کی انگلیاں جل جاتی ہیں۔ اس ڈرامے کو دیکھ کر وہاں موجود تمام لوگ اپنے بچپن کے دنوں میں لوٹ گئے۔ اس ڈرامے میں حامد کا کردار جتن گجرال، دادی امینہ کا کردار ترپتی نے بہت کامیابی سے ادا کرکے سب کا دل جیت لیا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی کے طور پر چیئرمین رام کشن تیاگی نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28 جون 2015

اتر پردیش:

ڈاکٹر ہری اوم ایک اچھے مصنف، نغمہ نگار اور غزل گلوکار

لکھنؤ: انسان کے اندر کچھ کرنے کے لیے سچی لگن ہو۔ جذبہ حوصلہ ہو اور اسے پانے کے لیے پوری ایمانداری سے محنت کرے تو وہ انسان اپنی منزل کی بلندیوں کو ضرور پالے گا۔ کچھ ایسا ہی کر دکھایا ہے سینئر آئی اے ایس افسر ڈاکٹر ہری اوم نے افسران کے مزاج کے ایک دم برعکس ڈاکٹر ہری اوم نہ صرف شیریں مزاج اور کھنکتی آواز کے مالک ہیں بلکہ ایک اچھے مصنف نغمہ نگار اور غزل گلوکار بھی ہیں۔ 1997 بیچ کے افسر اپنی صلاحیت کی وجہ سے اتنے کم عرصے میں گیارہ اضلاع کے ڈی ایم کی ذمے داری تو اچھی طرح نبھا چکے ہیں اس کے ساتھ ہی ان کی تین کتابیں بھی شائع ہوچکی ہیں جس میں ان کی سب سے پہلی کتاب 2002 میں 'دھوپ کا پرچم' (غزلوں کا مجموعہ) آئی اس کے بعد کپاس کے اگلے موسم میں (نظم) اور امریکہ میری جان (کہانی) کا مجموعہ منظر عام پر آیا وہ فیض احمد فیض کو اپنا آئیڈیل بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ یوں تو انھوں نے تمام نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں لیکن اس میں سب سے زیادہ جو مقبول ہوئی وہ ہے میں تیرے پیار کا مارا ہوں، سکندر ہوں مگر ہارا ہوں، کی کافی تعریف ہورہی ہے۔ ڈاکٹر ہری اوم نے ویسے تو اسکول کے دنوں سے گانا شروع کردیا تھا اور دھیرے دھیرے ان کی نغمہ گوئی پروان چڑھنے لگی۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت انھیں 2011 میں

حاصل ہوئی۔ ان کے کئی اور البم لانچ ہوئے اور اب روشنی کے پنکھ ریلیز ہونے جا رہی ہے۔ ڈاکٹر ہری اوم بتاتے ہیں کہ وہ آئی اے ایس تو ہیں ہی لیکن اپنی شناخت وہ غزل کے فنکار کے طور پر بنانا چاہتے ہیں اور اس میں ان کو کافی کامیابی بھی مل رہی ہے ان کی کھنکتی آواز کا جادو بیرون ملک میں بھی لوگوں کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ڈاکٹر ہری اوم مشہور گلوکارہ شریا گھوشال، کرن کھیر، حسین بندھو، استاد احمد حسین اور محمد حسین کے ساتھ بھی اسٹیجوں پر اپنی آواز کا جادو بکھیر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ دوردرشن اور آکاش وانی پر بیگم اختر کی یاد میں ریکارڈنگ کرا چکے ہیں۔ اپنے نئے البم روشنی کے پنکھ کے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ یہ فیض اور ہری اوم کا کامبینیشن ہے جس میں چار غزلیں فیض کی اور چار ان کی خود کی ہیں جس کو انھوں نے گایا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 29 جون 2015

بزم حیرت مرادآبادی کے زیراہتمام محفل

مراد آباد: بزم حیرت مرادآبادی کے زیراہتمام ایک شاندار محفل کا انعقاد کیا گیا جس میں بزرگ شاعر حیرت مرادآبادی کی پانچویں کتاب 'معراج عقیدت' کی رسم اجرا بھی عمل میں آئی۔ پروگرام کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے ہوا۔ سبھی مقررین نے حیرت مرادآبادی کی ادبی خدمات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر شعرائے کرام نے سامعین کو اپنے کلام سے بھی نوازا۔ پروگرام کی صدارت انوارالحسن نیازی نے کی جبکہ نظامت جاوید رشید عام کے سپرد رہی۔ مہمان خصوصی شہر رکن اسمبلی حاجی یوسف انصاری نے کہا کہ حیرت مرادآبادی کی ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو گراں قدر سرمایہ سے نوازا ہے۔ ان کی تصنیفات 'اساس حیات، سراجاً منیراً گوہر کعبہ و حسین زندہ ہے سے سماج کو بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔ اس موقعے پر سابق میئر ڈاکٹر ایس ٹی حسن نے و ایس پی ضلع صدر حاجی اکرام قریشی سمیت دیگر مقررین نے بھی اظہار خیال کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 جون 2015

'آئینہ جذبات' پر علمی اور ادبی مذاکرہ

لکھنؤ: ریاستی حکومت اردو زبان کی تعلیم و ترقی اور فروغ کے لیے پوری طرح سنجیدہ ہے اور اس زبان کو فروغ دینے کے لیے صدق دل سے کوشش کر رہی ہے مگر اس کے ساتھ ہی محبان اردو کو بھی اپنے بچوں کو اردو تعلیم دینے کے لیے ٹھوس اقدامات کرنا چاہیے۔ 'مذکورہ خیالات رائے اومانا تھ بلی آڈیٹوریم میں ہندی اردو ساہتیہ ایوارڈ کمیٹی کے زیراہتمام منعقدہ 'آئینہ جذبات' پر مذاکرہ میں وزیر جنگلات فرید محفوظ قدوائی نے ظاہر کیے۔ انھوں نے کہا اردو سے وابستہ مسائل کا حل سنجیدگی سے کرنے کے لیے وزیراعلیٰ اکھلیش یادو عزم مصمم کیے ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت کسی بھی زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اسکیمیں بنا سکتی ہے لیکن ان اسکیموں پر عمل درآمد کرتے ہوئے اس سے مستفیض ہونے کا کام تو وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کے لیے اسکیمیں بنائی گئی ہیں۔ عبدالقدیر قدیر کی شاعری کو اخلاقی اقدار کی آئینہ دار بتاتے ہوئے کہا کہ زندگی کے ہر شعبے میں ایک فلسفی کی طرح ان کی عمیق نظر تھی اور ان کی شاعری مشترکہ تہذیب کی پاسدار ہے۔ اپنے صدارتی خطاب میں پروفیسر شارب ردولوی نے 'آئینہ جذبات' اور قدیر کی شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ قدیر کی شاعری اپنے عہد کی ایک معتبر آواز ہے ایک ایسی آواز جس نے غزل کو فکر و اظہار کی نئی وسعتیں دیں اور جدید شاعری جو تنہائی، اداسی، اندرونی شکست و ریخت، حقیقتوں سے فرار، سماجی اور تہذیبی قدروں سے انحراف کی علامت تھی اسے عصری حسیت اور تازہ کار افکار سے اعتبار بخشا۔ مذاکرہ میں خطاب کرتے ہوئے سابق وائس چانسلر اردو عربی فارسی یونیورسٹی انیس انصاری نے عبدالقدیر کی شاعری کو معتبر شاعری بتاتے ہوئے محبان اردو اور حکومت سے اردو کی تعلیم پر زور دینے کی اپیل کی۔ ڈاکٹر صبیحہ انور نے کہا کہ عبدالقدیر کی شاعری میں پختگی، تخیل کی بلند پروازی، جذبات کی عکاسی، صوفیانہ عناصر، زبان و بیان کی چستی اور تلمیحات وغیرہ کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں جن سے ان کی قادرالکلامی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر رخسانہ لاری نے کہا کہ 'آئینہ جذبات' کے مطالعے کے بعد یہ تسلم کرنا پڑتا ہے کہ قدیر ایک معتبر غزل گو شاعر تھے انھوں نے مناجات، نعت گوئی، قصیدہ، نظم، قطعات وغیرہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس موقعے پر ظفریاب جیلانی ایڈوکیٹ، ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی، ڈاکٹر شبنم اکبر، اور شاہنواز قریشی اور پروفیسر آصفہ زمانی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ عبدالقدیر کی غزلوں میں ان کی تخلیقی صلاحیتیں اپنی شکل میں نمو پذیر ہوئی ہیں۔ 'آئینہ جذبات' کے مرتب ڈاکٹر عرفان قدیر نے مہمانوں کے شکریے کے ساتھ اجلاس کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 جون 2015

عرفان صدیقی حیات و شاعری

لکھنؤ: عرفان صدیقی حیات و شاعری پر ایک سیمینار پریس کلب میں مورخہ 7 جون 2015 کو منعقد کیا گیا۔ سابق وزیر مملکت اترپردیش حکومت نے شرکت کی اور صدارت کے فرائض سید اطہر نبی ایڈوکیٹ چیئرمین ہندی اردو ساہتیہ اکادمی نے انجام دیے اور مہمان اعزازی کی

حیثیت سے جناب نعمان اعظمی صاحب صدر علامہ شبلی ہیلپ لائن، لکھنؤ، سیمینار میں خاص طور سے مرحوم عرفان صدیقی کی بیٹی محترمہ رومانہ عرفان صدیقی اور ان کے شوہر اجمل نے شرکت کی۔ جناب امان عباس ایڈیٹر، روزنامہ صحافت مقالہ نگار کی حیثیت سے جناب شہنواز قریشی، جناب غفران نسیم صحافی، نثار احمد جنرل سکریٹری نیوکلیس سوسائٹی نے شرکت کی۔ جناب نثار احمد نیوکلیس ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے بانی و جنرل سکریٹری نے کہا کہ عرفان صدیقی ایک عہد ساز شاعر اور عمدہ صحافی تھے۔ زندگی کی آخری سانس تک ان کا قلم چلتا رہا ان کی کوشش یہی رہی کہ وہ انسانیت کا پیغام عوام الناس تک پہنچائیں اور اس روانی میں وہ روایتی شاعری سے ذرا الگ ہٹ کر نئی فکر اور نئے اسلوب سے لوگوں کو باخبر کراتے رہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو نیا لب و لہجہ نئی فکر دی اور نیا انداز نظر بخشا اور ان سب کے ساتھ کوشش کی کہ ان کے اشعار مجموعی اعتبار سے انسانیت کی بکھری ہوئی زلفوں کو سنوارنے میں مددگار ثابت ہوں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی 8 جون 2015

فروغ اردو زبان اور ہماری ذمے داریاں

ہاپوڑ: فروغ اردو زبان ٹرسٹ کے زیراہتمام گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار اور دوآبہ کے درمیان ہاپوڑ شہر کے محلہ شیو دیال پورہ بلند شہر روڈ میں فروغ اردو زبان ٹرسٹ کے زیراہتمام پروگرام ہوا، جس کا عنوان تھا فروغ اردو زبان اور ہماری ذمے داریاں۔ آج کی بیٹیاں اور ان کا مستقبل اور تعلیم۔ پروگرام میں شریک طالبات کو کاپی پینسل اور تحائف تقسیم کیے گئے۔ اس پروگرام میں طالبات نے

بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس پروگرام میں اردو پڑھنے والی طالبات نے اردو کے سلسلے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر طالبات نے کہا کہ اردو زبان ہمارے ملک کی زبان ہے۔ وہ یہیں پیدا ہوئی، یہیں پلی، یہیں بڑھی، اردو تہذیب کی زبان ہے۔ ایس اکرام نے طالبات اور ان کے سرپرست کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان نے معاشرہ کو بھائی چارہ اور محبت کا پیغام دیا ہے اس اہم زبان کو مسلم اور غیر مسلم میں فرق کیے بغیر فروغ دینا چاہیے کیونکہ یہ زبان ہندوستان کی زبان ہے۔ اردو زبان ملکی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ گنگا جمنی تہذیب کی علمبردار اور یگانہ روزگار ہے۔ آئین ہند کی دفعہ آٹھ کے مطابق اردو زبان کئی قومی زبانوں میں سے ایک ہے جس کے بولنے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 جون 2015

پنجاب:

پنجاب اردو اکادمی کی ویب سائٹ کا افتتاح

مالیرکوٹلہ: پنجاب اردو اکادمی نے اپنے اغراض و مقاصد کو عملی جامہ پہناتے ہوئے ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا۔ محبان اردو اور ادب نواز شخصیتوں کو خوش آمدید

کہتے ہوئے اکادمی کے فعال سکریٹری پروفیسر منظور حسن نے پروگرام سے متعلق اپنی رپورٹ پیش کی نیز مستقبل کے منصوبوں سے بھی روشناس کروایا۔ انھوں نے کہا ہماری کوشش یہی ہے کہ اردو کی ترقی کے تعلق سے ہر ممکن کوشش ہو۔ اس موقعے پر اکادمی کے پہلے اردو تربیتی مرکز اور اکادمی کی ویب سائٹ کا اجرا کیا گیا تاکہ پنجاب اردو اکادمی کو بین الاقوامی سطح پر متعارف کروایا جائے۔ مرکز اور ویب سائٹ کا افتتاح کرتے ہوئے مہمان خصوصی محترمہ فرزانہ عالم صاحبہ چیف پارلیمانی سکریٹری، اور وائس چیئر پرسن پنجاب اردو اکادمی نے کہا کہ ''اس بات کی بے حد ضرورت تھی کہ اکادمی کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اردو پنجاب میں جنم لینے والی شیریں ترین زبان ہے۔ اس کی شیرینی کو برقرار رکھنے کے لیے ہم ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس تقریب میں اردو زبان و ادب کی دو اہم شخصیتوں جناب کوثر علی شاہد جعفری اور جناب ناز بھارتی صاحب کی گراں قدر خدمات کے لیے ان کو بابائے اردو پنجاب اور مجاہد اردو کے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

تقریب کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد ندیم نے اپنے مخصوص انداز میں بحسن و خوبی نبھاتے ہوئے کہا کہ پنجاب اردو اکادمی کے عملی قیام سے پنجاب کے بے گھر اردو ادیبوں کو ایک گھر نصیب ہوا ہے۔ معروف اردو اسکالر پروفیسر بھوپندر سنگھ عزیز پربہار نے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اردو زبان و ادب کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر اکادمی کو تعاون دینے والی معزز تعلیمی، ادبی اور سیاسی شخصیتوں کو بھی سرفراز کیا گیا۔ اکادمی کے اسٹاف ممبر محمد صادق کو ایم اے اردو میں ٹاپ کرنے پر خصوصی اعزاز سے نوازا گیا۔ محمد اظہار عالم چیئرمین امارت شرعی پنجاب نے اپنے صدارتی کلمات سے نوازتے ہوئے دلی مسرت کا اظہار کیا اور اکادمی کو ہر طرح کے تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی۔

پروگرام کے آخر میں سکریٹری پنجاب اردو اکادمی پروفیسر منظور حسن صاحب نے سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا اور مستقبل میں اس طرح کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کا یقین دلایا۔

روزنامہ 'ہند سماچار' جالندھر، 17 جون 2015

تلنگانہ:

حیدرآباد میں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

حیدرآباد: ریاست تلنگانہ کے قیام کی پہلی سالگرہ کے موقعے پر محکمہ اقلیتی بہبود کے زیراہتمام چار روزہ تقاریب اختتام کو پہنچیں۔ ان چار دنوں میں جملہ 11 تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔ سکریٹری محکمہ اقلیتی بہبود حکومت تلنگانہ جناب سید عمر جلیل نے جشن تلنگانہ کی چار روزہ تقاریب کے اختتام کا اعلان کرتے ہوئے پروگرام کے انعقاد میں تعاون کرنے والے تمام افراد و اداروں 'فنکاروں اور شاعروں کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ محکمہ اقلیتی بہبود کی جانب سے کامیابی کے ساتھ یہ پروگرام منعقد کیے گئے۔ انھوں نے اس موقعے پر اردو کے ممتاز مزاحیہ شاعر گلی نلگنڈوی کو بعد از مرگ اور حمایت اللہ اور مزاحیہ فنکار دولت رام کو محکمہ اقلیتی بہبود کی جانب سے ایوارڈ پیش کیے جو 51 ہزار روپے پر مشتمل ہے۔ سکریٹری ڈائریکٹر اردو اکادمی پروفیسر ایس اے شکور نے ان تقاریب کو کامیاب بنانے پر تمام شاعروں اور فنکاروں کے علاوہ سامعین کا بھی شکریہ ادا کیا۔

مشاعرہ میں شامل شعرائے کرام کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں: مہمان شاعر پاپولر میرٹھی (میرٹھ)، سنیل کمار تنگ (سیوان)، مختار یوسفی (مہاراشٹرا)، سندر مالیگانوی (مالیگاؤں)، سکندر حیات گڑبڑ (رڑکی)، شاداب بے دھڑک مدراسی (چینائی)، تمیم پرواز اور نشتر امروہوی کے علاوہ ڈاکٹر محمد علی رفعت، فرید سحر، سردار اثر، معین امر بمبو اور وحید پشاہ اور اضلاع تلنگانہ کے شاعر چچا پالموری (محبوب نگر)، اقبال شانا بودن (نظام آباد)، ٹپیکل جگتیالی (کریم نگر)، کملا کر دلیر (بھنسہ عادل آباد) اور شیخ احمد ضے (نظام آباد) نے اپنا طنز و مزاح سے بھرپور کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 8 جون 2015

اقبال اردو اکادمی کی یادگار تقریب

تمل ناڈو/ پٹنہ: سرزمین کوئمبتور (تمل ناڈو) میں ایک یادگار تقریب عمل میں آئی جس میں علامہ اقبال پر ایک سیمینار و کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔

اس موقعے پر ہندوستان میں مقیم اردو اور تمل ادب کی عالمی شہرت یافتہ شخصیتوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ علامہ اقبال پر ہوئے سیمینار میں اکادمی کے صدر کلیم الدین اور نائب صدر شمیم پاشا کے استقبالیہ کلمات کے بعد مختلف دانشوروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اردو، ہندی کے نامور ادیب و شاعر ڈاکٹر قاسم خورشید نے اپنے مخصوص اور پراثر لہجے سے ہزاروں کی تعداد میں موجود سامعین کو سحر زدہ کر دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ درد کے رشتے کے معاملے میں دنیا کا ہر تخلیق کار ایک جیسا ہوتا ہے۔ اقبال نے ہماری شاعری کو نئے افکار سے مزین کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آج بھی پوری معنویت کے ساتھ پڑھے جا رہے ہیں۔ جناب علیم صبا نویدی نے اپنی تقریر سے پہلے قاسم خورشید

'اردو شاعری کے فروغ میں فدا اور افسر مودودی کا حصہ' کے مضمون پر منعقدہ پروگرام کا منظر

کی تخلیقی کائنات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ جلسے کے ناظم فیض قادری نے اکادمی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہم پوری کوشش کریں گے کہ تمل ناڈو میں اردو کی وراثت کا تحفظ ہو اور دوسرے ترقی پذیر صوبوں کی طرح اردو کا وقار بحال کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ اس موقعے پر دوسرے اور کئی مشاہیر نے اپنی آرا سے نوازا۔ اکادمی کے چیئرمین جناب کلیم الدین کی صدارت میں مخصوص نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر علیم صبا نویدی، قاسم خورشید، مظفر شہ میری شامل ہوئے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم کو ڈائریکٹر بنائے جانے پر سبھوں نے خوشی کا اظہار کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ کونسل کو عملی سطح پر فعال کریں گے۔

پریس ریلیز: قاسم خورشید، تمل ناڈو/ پٹنہ، 19 جون 2015

گجرات:

اردو شاعری کے فروغ میں فدا اور افسر مودودی کا حصہ

خدیجہ بیگم محمود حسین افسر ٹرسٹ کے چیئرمین سید واجد حسین کے زیر اہتمام 3 مئی 2015 کو بڑودہ میں یک روزہ نیشنل سیمینار بہ عنوان 'اردو شاعری کے فروغ میں فدا اور افسر مودودی کا حصہ' کا انعقاد ہوا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت جناب پروفیسر محی الدین بامبے والا، ڈائرکٹر، حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سنٹر، احمد آباد، نے کی جبکہ جناب محی الدین سلیم اللہ شاہ رفاعی صاحب (سورت) مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔ اس تقریب کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے ہوا۔ اس کے بعد فدا بڑودوی (شاگردِ غالب) کی حمد اور افسر مودودی (شاگردِ یاس لکھنوی) کی نعت پیش کی گئی، پھر اس کے بعد خدیجہ بیگم ٹرسٹ کے چیئرمین سید واجد حسین نے معزز مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا استقبال کیا۔ اس کے بعد پانچ کتابوں کی رونمائی اسٹیج پر موجود محترم شخصیات اور جناب صدر کے ہاتھوں ہوئی۔ کتابوں کے نام یہ ہیں: دیوان فدا، کلیات افسر، راحت الحجاج از فدا، دیوان فدا (گجراتی) اور دیوانِ افسر (گجراتی)۔ بعدازاں، مہمان اعزازی نے خطاب فرمایا۔ آخر میں صدرِ مجلس پروفیسر محی الدین بامبے والا نے صدارتی خطبے پیش کیا۔ اپنے خطاب میں 'تذکرۂ سخنوران بڑودہ' کا خاص طور سے ذکر کیا جو بڑودہ کے سو سے زائد شاعروں کے حالات زندگی اور ان کے نمونہ ہائے کلام پر مشتمل ہے۔ ان کے بعد سید منظور علی سالیری صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب کے اختتام پر ایم۔ ای۔ ایس گرلز ہائی اسکول، بڑودہ، کی طالبات نے قومی ترانہ پیش کیا۔ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر نثار احمد انصاری نے انجام دیے۔ افتتاحی تقریب کے بعد سیمینار کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر مقصود احمد نے کی اور نظامت کے فرائض پروفیسر محبوب حسین عباسی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں چار مقالات پیش کیے گئے۔

بذریعہ ڈاک: سید واجد حسین، گجرات 17 جون 2015

مہاراشٹر:

اردو مضمون میں ہندو لڑکیوں نے بازی ماری

رائے گڑھ: اسمردھی شیام واگھ مارے کو 10 ویں کے آئی سی ایس ای بورڈ کے اردو میں اچھے نمبرات لانے کا بھروسہ تھا، لیکن وہ 90 فیصد کے ساتھ اپنی کلاس میں ٹاپ کر لیں گی ایسا انھوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسمردھی رائے گڑھ ضلع کے بورلی پنچاتن گاؤں میں واقع ڈاکٹر اے آر اندرے آنگلش ہائی سکول اور جونیئر اسکول کی طالبہ ہیں۔ 64 طالبات کی کلاس میں، اسمردھی سیکنڈ رہیں لیکن اردو میں انھوں نے ٹاپر مدیحہ معظم اندرے کو 2 نمبر سے پیچھے چھوڑ دیا۔ 7 بچوں نے بورڈ کے امتحانات میں اردو میں امتیازی نمبرات حاصل کیے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں چار مہاراشٹر کے ہندو خاندانوں سے آتے ہیں۔ اسمردھی انھیں میں سے ایک ہے۔ اردو میں سمردھی اور ان کی باقی ہندو کلاس میٹ ہرشدا دلیپ چیرفالے (86 فیصد)، سمرن دیپک کرانبے (88 فیصد) اور پردیپ کھوپکر (60 فیصد) نمبر لاکر اپنے مسلم کلاس میٹ کو چونکا دیا ہے۔ کلاس کی ٹاپر مدیحہ نے مانا کہ انھیں اسمردھی سے حسد نہیں بلکہ اس پر فخر ہے، کیونکہ وہ اس اردو میں ٹاپر بنی ہیں جسے اس نے بچپن سے پڑھا ہے۔ ان نتائج کو دیکھ کر اسکول کے بانی کو بھی فخر محسوس ہو رہا ہے۔ ہندو طلبہ مانتے ہیں کہ اردو سیکھنے سے وہ اس زبان کے مصنّفین اور ان کے کام کو بھی سمجھ پاتے ہیں۔ ملک کے بچے مولانا آزاد کو ایک مجاہد آزادی اور ملک کے پہلے وزیر تعلیم کے طور پر جانتے ہیں لیکن سمردھی سے مولانا آزاد کی ادبی خدمات کے بارے میں پوچھیے، وہ فوراً 'غبارِ خاطر' کے بارے میں بتاتی ہیں، جو ملک کے عظیم دانشور مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 جون 2015

تہذیب و ثقافت:

سہ روزہ صوفی موسیقی فیسٹول

حیدرآباد: حضرت امیر خسرو کی ہمہ پہلو شخصیت ہر قوم ہر زبان اور ہر مذہب کے ماننے والوں کے لیے قابل احترام ہے۔ ہر زبان کے بولنے والے امیر خسرو کو اپنا شاعر سمجھتے ہیں۔ امیر خسرو نے کئی زبانوں میں شاعری، پہیلیاں، نثر، نظم اور دیگر اصناف سخن میں اثاثہ چھوڑا ہے۔ انھوں نے نہ صرف ادبی دنیا کے لیے خدمات انجام دی بلکہ فنون لطیفہ کی خدمت میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ انھوں نے ہندوستانی موسیقی کو کئی آلات فراہم کیے۔ تصوف کی محافل بھی امیر خسرو کے پیام اور کلام کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔ امیر خسرو نے ہندوستان جیسے ہمہ لسانی 'ہمہ ثقافتی ملک میں ہر طبقہ اور قوم کے لیے ادبی خزانہ چھوڑا۔ ان کا کلام اور تعلیمات ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے لیے سبھی کے لیے مشعل راہ ہے۔ بارگاہ یوسفین حیدرآباد میں سہ روزہ صوفی موسیقی فیسٹول برائے فرقہ وارانہ ہم آہنگی و قومی یکجہتی کی افتتاحی تقریب سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے اسکالرس اور دانشوروں نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ جشن تلنگانہ کے ضمن میں سہ روزہ صوفی موسیقی فیسٹول حضرت امیر خسرو سنگیت اکادمی اور حضرات یوسفین ایجوکیشنل ویلفیئر ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقد ہوا۔ صدارت مولانا محمد فیصل علی شاہ چشتی نظامی سجادہ نشین بارگاہ یوسفین نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر دیوان حضرت سید فاروق نظامی گدی نشین آستانہ محبوب الٰہی دہلی 'باشاہ نواز خان اسپیشل میٹو پالیٹن مجسٹریٹ کرمنل کورٹ ناملپلی نے شرکت کی۔ پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے کہا کہ امیر خسرو

کو ہر زبان کے لوگ اپنا شاعر سمجھتے ہیں۔ تصوف کی کوئی محفل امیر خسرو کے کلام کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ڈاکٹر سنتوش راٹھور اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ ہندی عثمانیہ یونیورسٹی نے کہا کہ امیر خسرو کا ہندی کلام اور پہیلیاں ہندی بولنے والی ریاستوں میں نہایت مقبول ہے۔ 700 برس سے زائد گزر جانے کے باوجود آج بھی امیر خسرو کا کلام مقبول ہے۔ مولانا سید محمد علی قادری الہاشمی مشاد پاشاہ نے کہا کہ امیر خسرو ایک عہد ساز شخصیت، بلند پایہ شاعر تھے۔ باشاہ نواز خان اسپیشل میٹرو پالیٹن مجسٹریٹ نے کہا کہ کثیر لسانی، کثیر ثقافتی ملک میں امیر خسرو کی تعلیمات فرقہ وارانہ ہم آہنگی وقومی یک جہتی کے لیے نمونہ ہیں۔ جبکہ خواجہ شجاع الدین افتخاری حقانی پاشاہ نے خیر مقدمی خطاب کیا۔ سیمینار کے بعد محفل قوالی منعقد ہوئی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 جون 2015

لٹل تھیسپئن کا پانچواں نیشنل تھیٹر فیسٹول 'کرشن اور بھیشم' پروگرام کا منظر

لٹل تھیسپئن کا پانچواں نیشنل تھیٹر فیسٹیول 'کرشن اور بھیشم'

ڈراما گروپ 'لٹل تھیسپئن' (Little Thespian) قومی سطح کا معروف تھیٹر گروپ ہے جو پچھلے 20 برسوں سے لگاتار اردو اور ہندی میں ڈرامے پیش کر رہا ہے جس کے ہدایت کار مولانا آزاد کالج کے پروفیسر ایس ایم اظہر عالم اور ان کی اہلیہ اوما جھن جھن والا ہیں۔ اس تھیٹر گروپ کا ایک تاریخ ساز کارنامہ ایس ایم اظہر عالم کی نگرانی میں 'رنگ رس' کے نام سے اردو زبان میں تھیٹر کے میگزین کی اشاعت ہے۔ فنِ تھیٹر پر یہ اردو کا پہلا اور واحد میگزین ہے۔ لٹل تھیسپئن کلکتہ کا واحد ادارہ ہے جو اردو اور ہندی ڈراموں کے فیسٹیول کرواتا ہے۔

11 جون سے 16 جون 2015 تک لٹل تھیسپئن نے کلکتہ کے گیان منچ ہال میں اپنا پانچواں تھیٹر فیسٹیول کرشن چندر اور بھیشم ساہنی کی صدی کے طور پر منایا۔ یہ چھ روزہ فیسٹیول افسانہ نگار بھیشم ساہنی اور کرشن چندر کے حیات و خدمات پر مبنی تھا جس میں کرشن چندر اور بھیشم ساہنی کے افسانوں اور ڈراموں کو ملک کے مختلف تھیٹر گروپ اور فنِ تھیٹر کے ماہرین نے اسٹیج پر پیش کیا۔ فیسٹیول کا افتتاح 11 جون شہر کی معزز شخصیتیں جناب سیتارام شرما (چیئرمین، مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز)، جناب اوم پرکاش بھارتی (ڈائریکٹر، EZCC)، جناب شفیع جاوید (معروف افسانہ نگار)، جناب مشتاق کاک (ہدایت کار، جموں) کے علاوہ لٹل تھیسپئن کے ہدایت کار جناب ایس ایم اظہر عالم اور محترمہ اوما جھن جھن والا نے دیپ جلا کر 'کرشن اور بھیشم' کی صد سالہ تقریبات کا آغاز کیا۔ افتتاحی جلسے کے بعد جموں سے آئے ڈراما گروپ 'امیچر تھیٹر گروپ' نے کرشن چندر کے ناول 'ایک گدھے کی آتم کتھا' پر مبنی ڈراما 'جاہتوں کا کیا' پیش کیا جس کی ہدایت کار افرح مشتاق تھیں اور ناول کو ڈرامے کی ساخت میں اوما جھن جھن والا نے ڈھالا تھا۔ اس کی پیش کش کافی کامیاب رہی۔

فیسٹیول کے دوسرے دن ایس ایم اظہر عالم کی ہدایت میں بھیشم ساہنی کا لکھا ہوا ڈراما 'کبیرا کھڑا بازار میں' پیش کیا گیا۔ یہ ڈراما میزبان تنظیم لٹل تھیسپئن کی پیش کش تھی۔ لوک ناٹیہ شیلی میں سنگیت اور رقص سے سجائے ہوئے اس پیش کش کو لوگوں نے بے حد سراہا۔ فیسٹیول کے تیسرے اور چوتھے روز صبح 11 بجے سے شام پانچ بجے تک کرشن چندر اور بھیشم ساہنی کے حیات و خدمات پر قومی سیمینار کا سیشن تھا جس میں پدم شری پروفیسر صدیق الرحمٰن، جناب سلام بن رزاق، جناب ایم کے رعنا، جناب رنجیت ساہا، پروفیسر منجو رانی سنگھ، پروفیسر مرتیون جے پربھاکر، پروفیسر محی الدین کاشمیری اور پروفیسر الطاف انجم کے علاوہ کلکتہ سے جناب انیس رفیع، پروفیسر جگدیشور چترویدی، پروفیسر ستیہ اوپادھیا، ممتا ترپویدی، نصرت جہاں، عاصم شہنواز شبلی، مصطفیٰ اکبر، ایس ایم اظہر عالم اور اوما جھن جھن والا نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: اوما جھن جھن والا، ڈائریکٹر لٹل تھیسپین، 29 جون 2015

اعزاز و اکرام:

ساہتیہ اکادمی کے انعامات کا اعلان

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کے صدر وشوناتھ پرشاد تیواری کی صدارت میں ساہتیہ اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ میں 23 ہندوستانی زبانوں کے لیے یووا ایوارڈ (یوتھ ایوارڈ) 24,2015 ہندوستانی زبانوں کے لیے بال ساہتیہ پرسکار (ادب اطفال ایوارڈ) 2015 کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں یوتھ ایوارڈ کے لیے جواں سال شاعر امیر امان کوان کی کتاب 'نقش پا ہواؤں کے' (شعری مجموعہ) کے لیے منتخب کیا گیا جبکہ ادب اطفال ایوارڈ کے لیے اردو میں بانو سرتاج کی کتاب 'بچوں کے لیے یک بابی ڈرامے' کو منتخب کیا گیا۔ بانو سرتاج کی بچوں کے لیے اب تک 28 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ یوتھ ایوارڈ جیوری اور ادب اطفال ایوارڈ جیوری کی میٹنگ کی سربراہی اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے کی۔ دیگر یوتھ انعام یافتگان میں بانسدا شیکھر (انگریزی)، اندرا دانگی (ہندی)، نرائن جھا (میتھلی)، سمرن ڈھالیوال (پنجابی)، رتو پریہ (راجستھانی)، رشی راج جانی (سنسکرت) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ ایوارڈ ان کتابوں کے لیے دیے گئے ہیں جن کے لکھنے والوں کی عمر یکم جنوری 2015 کو 35 سال یا اس سے کم ہے۔ یہ ایوارڈ پچاس ہزار روپے اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔ ادب اطفال ایوارڈ یافتگان میں علی احمد (آسامی)، شیر جنگ گرگ (ہندی)، نعیم کشمیری (کشمیری)، رامدیو جھا (میتھلی)، سکھ دیو مد پوری (پنجابی)، کرشن کمار آشو (راجستھانی) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 جون 2015

ادب شرومنی اعزاز

لکھنؤ: ملائم سنگھ یادو نے ہفتہ کو لسانی ادارے کی جانب سے منعقد ادب شرومنی تقریب میں کہا کہ ملک اور دنیا میں سماجی نابرابری بڑھنے کی وجہ سے تحریک بڑھ رہی ہے اور یہ دور نہیں ہوئی تو تحریکیں اور بڑھیں گی۔ ہندی کی وکالت کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہم انگریزی کی مخالفت نہیں کرتے لیکن سرکاری کام کاج اردو میں بھی ہونے چاہئیں۔ اس موقعے پر وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو نے زبان ادارے کے صدر گوپال داس نیرج اور ہندی ادارے کے صدر ادے پرتاپ سنگھ کو ادب شرومنی اعزاز سے نوازا۔ وہیں گیتا کا مقابلہ جیتنے والی چھٹی کلاس کی

منظر کاظمی افسانہ ایوارڈ پروگرام کا منظر

طالبہ مریم صدیقی کو خصوصی اعزاز دیا گیا۔ ملائم نے کہا کہ عدالتوں میں بھی اردو میں کام ہو اور مقابلہ جاتی امتحانات میں انگریزی کی لازمیت ختم ہونی چاہیے۔ ہندی اور اردو دو ہاتھ ہیں، انھیں ہمیں ایک ساتھ آگے بڑھانا ہوگا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 جون 2015

منظر کاظمی افسانہ ایوارڈ

میرٹھ: شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے پریم چند سیمینار ہال میں منظر کاظمی افسانہ ایوارڈ، میگزین کا اجرا اور شعبہ اردو کے ایم اے سال دو اور ایم فل کے طالب علموں کی الوداعی تقریب پر مشتمل ایک رنگارنگ ادبی پروگرام منعقد ہوا۔ یہ پروگرام دو اجلاس پر مشتمل تھا۔ پروگرام کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کے بطور پروفیسر صغیر افراہیم (شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) اور مہمان اعزازی کے طور پر ممتاز و منفرد افسانہ نگار محترم احمد رشید علیگ شریک ہوئے۔ استقبالیہ گلناز، نظامت کے فرائض محمد جبریل اور شکریے کی رسم شبستاں پروین نے ادا کی۔ پروگرام کا آغاز ایم اے سال اوّل کے طالب علم محمد عبداللہ نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ ہدیۂ نعت ایم اے فائنل کی طالبہ مسرور اجان نے پیش کیا۔ اس موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی، ماہر تعلیم، عظیم مفکر اور دانشور سر سید احمد خاں کا جاری کردہ عالمی شہرت یافتہ رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کا اجرا مہمانان کے ہاتھوں عمل میں آیا اور اس پر تبصرے پیش کیے گئے۔ اس کے بعد معروف افسانہ نگار احمد رشید علیگ نے اپنا افسانہ 'بجوٹ' کی قرات کی جسے سامعین نے خوب پسند کیا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر الکا وشٹھ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک عمدہ اور خاندانی کہانی ہے جس میں سماج کی ایک سنگین برائی یعنی بانجھ پن کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد طلبا کی الوداعی تقریب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایم اے کے طالب علم محمد جبرئیل نے 'غالب کی شاعرانہ عظمت'، ایم فل کی طالبہ ثناپروین نے 'ولی کی انفرادیت' پر مقالے پیش کیے۔ دیگر طلبا و طالبات نے منظوم اور منثور خیالات کا اظہار کیا جس کا لب لباب یہ تھا کہ شعبے کی یادیں عمر بھر تازہ رہیں گی۔ مہمان خصوصی پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ میں محسوس کررہا ہوں کہ آج کی یہ تقریب انتہائی جذباتی ہوگئی ہے۔ بیشتر طلبا کی آنکھیں اشکبار ہیں اور یہ شعبے سے جدائی کو لے کر پریشان ہیں مگر میں یہ بتا دوں کہ طالب علمی کے زمانے کی یہ یادیں زندگی کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ انھیں انسان کبھی نہیں بھلا سکتا بلکہ انسان جیسے جیسے بڑا یا اعلیٰ مقام پر پہنچتا جاتا ہے اس کی یادوں کا سلسلہ بھی حسین سے حسین ہوتا چلا جاتا ہے۔ اپنا صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے تہذیب الاخلاق اور احمد رشید کی کہانی پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے طلبا کو تلقین کی۔ ڈاکٹر اسلم نے اس موقعے پر معروف افسانہ نگار منظر کاظمی کو یاد کرتے ہوئے ان کے افسانوں کے تلمیحی رنگ کو واضح کیا اور نئی نسل کے معروف افسانہ نگار احمد رشید کی افسانہ نگاری کو منظر کاظمی کے انداز کی توسیع بتایا۔ اس موقعے پر سید محمد اشرف، طارق چھتاری جیسے نامور افسانہ نگاروں کے ہم عصر احمد رشید علیگ کو پہلے 'منظر کاظمی افسانہ ایوارڈ' 2015 سے نوازنے کے علاوہ مہمان خصوصی اور شعبہ سے فارغ طالب علموں کو بھی نشان یادگار پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 14 جون 2015

ایم زیڈ کنول کو فخر اردو ایوارڈ

نئی دهلی: یونیورسٹی آف لندن میں ایس او ایس اردو سوسائٹی لندن اور اردو تحریک عالمی یو کے کی جانب سے پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ ڈائرکٹر میڈیا شریف اکادمی لندن کے مطابق یونیورسٹی آف لندن میں اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز کی (SOAS) اردو سوسائٹی لندن اور اردو زبان و ادب کی خدمت میں سرگرم عمل تنظیم 'اردو تحریک عالمی-یو کے' کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سالانہ عالمی سیمینار کے موقعے پر پاکستان میں مقیم نامور شاعرہ، نثر نگار اور ماہر تعلیم ایم زیڈ کنول کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف و اعزاز میں فخرِ اردو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایم زیڈ کنول کی شاعری کی دو کتب 'چہرے گلاب سے' اور 'کائنات مٹھی میں' عالمی سطح پر پذیرائی حاصل کرچکی ہیں۔ جبکہ مزید آٹھ کتابیں تدوین و اشاعت کے مراحل میں ہیں جن میں اردو شاعری کے علاوہ پنجابی شاعری اور مختلف اصناف پر نثر کی کتابیں شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 جون 2015

ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو ساہتیہ سمان ایوارڈ

دیوبند: طنز و مزاح کے شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو 'ساہتیہ سمان' دیا گیا۔ یہ ایوارڈ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو ایک

اخبار کی جانب سے منعقدہ پروگرام میں آل انڈیا اقتصادی کونسل کے چیئرمین مولانا حسیب صدیقی سینئر صحافی اشوک گپتا، ہندو مسلم بھائی چارہ کمیٹی کے صدر سلیم قریشی، دیوی دیال ایڈوکیٹ اور راج کمار جاٹو کے ذریعے دیا گیا اس ایوارڈ کے ملنے پر ادبی تنظیموں کی جانب سے ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو مبارک باد دی گئی ہے۔ کالم نگار کمل دیوبندی نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو یہ ایوارڈ ملنا ہم سب کے لیے فخر کی بات ہے اس طرح کے پروگراموں کے انعقاد سے قلم سے وابستہ حضرات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ ماسٹر شمیم کرت پوری نے کہا کہ ڈاکٹر شمیم دیوبندی کو یہ ایوارڈ ملنا ان کے ہی لیے نہیں بلکہ قصبہ دیوبند کے لیے فخر کی بات ہے کیونکہ وہ طویل عرصے سے ادب سے وابستہ ہیں اور اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 13 جون 2015

راشدہ ماہین کے اعزاز میں شعری محفل

نئی دهلی: دبستان ابر اور نوجوان ویلفیئر ایسوسی ایشن دہلی (RWA) کے زیر اہتمام پاکستان کی معروف شاعرہ راشدہ ماہین ملک کے اعزاز میں ایک محفل شعر و سخن برہم پوری، دہلی میں منعقد کی گئی جس کی صدارت شہباز ندیم ضیائی نے کی نظامت کے فرائض شمس رمزی نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی میں منتظم قریشی اور محمد عمران نے شرکت کی۔ شمس رمزی نے راشدہ ماہین کی شاعری اور شخصیت پر تبصرہ کرتے

سلام سینٹر کے زیر اہتمام قرآن مجید کے مراٹھی ترجمے کے اجرا کا منظر

ہوئے کہا کہ راشدہ ماہین اردو دنیا کی ان ابھرتی ہوئی شاعرات میں سے ایک ہیں جنھوں نے بہت کم مدت میں اپنے آپ کو اظہر من الشمس ثابت کر دکھایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ راشدہ ماہین کا تعلق درس و تدریس سے ہے۔ وہ فیڈرل اردو یونیورسٹی اسلام آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے علامہ اقبال پر کافی کام کیا ہے نیز ان کی شاعری میں نسوانی لب ولہجہ بڑی توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ شہباز ندیم ضیائی نے بھی راشدہ ماہین کی شخصیت اور شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کنوینر فرحت اللہ خاں اور غلام محمد راجہ بھائی نے مہمانوں کا پرتپاک استقبال کیا۔ جن اہم افراد نے شرکت فرمائی ان میں خورشید احمد، محمد اسلم عطاری، محسن خان، اعجاز احمد انصاری، سید ندیم احمد، عبدالحفیظ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 7 جون 2015

رسم اجرا:

قرآنِ مجید کا مراٹھی ترجمہ

نوی ممبئی: 15 جون سلام سنٹر بنگلور اور قرآن فاؤنڈیشن ممبئی کی جانب سے یہاں سنچورین مال نیرول نوی ممبئی میں مراٹھی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ، جناب سید حامد محسن کی لکھی گئی سیرت رسولؐ پر کتاب 'فالومی' اسلام کے متعلق ازالہ پر کتاب 'غلط فہمیاں' اور اسلام کے تعارف کی کتاب 'اسلام فار آل' کتابوں کے مراٹھی تراجم کا رسم اجرا نوی ممبئی کے کمشنر آف پولیس مسٹر پربھات رنجن آئی پی ایس کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر 800 سے زیادہ غیر مسلم بھائی بہنوں نے پروگرام میں شرکت کی اور تراجم قرآن، سیرت رسول اور دیگر کتابیں تحفتاً حاصل کیا۔ کتابوں کے اجرا کے بعد کمشنر آف پولیس نے کہا کہ قرآن مجید دنیا کی وہ Powerful کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے دنیا کو ایک خوبصورت، دلچسپ، انسانیت دوست اور Balanced، تہذیب Civilisation دی ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو انسانوں کو اپنے پیدا کرنے والے سے ملاتی ہے۔ پیار، محبت، انسانیت اور رواداری کا پیغام ہے۔ انسان کو جینا سکھاتی ہے۔ یہ وہی واحد کتاب ہے جو کہتی ہے زمین میں فساد برپا نہ کرو اور اتنی بڑی بات کہتی ہے کہ ناحق ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے اور جس کسی ایک انسان کو بچائے گویا اس نے پوری انسانیت کو بچالیا۔ اس کتاب پر سب کا حق ہے۔ میں جناب حامد محسن کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے کرناٹک سے ممبئی تشریف لاکر مراٹھی زبان بولنے والوں کو سچائی کا پیغام دے رہے ہیں، واقعتاً وہ قابل مبارکباد ہیں۔ ڈپٹی کمشنر آف پولیس (کرائم) مسٹر سریش مانگڑے نے اپنی تقریر میں کہا کہ جناب حامد محسن نے قرآن اور سیرت رسولؐ، مراٹھی زبان میں یہاں کے باشندوں کو پہنچا کر ایک بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد بہت ساری غلط فہمیاں دور ہوں گی۔ یہ کتابیں نہ صرف غیر مسلموں کو اسلام سمجھنے میں مدد کریں گے بلکہ مسلمانوں کو بھی مددگار ثابت ہوں گی۔ آخر میں مسٹر سریش ڈپٹی کمشنر نے کہا کہ پہلے کے مسلمان پکے تھے اور مساجد کچے۔ لیکن آج کے مساجد پکے ہیں اور مسلمان کچے ہیں۔ سوامی لکشمی شنکر اچاریہ جی نے کہا کہ میرے ذہن میں بھی اس طرح کی غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ قرآن دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے لیکن جب میں نے قرآن کا ہندی ترجمہ پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ قرآن کی تعلیمات دہشت گردی کو مٹانے کے لیے ہیں۔ میڈیا اور مسلمانوں کو دیکھ کر اسلام کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ اگر اسلام کو سمجھنا ہے تو قرآن مجید کو پڑھنا ہوگا۔ علامہ سید عبداللہ طارق صاحب نے اسلام اور قرآن کے متعلق نیز وحدانیت پر پرسوز انداز میں خطاب فرمایا جس سے غیر مسلمین بہت ہی متاثر ہوئے۔ آخر میں سلام سنٹر کے چیئرمین جناب سید حامد محسن نے کہا کہ ''آپ اپنے فیملی ممبرس اور فرینڈس سرکل میں اس کا شعور پیدا کریں کہ زندگی کا مقصد یہ ہے کہ کلام الٰہی ان تک پہنچائیں جو اس سے ناواقف ہیں۔

پریس ریلیز، سلام سینٹر بنگلور، کرناٹک، 15 جون 2015

قرۃ العین حیدر کا ناول چاندنی بیگم: ایک مطالعہ

میرٹھ: قصبات کی تہذیب وثقافت میں مشترکہ روایت کے عناصر بڑے صحت مند ہوتے ہیں۔ سیانہ، بلند شہر کا ایک قدیم قصبہ ہے۔ یہاں کی اپنی ادبی روایات بھی شاندار رہی ہیں۔ ارشاد سیانوی کی تحقیقی وتنقیدی کتاب سیانہ کی ادبی روایت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ خیالات پروفیسر فاروق بخشی (صدر شعبۂ اردو، اودے پور یونیورسٹی، راجستھان) نے ظاہر کیے۔ وہ سیانہ میں نوجوان ناقد ارشاد سیانوی کی پہلی تنقیدی کتاب قرۃ العین حیدر کے ناول چاندنی بیگم: ایک مطالعہ کی رسم اجرا کے جلسے سے بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کر رہے تھے۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر اسلم جمشید پوری (صدر شعبۂ اردو، سی سی ایس یو، میرٹھ) اور نظامت ڈاکٹر ظہیر ساحل نے کی۔ کتاب کی رسم اجرا پروفیسر فاروق بخشی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر شاداب علیم، مولانا عبدالعلی، بدرالاسلام، (سابق چیئرمین، سیانہ) حاجی آفاق الرحیم خاں (سابق چیئرمین، بگرامی) سید حمایت علی (نبیرہ قرۃ العین حیدر) اور ماسٹر شعیب انجم بگراسوی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ استقبالیہ کے فرائض طاہر علی سیفی اور شکریے کی رسم فیروز داروغہ جی نے ادا کی۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ ارشاد سیانوی کی کتاب سیانہ میں پہلی نثری کاوش ہے۔ اس موقعے پر عمائدین قصبہ نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جون 2015

دھوپ دریچہ

مالیگاؤں: مورخہ 12 جون بمقام انصار جماعت خانہ مشرقی اقبال روڈ مالیگاؤں میں ایک عظیم الشان تقریب

رسم اجرا و مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ جس میں شہر عزیز مالیگاؤں کی محترم ومعتبر ادبی شخصیت مدیر جواز سید عارف کی کلیات 'دھوپ دریچہ' کا اجرا الحاج حافظ عنایت اللہ کے دست مبارک سے ہوا۔ بیباک ذہن گوشہ سید عارف کا اجرا ادبی تعلیمی شخصیت ماسٹر سعید پرویز نے کیا۔ دھوپ دریچہ ٹائٹل

اور ماہنامہ بیباک ٹائٹل کا اجرا وکیل نجیب اور شاکر شیخ (تہذیب) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ مشاعرے کا افتتاح الحاج مہدی حسن نے فرمایا۔ شمع فروزی کے فرائض محمد یعقوب برکت اللہ (وائس چیئرمن جنتا بینک) نے انجام دیے۔ اس باوقار ادبی مجلس کی صدارت مشہور و معروف صنعت کار، تعلیمی، دینی، ملی شخصیت جناب الحاج اسحاق سیٹھ (زری والا) نے فرمائی۔ جناب وکیل نجیب (ناگپور، مدیر قرطاس، شاعر و ادیب) کو 'ستارۂ ادب' سید عارف ایوارڈ سے نوازا گیا اور محمد حسین شیدا میرٹھی کو ڈاکٹر پیر محمد رحمانی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ اورنگ آباد سے تشریف لائے مہمان خصوصی آصف قریشی نے شرکت کی۔ اس محفل کی نظامت انیس اظہر نے فرمائی۔

پریس ریلیز، احمد عثمانی، مالیگاؤں، 17 جون 2015

تماشا میرے آگے

بھوپال: کوہ فضا واقع ہیلدی کلب بھوپال میں مشہور شاعر احد پرکاش کی غزلوں کی کتاب تماشہ میرے آگے کی رسم اجرا ہندی کے نامچین شاعر ظہیر قریشی اور اشوک مزاج کے ہاتھوں عمل میں آئی اس موقعے پر بھوپال کے مشہور شاعر ظفر صہبائی، فاروق انجم تاج الدین تاج مہیش اگروال نے دور حاضر سے جڑی اور سماجی بیداری سے لبریز غزلوں کو سنا کر سامعین کو مسحور کردیا۔

بذریعہ ڈاک: احد پرکاش، بھوپال، 16 جون 2015

بوڑھے برگد کا انت

جمشید پور: 13 جون 2015 کو سنٹر فار ایکسی لینس میں شہر سنگ و آہن، جمشید پور کے جواں سال افسانہ نگار نیاز اختر کے افسانوی مجموعے 'بوڑھے برگد کا انت' کی رسمِ رونمائی کی تقریب کا انعقاد ہوا۔ شری آلوک کمار (ایس

ڈی ایم، دھال بھوم، جمشید پور) کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنّفین، جمشید پور کے صدر اور نامور کہانی کار شری جے نندن، ڈاکٹر سبھاش چندر گپتا نے کتاب کی رونمائی کی۔ ایس ڈی ایم شری آلوک کمار نے نیاز اختر کے پہلے افسانوی مجموعے کے لیے مبارک باد دی اور ان کے روشن ادبی مستقبل کی خواہش کا اظہار کیا۔ تقریب میں خطاب

رضوان ندوی کی مرتب کردہ کتاب 'تذکرہ سوانح حضرت مولانا علاء الدین المظاہری' کا اجرا

کرتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنّفین، جمشید پور کے سکریٹری شری سبھاش چندر گپتا نے نیاز اختر کو بے چینیوں کا کہانی کار بتایا اور کہا کہ نیاز اختر عام آدمی کو بے چین کرنے والی الجھنوں کو اپنی کہانیوں میں شامل کرنے کے ساتھ ہی ان سے نپٹنے کی راہ تلاش کرتے ہیں۔ شری جے نندن اپنے صدارتی خطبے میں فرمایا کہ نیاز اختر کی کہانیاں ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ ہم اپنی آنے والی نسل کو وراثت میں کیسی دنیا دینے جا رہے ہیں۔ اس موقعے پر عمائدین شہر کے ساتھ ساتھ طلبا کی خاصی تعداد موجود تھی۔

رپورٹ: تنویر رومانی، جمشید پور، 22 جون 2015

تذکرہ وسوانح حضرت مولانا علاء الدین المظاہری

نئی دھلی: مسجد خورشید شاہین باغ جامعہ نگر میں معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں اردو زبان و ادب کے معروف ادبا و شعرا کے علاوہ کثیر تعداد میں علمائے کرام نے بھی شرکت کی۔ اس موقعے پر معروف افسانہ نگار مشتاق احمد نوری، مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر پرویز شہریار، کہنہ مشق شاعر حنیف ترین، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پشتو زبان کے لیکچرار ڈاکٹر ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر نعمان قیصر اور معروف صحافیوں سمیت معزز علمائے کرام کے ہاتھوں مولانا رضوان ندوی کی مرتب کردہ کتاب 'تذکرہ سوانح حضرت مولانا علاء الدین المظاہری' کا اجرا عمل میں آیا۔ نظامت نعمان قیصر نے کی۔ اس موقعے پر مشتاق احمد نوری نے کہا کہ مولانا علاء الدین المظاہری نے سیمانچل میں علم دین کی شمع کو روشن کیا۔ معروف شاعر ڈاکٹر حنیف ترین نے کہا کہ مولانا مرحوم کی کوششوں سے سیمانچل میں علم دین کو کافی فروغ ملا جو کہ لائق تحسین ہے۔ ڈاکٹر پرویز شہریار نے مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ سیمانچل میں علم دین کے فروغ میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم، شمس عبدالقادر قاسمی، ڈاکٹر توقیر راہی، مولانا منتظر قاسمی نے بھی مولانا مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں مولانا مرحوم کے فرزند رشید اور 'تذکرہ سوانح حضرت مولانا علاء الدین المظاہری' کے مرتب کردہ مولانا رضوان ندوی نے تمام مہمانان کرام کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 9 جون 2015

آخری پہر کی دستک

نئی دھلی: ریختہ ڈاٹ کام کے زیر اہتمام معروف نقاد، محقق اور شاعر شمیم حنفی کی شعری تخلیقات پر مشتمل کتاب 'آخری پہر کی دستک' کی رسم اجرا اشوک واجپئی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے اشوک واجپئی نے کہا کہ شمیم حنفی کی تحریریں بہت دلچسپ اور معنی خیز ہوتی

ہیں، یہ جو کچھ لکھتے ہیں بہت مستحکم اور پرمغز لکھتے ہیں، ان کی شاعری اس زمانے میں بھی پسند کی گئی اور آج بھی اس کی اہمیت برقرار ہے۔ قبل ازیں ریختہ کے سربراہ سنجیو صراف نے اپنے استقبالیہ کلمات میں ریختہ بکس کے حوالے سے کہا کہ ریختہ ڈاٹ کام کی یہ پہلی اشاعت ہے۔ اور اس سلسلے کو ہم مزید دراز کرتے ہوئے ادیب و شاعر کی نئی کتابوں کو منظر عام پر لائیں گے۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے کتاب سے چند اشعار پڑھ کر سنائے۔ سید شاہد مہدی نے اپنے صدارتی کلمات کے دوران پروفیسر شمیم حنفی سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ شاعر کے حوالے سے شمیم حنفی اگرچہ کم جانے جاتے ہیں لیکن جس طرح تحقیق و تنقید میں ان کا مقام بہت اعلیٰ ہے اسی طرح شاعری میں بھی یہ بہت پختہ اور کہنہ مشق ہیں۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے زمرد مغل نے پروفیسر شمیم حنفی کی زندگی کے مختلف گوشوں

پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ ان کی سب سے پہلی غزل 1965 میں رسالہ 'نقوش' میں شائع ہوئی۔ فرحت احساس نے کہا کہ شمیم حنفی کی شاعری دور جدید کے انداز و آہنگ سے لبریز ہے۔ پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ یہ شاعری اپنے اندر کے ملال سے بھری ہوئی ہے۔ شمیم حنفی کی شاعری آزادی کے بعد کی شاعری ہے جس میں کہیں درد ہے تو کہیں اپنوں سے بچھڑنے کا غم بھی ہے۔ پروفیسر انیس الرحمٰن نے کہا کہ شمیم حنفی کی شاعری ذات کی خودکلامی اور اس دہشت زدہ ماحول میں یہ ہمارے لیے پناہ گاہ ہے۔ ان کی پوری شاعری میں شمیم حنفی کے سراپا کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رضا حیدر، طنز و مزاح کے شاعر اسرار جامعی، پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر معین الدین جینابڑے، معین شاداب، ڈاکٹر سرور الہدیٰ، ڈاکٹر خالد مبشر، رؤف رضا، ڈاکٹر رخشندہ روحی، ڈاکٹر حنیف ترین، نوشاد منظر اور عبدالسمیع نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جون 2015

وفیات:

عبداللہ حسین

لاھور: نامور پاکستانی ناول نگار اور مصنف عبداللہ حسین 4 جولائی کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 84 برس تھی۔ ان کی

پیدائش 1931 میں ہوئی تھی۔ وہ طویل عرصے سے کینسر کے عارضے میں مبتلا اور لاہور کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں زیر علاج تھے۔ عبداللہ حسین کا ناول 'اداس نسلیں' ان کی شہرت کی وجہ بنی۔ انھوں نے باگھ، فریب، نشیب اور نادار لوگ جیسے کئی مقبول ناول تحریر کیے تھے۔ وزیر اعظم نواز شریف، وزیر اعلیٰ پنجاب شہباز شریف نے عبداللہ حسین کے انتقال پر گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے جبکہ دیگر سیاسی رہنماؤں نے بھی عبداللہ حسین کے انتقال کو اردو ادب کے لیے بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ عبداللہ حسین کی نماز جنازہ ڈیفینس کے علاقے میں واقع ان کی رہائش گاہ پر ادا کی گئی۔ نماز جنازہ میں عطاء الحق قاسمی، اصغر ندیم سید، انتظار حسین، امجد اسلام امجد اور مرزا اطہر بیگ سمیت علم و ادب سے تعلق رکھنے والے دیگر اہم شخصیات نے شرکت کی۔ عبداللہ حسین کے 5 ناول اور افسانوں کے تین مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ تاہم پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کے زیر نگیں ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات کا احاطہ کرتے ان کے ناول 'اداس نسلیں' کو قارئین اور ادبی حلقوں کی جانب سے بھرپور پذیرائی ملی۔ 2013 میں کراچی لٹریچر فیسٹول کے موقعے پر عبداللہ حسین نے بتایا تھا کہ انھوں نے یہ ناول لگ بھگ 50 برس قبل اس وقت لکھا تھا جب وہ ایک نجی کمپنی کی ویرانے میں واقع ایک فیلڈ پر ملازمت کرتے تھے۔ ان کے بقول انھوں نے اپنی اکتاہٹ سے تنگ آکر ایک روز کوئی کہانی لکھنے کے ارادے سے قلم اٹھایا تھا لیکن چند سطریں لکھنے کے بعد ہی ان کے ذہن میں اچانک 'اداس نسلیں' کی کہانی 'فلیش' کی صورت میں گزری اور ناول کا پورا سانچہ آگیا۔ انھوں نے کہا کہ بعض ناولوں کے عنوانات زیادہ مشہور ہوجاتے ہیں اور 'اداس نسلیں' کی مقبولیت میں اس کے عنوان نے بھی بڑا کردار ادا کیا۔

روزنامہ جدید خبر' دہلی، 5 جولائی 2015

سعید پریمی

کلکتہ: مشہور ترقی پسند اردو افسانہ نگار سعید پریمی کا انتقال ہوگیا وہ 78 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ، دو بیٹیاں اور چار بیٹے ہیں۔ مرحوم کچھ دنوں سے بیمار چل رہے تھے۔ تدفین گورغریباں قبرستان میں عمل میں آئی۔ مارکسی کمیونسٹ پارٹی سے سرگرم طور پر وابستہ سعید پریمی نے انتخابی سیاست میں بھی حصہ لیا تھا اور میئر ان کونسل کی خدمات انجام دی تھیں۔ ان کے افسانوی مجموعے 'چہرے کی واپسی اور میرے اپنے' کے علاوہ ناول 'میری بستی میرے لوگ' کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ ترقی پسندانہ ادبی خدمات کے اعتراف میں مرحوم کو مغربی بنگال اردو اکادمی اور بزم شہر نشاط نے اعزازات سے سرفراز کیا تھا۔ مرحوم کا تعلق انتہائی خدا ترس گھرانے سے تھا۔ جنازے میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے نمائندوں کے علاوہ احباب کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 10 جون 2015

ممتاز نقاد و شاعر بشر نواز نہیں رہے

نئی دھلی: اردو کے ممتاز شاعر، نقاد اور مقرر بشر نواز کا 9 جولائی کو مختصر علالت کے بعد اورنگ آباد میں انتقال ہوگیا۔ ان کی پیدائش 18 اگست 1935 کو اورنگ آباد

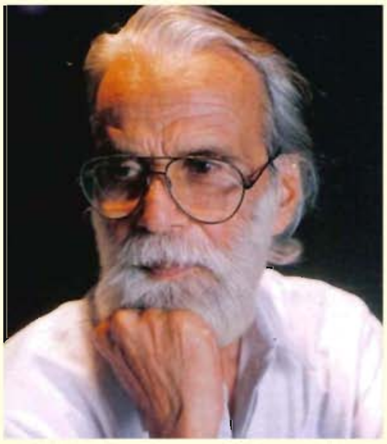

(مہاراشٹر) میں ہوئی تھی۔ یوں تو ان کی غزلیں ملک و بیرون ملک اردو کے مختلف جریدوں میں متواتر شائع ہوتی رہی ہیں، ہندی فلم بازار کے لیے ان کے تحریر کردہ گیت 'کروگے یاد تو ہر بات یاد آئے گی' نے ان کی مقبولیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ وہ ابتدا میں کمیونسٹ تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ یہ بات ان کی نظموں اور غزلوں سے بھی بخوبی عیاں تھی۔ بشر نواز نے ہندی فلموں، ڈراموں اور ریڈیو کے لیے کئی گیت لکھے۔ انھوں نے ٹی وی سیریل امیر خسرو کا اسکرپٹ بھی تحریر کیا تھا۔ ان کی گراں قدر ادبی خدمات کے لیے انھیں مشہور 'پلوتسوسمان' سے بھی نوازا گیا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جولائی 2015

ڈاکٹر عثمان الحق صدیقی

سھارنپور: سہارنپور سے تعلق رکھنے والے سینئر صحافی، شاعر، مجاہد اردو، مصنف اور اردو زبان کے تحفظ کی تحریک کے علمبردار ڈاکٹر عثمان الحق صدیقی کا انتقال پر ملال ہوگیا ہے۔ مرحوم اردو زبان کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے اور نہایت شریف، ایماندار، ملنسار، خوش مزاج، خوش اخلاق شخصیت کے علاوہ بہت سی خوبیوں کے حامل اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ اردو زبان کی خدمت کے جذبہ سے سرشار وہ خدمت خلق کے کاموں کو بھی خصوصیت کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ مرحوم عثمان الحق صدیقی گزشتہ 35 سالوں سے آل انڈیا اردو تعلیمی بورڈ کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے سرگرم تھے اور بورڈ کے

پلیٹ فارم سے اردو کی خدمت اور اس کی تعمیر و ترقی کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اردو کی خدمت، اردو کی ترقی اور اردو کے مسائل حل کرنا ان کی زندگی کے اہم مقاصد میں شامل تھا۔ مرحوم کی عمر تقریباً 5 سال تھی اور پسماندگان میں بیوہ، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا شامل ہے۔ مرحوم کی نمازِ جنازہ مسجد شاہ نور جی کے احاطے میں جامعہ مظاہر علوم کے امین عام مولانا سید محمد شاہد الحسنی نے ادا کرائی اور دفین قبرستان شاہ نور جی میں ان کی والدہ کے پہلو میں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں عمائدین شہر موجود تھے۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 12 جون 2015

سرور عثمانی

گیا: اردو کے معروف شاعر جناب سرور عثمانی 26 جون 2015 کو داغ مفارقت دے گئے۔ ان کے انتقال پر ملال پر

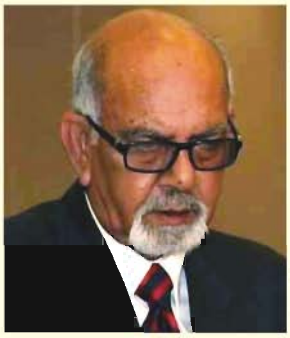

مقبول افسانہ نگار اور صحافی ڈاکٹر سید احمد قادری نے اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جناب سرور عثمانی نہ صرف بہت اچھے شاعر تھے بلکہ وہ ایک اچھے ادبی صحافی اور نیک دل انسان بھی تھے۔ سرور عثمانی کی پیدائش 16 جولائی 1946 کو گیا کے اور موجودہ نوادہ ضلع کے گاؤں رجہت میں ہوئی تھی۔ ان کے والد جناب قیوم اثر ایک بڑے اور اہم سوشلسٹ لیڈر تھے۔ سرور عثمانی کی تعلیم و تربیت ان کے والدین کے زیر سایہ ہوئی، اس کے بعد انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر یونین بینک کی ملازمت کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ان کے دو شعری مجموعے 'جانم' اور 'رفتہ رفتہ' کے نام سے زیر ترتیب تھے۔ ایک ناولٹ 'غزلم' بھی اشاعت کے مرحلے میں تھا۔ سرور عثمانی نے جنوری 1979 سے ایک شاندار ماہنامہ 'اب' کے نام سے شروع کیا۔ اس رسالے کے خاص نمبر مثلاً 'جدید اردو کہانی نمبر'، '1980 کا ادب نمبر' ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سرور عثمانی نے 'مفاہیم' کے دو ضخیم شمارے شائع کیے۔

پریس ریلیز: سید احمد قادری، گیا، 26 جون 2015

شاعر و ادیب سردار انجم انتقال

چنڈی گڑھ: ملک کے نامور شاعر و ادیب سردار انجم کا لمبی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا۔ سردار انجم پنچ کولہ میں

رہائش پذیر تھے۔ یہ اطلاع ناشر نقوی نے دی ہے۔ سردار انجم کو ان کی ادبی و علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے 2005 میں پدم بھوشن اعزاز سے نوازا تھا۔ اس سے پہلے انھیں پدم شری ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ سردار انجم کو اب تک 50 سے زیادہ ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ان میں ملینیم پیس ایوارڈ، پدم شری، پدم بھوشن، لٹریری ایوارڈ، پنجاب رتن، کلنٹن ادب اینڈ ایجوکیشن ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جولائی 2015

خراج عقیدت:

سعید پریمی

مسلم انسٹی ٹیوٹ کی لٹریری سب کمیٹی کی جانب سے 15 جون 2015 کی شام کو سعید پریمی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس میں شہر کی متعدد نامور ہستیوں نے شرکت کی۔ جلسے کی صدارت عزیز الحق (نائب صدر، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ) نے کی جب کہ نظامت کے فرائض

ڈاکٹر نعیم انیس (اعزازی ایجوکیشن سکریٹری، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ) نے انجام دیے۔ جلسے کا آغاز سیّد شاہ ومیق الارشاد علی القادری کی تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ مقررین میں سب سے پہلے نثار احمد (سابق اے سی پی، کلکتہ پولیس) سعید پریمی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے اندر Motivation کی ایک عجیب خصوصیت تھی۔ ان کی شخصیت صاف ستھری اور نفیس تھی۔ ان کے فرزند شکیب عامر نے بہت رقت آمیز لہجے میں سعید پریمی کو یاد کرتے ہوئے ان سے اپنی قربت کا اظہار کیا۔ پریمی صاحب کی بہو عاشیہ جبیں خطاب کے دوران اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکیں اور بالآخر اپنی تقریر نامکمل چھوڑ دی۔ شہر کے مشہور ڈراما نگار کمال احمد نے پریمی صاحب کی دردمندانہ اور ہمدرد شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ ڈاکٹر دبیر احمد، سیّد محمد علاء الدین، شیخ شمشیر عالم اور قمر الدین ملک صاحبان نے بھی مرحوم سے اپنی دیرینہ وابستگی اور مراسم کا ذکر کیا۔ اخیر میں لٹریری سکریٹری ساجد خان نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسے کے اختتام کا اعلان کیا۔

پریس ریلیز: انیس نعیم، اعزازی ایجوکیشن سکریٹری، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا، 15 جون 2015

رئیس رامپوری

رام پور: بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر رئیس الرحمٰن خاں المعروف رئیس رامپوری کی یوم وفات کے موقعے پر گلشن رئیس پبلک اسکول میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں شرکا نے مرحوم کی ادبی و اخلاقی صفات کا ذکر کرتے ہوئے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ تقریب کو خطاب کرتے ہوئے معروف نوجوان صحافی و شاعر ذیشان مراد علیگ نے رئیس رامپوری کی شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رامپور کے جن شعرا نے ہندو پاک کی شاعرانہ عظمت کا چراغ فروزاں کیا ہے۔ ان میں رئیس رامپوری کا نام سرفہرست ہے۔ رئیس رامپوری ایک ذہین شاعر تھے انھوں نے حمد، نعت، نظم، قطعہ اور رباعی وغیرہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کی خوش کلامی ان سب پر محیط ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر تھے اور غزل ہی ان کا حقیقی مرکز و محور رہا۔ ذیشان مراد نے کہا کہ رئیس رامپوری اپنی ذات سے سراپا اخلاق و محبت اور پیکر شرافت تھے۔ جس کی خوشبو ان کے اشعار سے بھی آتی ہے۔ اس موقعے پر رئیس رامپوری کے صاحبزادے حفاظت نور نے ان کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ رئیس رامپوری کا انتقال 16 جون 2006 کو ہوا تھا۔ رئیس رمپوری 1930 میں رامپور کے مشہور محلہ گھیر طوغاں میں پیدا ہوئے۔ شاعری انھیں اپنے والد محترم ظریف الملک چندا پیارے خاں بے تک رامپوری سے وراثت میں ملی تھی۔ اردو ادب کے شہر رامپور نے ایک ایسے استاد شاعر کو جنم دیا جس نے نہ صرف ملک بلکہ بیرون ملک بھی شاعری کے ذریعے رامپور کی پہچان کرائی۔ ان کی زندگی پر ایک اہم کتاب 'رئیس رامپوری شاعری اور زندگی' لکھی۔ ڈاکٹر سید قمر علی نے رئیس رامپور کی شاعری پر روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے ریسرچ کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ میونسپل بورڈ رامپور نے رئیس رامپوری کے انتقال کے بعد ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ایک سڑک ان کے نام 'رئیس رامپوری روڈ' منسوب کی۔

روزنامہ 'خبریں'، دہلی، 17 جون 2015

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیاتِ ابراہیم یوسف (جلد اوّل تا چہارم)

مرتب: محمد نعمان خان
صفحات: 3228 (مکمل سیٹ)
قیمت: 1343 روپے (مکمل سیٹ)

لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر

مصنف: سید عبدالباری
صفحات: 690
قیمت: -/286 روپے

شرارِ جستجو

مصنف: قیصر ضحیٰ عالم
صفحات: 125
قیمت: -/80 روپے

ہمارا طرزِ زندگی اور بیماریاں

مصنف: ڈاکٹر جاوید احمد سعیدی کامٹوی
صفحات: 69
قیمت: -/42 روپے

ادبی صحافت (آزادی کے بعد)

مصنف: عبدالحی
صفحات: 414
قیمت: -/185 روپے

لکیر کا فقیر

مصنف: ڈاکٹر نسرین رمضان سیّد
صفحات: 131
قیمت: -/30 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل تا سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 1454 (مکمل سیٹ)
قیمت: -/420 روپے (مکمل سیٹ)

زندگی نامہ: قرۃ العین

تحقیق و ترتیب: جمیل اختر
صفحات: 296
قیمت: 143 روپے

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو) کامرس

ادارہ
صفحات: 306
قیمت: 141 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل
صفحات: 83
قیمت: -/24 روپے

حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد

مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

ٹی وی نیوز پروڈکشن فن اور طریقۂ کار

مصنف: سمیع الرحمٰن
صفحات: 217
قیمت: 93 روپے

کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن

مصنف: خورشید عالم
صفحات: 180
قیمت: 144 روپے

دیوانِ بیدار

مرتب: پروفیسر نسیم احمد
صفحات: 256
قیمت: 122 روپے

اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے

مصنف: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 500
قیمت: -/174 روپے

انگریزی اصطلاحوں اور محاوروں کی جدید صحافتی فرہنگ

مصنف: سید راشد اشرف
صفحات: 493
قیمت: -/238 روپے

جسم و جاں

مصنف: عبدالمعز شمس
صفحات: 354
قیمت: -/138 روپے

کاغذ کا واسدیو

مرتب: پریم ناتھ در
صفحات: 118
قیمت: -/63 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, August-2015, Vol.17, Issue:08
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/07/2015
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Prof. Syed Ali Karim, Tel : 49539000